# المودودی

نعیم صدیقی

بار اول ـــــــ 1963ء

بار پنجم ـــــــ ستمبر 1998ء

مطبع ـــــــ تعریف پرنٹرز لاہور

قیمت ـــــــ -/120 روپے

# فہرست

# انتساب

## اس قوم کے نام ــــــــ

جس نے
بارہا
کانٹوں کو سر آنکھوں پہ رکھا
اور
پھولوں کو پامال کیا!

ایک تعارف
اس دلچسپ تاریخی شخصیت کا
جو در حقیقت کسی تعارف کی محتاج نہیں،
وہ کہ ــــــ
جس کے حصے میں سب سے زیادہ گالیاں بھی ہیں
اور سب سے زیادہ احترام بھی!
وہ کہ ــــــ
جس نے بھرپور زندگی گزاری،
اور فوت ہُوا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے
سے زیادہ زندہ ہے۔

# ابتدائیہ
## (نقشِ ثانی)

یہ کتاب اپنی پہلی ترتیب و ضخامت کے ساتھ ۱۹۶۳ء میں مولانا مودودی ایک تعارف کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ادھر مولینا مرحوم کی وفات کے بعد احباب کی طرف سے اصرار ہوتا رہا کہ اس کا نیا ایڈیشن آنا چاہیے۔ وقت و فرصت کی کمی کی وجہ سے میں اپنی مطبوعہ کتب کی اشاعتِ نو یا غیر مطبوعہ تحریروں کی ترتیب کی طرف اتنی کم توجہ دے سکتا ہوں کہ جس کا اندازہ خود اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ زیرِ گفتگو کتاب کی اشاعتِ اول کے بعد پھر کبھی میں نے اس کے متعلق سوچا ہی نہیں۔ بدقسمتی سے یہاں ایسے پبلشر بھی نہیں ملتے جو آدمی کو کھینچ گھسیٹ کر کتابوں کی تصنیف و ترتیب اور تجدید و نظرِ ثانی کی راہ پر لے جاتے ہیں۔

اب کی ادارہ معارفِ اسلامی (منصورہ لاہور) کی طرف سے یہ تقاضا ہوا کہ ۱۹۶۳ء والی متذکرہ کتاب کا نیا ایڈیشن نکالنے کے لئے از سرِ نو مرتب کر دوں۔ چنانچہ جب ادھر توجہ ہوئی تو ایک تو وہ مضامین سامنے آئے جو مولینا کی وفات کے بعد لکھے گئے ہیں اور یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ بعض احوال و معاملات کے بارے میں کچھ خلا رہ گئے ہیں۔ ان وجوہ سے نئے مضامین کو شامل کیا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ "ایک تعارف" والے مضامین میں نے ابتدائی دور میں لکھے اور جس طرح مولینا کو دیکھا اور سمجھا تھا اسی طرح دو تین مضامین میں ان کی شخصیت اور ان کے کردار کو دکھانے کی کوشش کی۔ اس وقت کے حالات میں میرا منشا یہ بھی تھا کہ اندازِ گفتگو ایسا ہو کہ ہم سے دور دور رہنے والے حلقوں میں بھی اسے پڑھا جائے اور سلیم الطبع حضرات مخالفانہ پروپیگنڈے کے اٹھائے ہوئے غبار میں گھٹے ہوئے حالات میں بھی مولانا کی حقیقی تصویر کی ایک جھلک دیکھ کر انصاف سے اپنی رائے قائم کریں۔

تین مضامین کا وہ مجموعہ مصنفانہ ذہن کے مرتب کردہ نقشے پر کام کر کے تیار کیا گیا۔ اب صورتِ حالات دوسری ہے۔ سابق ایڈیشن میں اندازِ تفکر غالب تھے، مگر بعد کے ان مضامین میں جذباتی تاثرات بھی شامل ہیں ــــ مگر وہ کوئی عدمِ توازن پیدا کرنے کا باعث نہیں بنے۔

اب نئے اضافہ شدہ ایڈیشن کی تحریروں میں سابق ایڈیشن کے مضامین جوں کے توں اپنی جگہ پر ہیں۔ کتاب کے اندر ہی دوسرے حصے کے طور پر بعد کی تحریروں کو شامل کر دیا گیا ہے۔ گویا اب مولنا کو دو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

منصورہ
یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء

نعیم صدیقی

# ایک اور ابتدائیہ

## (نقشِ ثالث)

اب یہ کتاب تیسرے ایڈیشن کے لیے جا رہی ہے۔ وقت نکال کر میں نے اس کی نظرثانی کر لی ہے۔ متعدد فاش غلطیاں سامنے آئیں۔

اس وقت اگر ترجمان القرآن کی ادارت کے ساتھ ساتھ میری توجہ مجلّہ تذکرہ مودودیؒ پر مرتکز نہ ہوتی تو میں اس کتاب میں کچھ نئی چیزیں شامل کرتا۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ گزشتہ ۱۹۸۵ء میں ایڈیشن ختم ہو چکا ہے اور مکتبہ المنار کو فرمائشیں موصول ہو رہی ہیں، لہٰذا کسی اضافے کے بغیر "المودودی" کا تازہ تر نقش پیشِ خدمت ہے۔

امید ہے کہ قارئین اس کا مطالعہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے لیے خدائے رحیم و ودود سے رحمت و عنایت کا سوال کریں گے۔ بعد ازاں ربِ کریم و غفور کے سامنے میرے لیے بھی فلاحِ دارین کی درخواست کا دامن پھیلائیں گے۔ ایسے تمام خادمانِ دینِ حق، قارئینِ "المودودی" اور خیرخواہ و مؤلف کیلیے بھی حسناتِ دنیا و آخرت کی دعا کرتا ہوں۔

نعیم صدیقی ۱۷، جنوری ۱۹۸۶ء

## تشکر و دعا ــــ (نقشِ رابع)

میرے ایک بزرگ دوست ابن الحسن سید بہت بڑے مصنف ہیں۔ ان کے چشمۂ ادب سے یہ جرعۂ معنی ابھرا کہ ادب اصل میں شکر کا دوسرا نام ہے۔ (الفاظ یاد نہیں) پڑھا اور چونک گیا اور حقیقت کی ایک نئی دنیا کے دروازے میرے سامنے کھل گئے۔

"المودودی" کے چوتھے ایڈیشن کی تیاری جب المنار بک سنٹر نے شروع کر دی تو میرے اندر شکر کا جذبہ ابھرا۔ یہ تو خود مولینا مودودیؒ کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی برکت ہے جن کا بیان اس فیضان کے جواب میں تشکر کا ایک احساس ہے کہ کتاب مقبول ہوئی اور سابق خدمت کی قبولیت پر اظہارِ تشکر کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچائے اور ان کے دلوں کو اس پیغام اور کردار کے نور سے معمور کر دے جو مولینا مودودی کی اصل میراث ہے۔ نعیم صدیقی ۲۶/۱/۸۹

# انسانم آرزوست

کہو، وہ کون حسین ہے تمہاری بستی میں

کہ جس کے نام کے ساغر اٹھائے جاتے ہیں

زندگی کے شہر میں اولادِ آدم کے انبوہ پلے جاتے ہیں۔ ان میں ہر آن کچھ تعداد پردۂ عدم کے پیچھے چلی جاتی ہے اور اپنے سے زیادہ جانشین پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ مگر ان میں مجسمہ ہائے حسن و خوبی کم ہوتے ہیں۔ اشخاص کروڑوں ہوتے ہیں لیکن شخصیت کم ہی پائی جاتی ہیں، اور پھر ان میں تابناک شخصیتیں تو اکا دکا سامنے آتی ہیں۔

ہمارے اس دور میں اور ہمارے ہی دیس میں ایک شخص ہیں جن کو مولانا مودودی کہا جاتا ہے۔

مگر ذرا رکیے، پہلے ذرا اور باتیں ہو لیں۔

اس سے قطع نظر کہ میں نے اپنے مضامین کا جو مجموعہ تیار کیا ہے وہ بہ حیثیت مجموعی یا ان میں سے کوئی ایک مضمون شخصیت نگاری میں آتا ہے یا نہیں، نفسِ شخصیت نگاری کے بارے میں دو ایک باتیں کہتا ہوں۔

شخصیت نگاری ادب کی ایک انتہائی شریف و معزز صنف ہے۔ مشرقی اور خصوصاً اسلامی نقطۂ نظر سے شخصیت نگاری کا مقصد لازمی طور پر تعمیری ہوتا ہے۔ شخصیت نگار کے فن کی جانچ دو سوالوں سے کی جا سکتی ہے، ایک یہ کہ اس نے کیسی شخصیت کو چھانٹ کر سامنے رکھا، دوسرے یہ کہ اسے کس انداز سے پیش کیا۔ شخصیت نگار کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایک ہجوم میں سے کوئی ایسی بہترین شخصیت انتخاب کرے جس کے فکر و عمل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جا سکتا ہو، جس کی مثال دوسروں کو روشنی بہم پہنچائے، اور جس کو جاننا اور سمجھنا فی الواقع

ایک ضرورت ہو۔ اس کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کسی شخصیت کی تصویر گری ایسے زاویوں سے اور ایسے رنگوں سے کرے کہ دوسرے لوگ اس کی زیادہ سے زیادہ قابلِ اخذ و اکتساب خوبیوں سے آشنا ہو سکیں۔

دوسرے لفظوں میں شخصیت نگاری نام ہے تلاشِ انسانیت کا ــــ یا یوں کہیے کہ بہترین نمونۂ انسانیت کی جستجو کا اور پھر اس کے بعد وہ نام ہے کسی اچھے نمونۂ انسانیت کو بہترین انداز سے پیش کرنے کا، بلکہ فی الحقیقت شخصیت نگاری کسی کو مثال کے طور پر پیش کر کے دوسروں کے اندر تعمیرِ انسانیت کی ایک لطیف و مؤثر کوشش ہے۔ شخصیت نگار ایک طرف رفتہ و موجود شخصیتوں میں انسانیت کا حُسن تلاش کرتا ہے اور دوسری طرف اس حسن کا پرتو دوسروں پر ڈالنا چاہتا ہے۔ شخصیت نگار بھی ناول نگار کی طرح کسی کو ہیرو کی حیثیت دے کر سامنے لاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ناول نگار تخیل کی روشنی میں اپنے تجربات کا رنگا رنگ مسالہ استعمال کر کے تصوری پیکر تراشتا ہے، مگر شخصیت نگار کو اپنا ہیرو ماضی یا حال کی واقعاتی تاریخ میں تلاش کرنا ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں ایک ہی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں انسانیت کے مثالی نمونے فراہم کر کے دوسروں کے لیے ان سے استفادہ کی راہ کھولتے ہیں۔

شخصیت نگار جب کسی شخصیت کو کام کرنے کے لئے منتخب کرتا ہے تو اپنے انتخاب کے پردے میں وہ اپنے معیارِ انسانیت کو بھی ہمارے سامنے واضح کر دیتا ہے۔ اس کی پسند بتا دیتی ہے کہ اس کی نگاہ کی رسائی کہاں تک ہے اور اس کی اپنی انسانیت کا قد و قامت کیا ہے۔ اُونچے درجے کا کوئی شخصیت نگار جو خلوص سے اپنے سامنے تعمیرِ انسانیت کا مقصود رکھتا ہو، کبھی کسی گھٹیا شخصیت کو فن کا محور نہیں بنا سکتا۔ وہ ہر حال میں عام اور معمولی سطح سے بلند تر کسی مردِ کار کا انتخاب کرے گا، جس کے تذکرے سے فکر کے دیے روشن ہو سکیں جس کا تصور سامنے لانے سے کچھ شریف جذبے تر و تازہ ہو سکیں اور جس کے کارناموں

کا مطالعہ کرنے سے کردار میں بلندی آ سکے۔

سچا شخصیت نگار اپنے منتخب کردہ ہیرو سے محبت کرتا ہے اور اسے ایک حد تک ممدوح بناتا ہے، مگر وہ اسے بے عیب سمجھنے والا اندھا قصیدہ گو نہیں ہو سکتا۔ وہ پہلے قدم پر یہ حقیقت مان کر چلتا ہے کہ انسان انسان ہے، فرشتہ نہیں ہو سکتا۔ انسان کتنی ہی بلندیوں تک پہنچے، کچھ کمزوریاں اس کے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ وہ کبھی نقص و خطا سے منزہ نہیں ہوا کرتا۔ انبیاء کے بعد جن انسانوں کو ہم بہترین انسان قرار دے سکتے ہیں، وہ وہ ہیں جنھوں نے اپنی کمزوریوں کے آگے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ کمزوریوں سے معرکہ جاری رکھا اور ان کی خوبیاں بار بار غالب نکلیں۔ ہو سکتا ہے کہ اچھے لوگوں کو اس کشمکش میں ٹھوکریں لگی ہوں اور چوٹیں کھانی پڑی ہوں۔ مگر وہ گر کر ہمیشہ اُٹھ کھڑے ہوتے رہے ہیں اور مٹی جھاڑ کر از سرِ نو آگے اقدام کرتے دکھائی دیے ہیں۔ یہی لوگ تاریخ کے ہیرو ہیں اور سچا شخصیت نگار انہی کا متلاشی ہوتا ہے اور انہی کی تصویروں کے مرقعے تیار کر کے ایوانِ ادب کو آراستہ کرتا ہے۔

ایسے کسی اچھے مردِ کار کی تلاش میں کامیابی کے بعد بڑی نازک ذمہ داری سامنے آتی ہے کہ اس کے فکر و کردار کے حُسن کو خوبی سے اُجاگر کیا جا سکے اور اس کو ایک حد تک مثالی حیثیت سے سامنے رکھا جا سکے۔ اسے اس انداز سے سامنے لایا جائے کہ پڑھنے والے کا انسانیت پر اعتماد قائم ہو کر آدمی مزاحمتوں اور کمزوریوں کے باوجود بلند ہو سکتا ہے، آدمی پستی کی طرف لے جانے والے محرکات کے ساتھ معرکہ لڑ سکتا ہے۔ اتنا بھی کافی نہیں۔ کامیاب شخصیت نگار وہ ہے جو اپنے قاری میں بلند تر ہونے کا دولہ اور ایک مثال سے سبق لے کر بہتر انسان بننے کا عزم پیدا کر دے۔ شخصیت نگار جب اس تعمیری مشن کو سامنے رکھ کے کام کرتا ہے تو اس میں چھوٹی چھوٹی بشری کمزوریوں سے درگزر کرنے کا جذبہ کارفرما ہو جاتا ہے۔ جو جتنا بڑا شخصیت نگار ہوگا وہ اتنا ہی بڑا معاف کرنے والا بھی ہوگا۔

بخلاف اس کے اگر کوئی شخص چھوٹی موٹی کمزوریوں سے چشم پوشی کرنے کے بجائے اُلٹا نمایاں اور ممتاز اور نیک نام اور خوش اطوار شخصیتوں میں کرید کرید کر کمزوریاں تلاش کرتا ہے، ان کو پھیلا پھیلا کر دیکھتا اور دکھاتا ہے تو گویا وہ انسانی تاریخ کو روشن کرنے والی ہستیوں کو گُل کر دینے کے درپے ہے۔ وہ انسانوں کے اندر انسانیت کے متعلق مایوسی پھیلا دینے کے لیے کوشاں ہے۔ اس کی مساعی کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ اس کے پڑھنے والے یہ رائے قائم کر لیں کہ اونچے سے اونچے انسان بھی درحقیقت پست تھے اور اچھے سے اچھے افراد بھی صحیح معنوں میں اچھے نہ تھے۔ یہ تاثر سرے سے اس اکساہٹ کا راستہ بند کر دے گا جو عام اور متوسط درجے کے انسانوں میں عظمتِ انسانیت کی طرف بڑھنے کا سبب بنتی ہے۔ پس یہ سیرت نگاری تعمیرِ انسانیت کے بالکل برعکس تخریبِ انسانیت کی ایک خطرناک کوشش ہو گی۔ سیرت نگاری کا یہ رُخ پوری انسانیت کو پستی کے رُخ پہ ڈال دے گا۔ ایک طرف کچھ لوگوں کو بڑے لوگ اور عظیم شخصیتیں کہ کر پیش کرنا اور دوسری طرف ان کی زندگی میں کمزور اور پست پہلو نکال نکال کر دکھانا سوائے اس کے کس نتیجے تک پہنچا سکتا ہے کہ کمزوری اور پستی سے کوئی مفر نہیں اور یہ کہ بڑے لوگ اور عظیم شخصیتیں بھی ایک ڈھکوسلا ہیں۔

تعمیر پسندانہ ذہن سے جب بھی سوچیے تو ماننا پڑے گا کہ نئی نسلوں کے سامنے ہمیں اسلاف کے ہاں سے، یا آئندہ نسلوں کے سامنے معاصر شخصیتوں کے ہاں سے چُن چُن کر اچھے اوصاف، اچھے اخلاق اور اچھے کارناموں کو لانا ہے۔ میراث جو پیچھے سے آگے کو منتقل ہونی چاہیے وہ صرف خیر و خوبی کی میراث ہے۔ کمزوریاں جواہر کے خزانہ میں شامل نہیں کی جا سکتیں جن کو آگے منتقل ہونا ہے۔ پس شخصیت نگار کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ سوانحی مواد کی چھنٹائی کرے، وہ مشاہدہ و مطالعہ کے پورے حاصل کو تفکر کے کھلیان میں ڈال کر بھُس کو اُڑا دے اور غلے کو محفوظ کر لے۔ غلے کے ساتھ بھُس کا پایا جانا کوئی انہونی بات نہیں مگر بھُس اس قابل بہرحال نہیں ہے کہ اسے غلے کے ساتھ ملا جلا کر اسلاف کی طرف سے اخلاف کی جھولی

میں ڈال دیا جائے۔

ہم مسلمانوں کے ہاں سوانح نویسی اور شخصیت نگاری کا فن ٹھیک اسی تعمیری نقطۂ نظر کے ساتھ پروان چڑھا ہے۔ سب سے پہلے قرآن نے انبیاء اور بعض صلحاء کی زندگی کی تصویریں تیار کر کے وہ نہج معین کر دیا جس پر شخصیت نگاری کا نشو و نما ہونا چاہیے۔ قرآن نے بہترین شخصیتیں لیں اور ان کی بہترین نقشہ کشی اچھے سے اچھے زاویوں سے ہمارے سامنے کر کے رکھ دی۔

اور قرآن ہی تھا جس کی شخصیت نگاری کے ساتھ "اسوہ" اور "سنت" کا تصور شامل تھا۔ یعنی جس کو پیش کیا نمونہ بنا کر پیش کیا اور جو بھی پہلو سامنے رکھے قابلِ تقلید بنا کر رکھے۔ اسی طرح حدیثِ رسالت میں انسانیت کے جن گلہائے سرسبد کو سجا کر پیش کیا گیا ہے ان کی خوشبو اور رنگینی صدہا بہاروں کا سرمایہ قرار پائی ہے۔ قرآن و حدیث نے جو راستہ بنا دیا تھا اس پر چل کر ہمارے سوانح نویسوں اور شخصیت نگاروں نے صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی شخصیتوں کے مرقعے تیار کیے جن کا ہر ورق اور ہر نقش آج ہمیں درسِ رفعت دیتا ہے۔

اس کے برعکس اہلِ کتاب کے ہاں جب پستی آئی تو انھوں نے اپنے انبیاء کی عظیم و مقدس شخصیتوں تک کے خاکوں میں انہی گھٹیا عادات و اطوار کا رنگ بھر دیا جو ان میں پھیل گئی تھیں۔ پست ذہن و کردار کا آدمی عظیم ترین شخصیت کو موضوع بنا کر پست کر دیتا ہے۔ چنانچہ بائبل میں خدا کے بہترین برگزیدہ بندوں کے دامنِ عصمت پر بدترین داغ دکھائی دیں گے۔ اپنے بہترین لوگوں کو جب انھوں نے اس رنگ میں دیکھا اور دکھایا تو وہ خود اور زیادہ پستی میں گرتے چلے گئے۔ انھوں نے نیکی اور عظمت کے دیوں کو خود ہی گل کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تاریکیوں میں بھٹکتے رہ گئے۔

آج مادہ پرست یورپ نے سیرت نگاری کا ایک نیا مدرسۂ فکر حقیقت نگاری کے نام سے قائم کیا ہے اور اس کا خوب دور دورہ ہے۔ مغرب کا سیرت نگار ایک غیر جانبدارانہ مقام پر قدم جما کر بالکل ایک کیمرے کا سا پارٹ ادا کرنا چاہتا ہے۔

جو جذبات سے بالکل عاری ہو کر مختلف زاویوں سے تصویر لے رہا ہو۔ یہ تصویر گری کتنا ہی دلآویز فن ہوا کرے، تعمیرِ انسانیت کا ذریعہ بہرحال نہیں بن سکتا۔ آج کے حقیقت نگار لازم سمجھتے ہیں کہ وہ پیشِ نظر شخصیتوں میں کوشش اور کاوش کر کے بھی کچھ کمزوریاں تلاش کریں۔ اگر کمزوریاں سامنے نہ ملیں تو واقعات کی گہرائی میں ڈوب کر بہم پہنچائیں۔ وہ اگر ثابت نہ ہو سکیں تو کم از کم ان کے ہونے کا ظن غالب پیدا کر دیں، اور کچھ ہاتھ نہ آئے تو پھر دورِ ابتدا کی ان کمزوریوں کو اچھالیں جن سے لڑ کر اور جن کو پیچھے چھوڑ کر ایک آدمی عروج کی منزلیں طے کرتا ہوا کسی مقامِ عظمت تک پہنچا ہو۔ یہ بھی نہیں تو عمیق نفسیاتی تجزیہ کر کے اور بچپن کے واقعات کو سامنے رکھ کر یہ ثابت کر دکھائیں کہ یہ جو کچھ عظمت و رفعت دکھائی دیتی ہے یہ خود کسی کمزوری کا مظہر یا ردِ عمل ہے۔

جن تمدنوں میں اخلاقی انحطاط پیدا ہو جاتا ہے ان میں سوانح نویسی اور شخصیت نگاری کسی ایسے ہی نہج پر بڑھتی ہے اور اس میں سوانح نویس اور شخصیت نگار کا غیر شعوری یا نیم شعوری ایک مقصد یہ بن جاتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے دور کی اخلاقی پستیوں کے لیے وجہِ جواز فراہم کرے۔

بہر حال یہ حقیقت نگارانہ رنگ کی شخصیت نگاری اس مشن اور پیغام سے خالی ہو جاتی ہے جو شخصیت نگاری کی روح ہے۔ سچا شخصیت نگار محض قلم کش نہیں ہوتا اور اس کا کام دفترِ ادب میں چند خوبصورت اور رنگین خاکوں کا اضافہ کر دینے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ موجودہ انسانوں اور آنے والی نسلوں کو انسانی شرف کے لحاظ سے بلند تر کر دینے کا مشن اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ مشن اس کے کام میں جذباتی روح بھر دیتا ہے۔ وہ کسی طرح اپنے اندر مصنوعی غیر جانب داری اور بے تعلقی پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کی حقیقت پسندی اور راستبازی اسے اس کا پابند تو بناتی ہے کہ وہ انتخاب کردہ شخصیت کی خوبیوں کے بیان میں کوئی بے جا مبالغہ نہ کرے اور نہ اپنی طرف سے کچھ خوبیاں گھڑ کر اس کے ساتھ چپکا دے، لیکن اس کی حقیقت پسندی اور راستبازی یہ تقاضا نہیں کرتی کہ وہ ڈھکے چھپے پہلوؤں

کو کرید کرید کر لازماً کچھ کمزوریاں تلاش کرے، اور وہ ثابت نہ ہوں تو ان کے ہونے کا گمانِ بد ضرور پیدا کر دے۔ وہ تو ہے ہی خیر و خوبی کا جویا اور خیر و خوبی کو دوسروں تک پہنچانے کا واسطہ۔ وہ حسن کا متلاشی ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ انسانوں تک منتقل کرنے کا وسیلہ۔

یہ ہے میرا ذہن شخصیت نگاری کے متعلق۔ اس ذہن کے ساتھ میں نے ایک درخشاں شخصیت کو موضوع بنایا ہے۔ جہاں تک میرے انتخاب کا تعلق ہے مجھے اپنے اُوپر اعتماد ہے کہ میں نے انتخاب اچھا ہی کیا ہے۔ لیکن اس کے آگے کا یہ سوال کہ اس کتاب میں جمع شدہ مضامین میں میں نے شخصیت نگاری کہاں تک کی ہے اور پھر اس کا حق کہاں تک ادا کیا ہے، اس کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ اس کا جواب ہر پڑھنے والا اپنے لیے خود ہی تجویز کرے گا۔

میں اپنے تجربے کی روشنی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خود میں نے مولانا کی شخصیت پر جو کچھ لکھا ہے اس نے مجھے یہی احساس دلایا ہے کہ مولانا مودودی کے شخصیت نگار کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا میرے بس میں نہیں ہے۔ اس کام کے لیے میرے اندر جس درجہ کا بڑا انسان موجود ہونا چاہیئے وہ شاید موجود نہیں۔

دراصل مولانا مودودی کی شخصیت کی تصویر اتنی پھیلی ہوئی ہے اور اس کے اتنے درخشاں گوشے سامنے ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے، پھر سوال صرف اسے پیش کر دینے کا نہیں، پیش اس طرح کرنا ہے کہ قاری یہ محسوس کرے کہ جیسے اس نے تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

مولانا کے اندر ایک داعیٔ حق، ایک متکلمِ اسلام، ایک مفکرِ حیات، ایک ادیب، ایک خطیب، ایک سیاسی قائد، ایک تنظیم کار بیک وقت جمع ہیں، ان کی شخصیت سیاسی و تاریخی اور علمی و ادبی ہر لحاظ سے بے حد اہم ہے، اور پھر اس کے ساتھ حسنِ کردار کا اجتماع ان کو اپنے دور کی ایک قیمتی شے بنا دیتا ہے مگر کسی ایسی جامع شخصیت کے حسن کو دوسروں تک منتقل کرنا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس کے

یہ معنی نہیں کہ اس کام کو کیا ہی نہ جائے۔ کوشش ہی کی راہ کامیابی کی منزل کو جاتی ہے
بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنھیں ان کے شخصیت نگاروں کا قلم زندگی دیتا
ہے، ورنہ وہ ہمیشہ گمنامی میں پڑی رہتیں چنانچہ ڈاکٹر جانسن کے متعلق کارلائل نے
ٹھیک کہا کہ اس کا نام شاعر اور قصہ گو یا مقالہ نگار اور مؤلف ہونے کی بنا پر زندہ
نہیں ہے بلکہ وہ زندہ ہے تو باسویل کی لافانی تصنیف کے اوراق کے بل پر
زندہ ہے۔ اس سوانح عمری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دنیا کے سوانحی لٹریچر میں اپنا
جواب نہیں رکھتی۔

دوسری قسم کی شخصیتیں وہ ہوتی ہیں کہ جن کی عظمت ان کے سوانح نگاروں
کو بھی شہرت و عظمت کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ شخصیت نگار کو کسی حسین
شخصیت کے حسن سے اسی طرح حصہ ملتا ہے جس طرح مامون نے محبوبہ کی طرف
بھیجے ہوئے قاصد کی آنکھوں کے متعلق لکھا تھا کہ ؎

اَرَی اَثَرًا مِنْهُ بِعَيْنَيْكَ بَيِّنًا
لَقَدْ أَخَذَتْ عَيْنَاكَ مِنْ عَيْنِهِ حُسْنًا

(تیری آنکھوں نے میری محبوبہ کی آنکھوں سے حسن کا جوہر قبول کیا ہے۔
میں اس کا واضح اثر تیری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں)

اس کی مثال میں مولانا مودودی کی شخصیت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی
شخص جو آج یا کل مولانا کی شخصیت یا سوانح کو دنیا کے سامنے شایانِ شان طریق سے
لائے گا اُس کا نام مولانا مودودی کے نام کے ساتھ زندہ رہے گا۔

آج نہیں کہا جا سکتا کہ کسے یہ مقام حاصل ہوگا!

مولانا مودودی کی شخصیت اور سوانح میں بہت ہی غیر معمولی اہمیت کیوں پیدا
ہو گئی ہے؟

سچ یہ ہے کہ شہرت کی زرنگار قبا میں دیکھ کر نگاہ کتنے ہی مواقع پر مرعوب ہو گی مگر
دائے ناکامی کہ ان قباؤں میں انسان کم ہی ملا۔ فرماں رواؤں کے ٹھاٹھ دیکھے، ادیبوں کے

چمنستان ہائے نگارش دیکھے، شعراء کی زمزمہ سنجیوں سے استفادہ کیا، جادو بیان خطیبوں کو عقائد واحکام کی وضاحت کرتے اور کفر وایمان کے فیصلے کرتے دیکھا مگر کم ہی ایسا ہوا کہ انسانیت کے حسن سے دامن نگاہ بھرا ہو۔ کیا پوچھتے ہو ؎

آدمیت ! تیری تلاش رہی　　دیکھے ہیں پردہ ہائے نام بہت

مگر مودودی کے اندر انسان کو موجود پایا اور زندہ پایا۔ اور اسے انسانِ عظیم پایا —— مودودی کی عظمت تاریخی لحاظ سے یہ ہے کہ اس نے تاریخ کے دھارے پر بہنے والے انبوہ ہائے کثیر کے بالمقابل، دھارے سے لڑنے کا مسلک اختیار کیا ہے۔ بہنے والے وہ بھی ہیں جو پانی پر پُرشکوہ تخت بچھائے بہہ رہے ہیں۔ وہ بھی جو خوبصورت بجروں میں بہہ رہے ہیں، وہ بھی جو براہ راست موجوں کی آغوش میں جھولے لیتے ہوئے بہہ رہے ہیں، اور وہ بھی جو غوطے کھا کھا کر بہہ رہے ہیں اور یہ بہنے والے ایک ایک کر کے ڈوب بھی رہے ہیں۔ مادہ پرستی کے اس طوفانِ مغرب میں جو قیمتی عنصر دھارے کے خلاف لڑ رہا ہے یا کم سے کم قدم جمائے کھڑا ہے یا کھڑا رہنے کی سعی کر رہا ہے، اس کے درمیان مولانا مودودی کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ کیوں کہ وہ وقت کی ہوا کے ساتھ چلنے پر ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی راضی نہیں ہوئے، بلکہ برابر ہوا کا رُخ بدلنے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

دراصل کسی دینی ملّت کی ساری زندگی کشمکش کی زندگی ہوتی ہے کیونکہ اسے ایک واضح عقیدہ اور معینہ ضابطہ کے تحت پورے نظام کو چلانا ہوتا ہے۔ مگر حالات کی ہوائیں موافق ہی نہیں، مخالف ہو کر بھی چلتی ہیں۔ مخالف ہواؤں کے چلنے پر سفینۂ تمدن کا رُخ اپنے اصولی نصب العین کی جانب رکھنا ایک کٹھن کام ہے۔ یہی کٹھن فریضہ ملت اسلامیہ نے بخوبی سرانجام دیا مگر بعد میں بدلتے حالات کا مقابلہ کما حقہٗ جاری نہ رہا۔ ایک اصولی نظام کا رُخ تاریخ کسی قدر موڑ لے گئی۔ مسلمانوں پر ماضی میں ایسے دو بڑے خوف ناک دور آئے۔ ایک عباسی دور، دوسرے سلطنت مغلیہ میں اکبر کا دور۔ ان دونوں موقعوں پر جو قوت سفینۂ ملت کی ناخدائی کر رہی تھی وہ طوفانی

ہواؤں اور موجوں کے سامنے خم کھا گئی، اور ان دونوں موقعوں پر طوفان سے لڑنے اور نظریہ و اصول کو بحال رکھنے کی سعادت اُن مردانِ خدا کے حصے میں آئی جن کے پاس ایمان، علم اور کردار کے سوا کوئی دوسری طاقت نہ تھی۔ اور اب تیسرا سنگین ترین دور درپیش ہے جس میں باہر سے فکری، سیاسی اور ثقافتی اثرات کا طوفان خوفناک رفتار سے پورے عالم اسلام میں اُمڈ رہا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے اور ان سے اُٹھے ہوئے اربابِ قیادت جن پر قلعہ کے بچاؤ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ذہنی غلامی کے روگ نے ان سے تابِ مقاومت سلب کر لی ہے اور وہ ہنستے مسکراتے اور خوش آمدید کہتے ہوئے کنجیاں دشمن کے حوالے کر رہے ہیں۔ عالم وہ ہو گیا کہ ؎

مستی سے اس نگاہ کی لے محتسب خبر   دنیا تمام بزم خرابات ہو گئی

یہی وہ خطرناک مرحلہ تھا جس کے لیے اقبالؔ نے یہ احساس قوم کو دلانا چاہا تھا کہ تم میدانِ جنگ میں ہو اور یہ موقع نوائے چنگ سے لُطف اندوز ہونے کا نہیں ہے بلکہ اس مردِ فرد انگر نے "دورِ حاضر کے خلاف" اس بھروسے پر اعلانِ جنگ بھی کر دیا تھا کہ قوم کے نوجوان اس کے اعلان پر صف بستہ ہو جائیں گے۔ آج اگر وہ نغمہ طرازِ جہاد اُٹھ کے دیکھے کہ اس کے شاہین و عقاب کس شان سے پسپا ہوئے ہیں تو اپنے رجز کو واپس لے کر شاید مرثیہ پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔

بہرحال اقبالؔ کے اعلانِ جنگ کی لاج رکھی تو مولانا مودودی نے، کہ خود ہی فکری و تہذیبی جنگاہ میں سینہ سپر نہیں ہوئے بلکہ قوم کے اندر سے بھی دارا اور صاحبِ کردار عنصر کو اپنے گرد سمیٹا اور آج اگر معرکہ گرم ہے تو اس شخص کے دم سے!

؎   فیضیؔ! احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز
گرم دارد زتو ہنگامۂ رسوائی را!

مولانا مودودی نے اس کوشش میں اپنی پوری زندگی کھپا دی ہے کہ حالات کے

سامنے جھک کر اپنے اصولوں کو مسخ کرنے کے بجائے ہم اصولوں کو قائم رکھنے کے لیے حالات سے جنگ کریں، اسلام کو ہم اپنی سہل طلبی کی وجہ سے تاریخ کے تابع نہ کردیں بلکہ تاریخ کو مجبور کردیں کہ وہ اسلام کے منشاء کے مطابق ڈھلے مودودی کاوشن یہ ہے کہ ہم مغربیت کے سانچے میں آرام سے نہ ڈھل جائیں، بلکہ مغربیت کے مقابل میں اسلامی نظریہ، اسلامی نظام حیات اور اسلامی تہذیب کو برپا کریں۔

یہ درحقیقت اپنی خودی کے تحفظ اور اپنی ہستی کی بازیافت کا پیغام ہے۔ اس پیغام سے اثر پذیر ہونے والوں کا احساس یہی ہو سکتا ہے کہ ؎

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

مادیت کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے لیے جس ایمان و شعور کی ضرورت ہے اسے نوجوانوں میں ابھارنے کے لیے مولانا مودودی نے ایک عظیم فکری کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ہزارہا صفحوں پر پھیلا ہوا لٹریچر فراہم کیا ہے جس میں کتاب و سنّت کی حکمت اور علوم حاضرہ دونوں کی روشنی میں تہذیب مغرب کے خلاف اپنا مقدمہ نہایت مدلّل طور پر ثابت کیا ہے اور اسلام کی اساسی صداقتوں سے لے کر اس کے اصول و احکام تک ہر چیز کو اس طرح منقح کر دیا ہے کہ اس دور کے عقلیت زدہ ذہن اس کے زیر اثر فکری انقلاب سے دوچار ہو جاتے ہیں اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اپنی گمشدہ ہستی دوبارہ ہاتھ آگئی ہے۔ مولانا مودودی نے اسلام کو انفرادی مذہب کی حیثیت سے نہیں پوری زندگی کے بہترین نظام عدل کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے اور بے شمار دلوں کو اس کی برتری کے اعتراف پر مجبور کر دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے اس نظام کو عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کے لیے نوجوان طاقت کو اٹھا کھڑا کیا ہے، شہریوں میں دیہاتیوں میں، تاجروں میں، ملازمین میں، ادیبوں اور صحافیوں میں، طلبہ میں، خواتین میں، مزدوروں

ہیں، غرضیکہ ہر طبقے میں ایک فعال طاقت موجود ہو گئی ہے۔

اس معرکۂ استدلال میں ایسی بھرپور فتح مولٰینا مودودی کو حاصل ہوئی ہے کہ بے اختیار یہ شعر نوکِ قلم پہ آگیا ہے ؎

صَمَتْنَا فَلَمْ نَتْرُكْ مَقَالًا لِصَامِتٍ
وَقُلْنَا فَلَمْ نَتْرُكْ مَقَالًا لِقَائِلٍ

"ہم جب خاموش ہوئے تو کسی خاموش بیٹھنے والے کے لیے کہنے کی کوئی بات باقی نہ رہی، اور جب ہم نے بات کی تو ہم نے کسی بات کرنے والے کے لیے کوئی موضوع نہ چھوڑا"

• مولٰینا مودودی کا لٹریچر آج پاکستان ہی کی ایک ایک بستی میں موجود نہیں ہے، بلکہ متعدد دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر عالمِ اسلام اور یورپ اور امریکہ میں بھی پھیل رہا ہے۔ اس کے نفوذ کا یہ حال ہے کہ مولٰینا کے مخالفین تک کے ذہنوں میں اس کی صدائے بازگشت سُنائی دیتی ہے۔ اس لٹریچر کے چھیڑے ہوئے مسائل، اس کا طرزِ فکر اور اس کی اصطلاحات کس گوشے میں موجود نہیں! بارہا اُونچے اُونچے ایوانوں سے ایسی تقاریر سُنی گئی ہیں جن میں یہ لٹریچر بول رہا ہوتا ہے یعنی ؎

اب وہی سارے زمانے کی ادا ٹھہری ہے

مولٰینا مودودی محض حکیم، مفکر اور ادیب ہوتے اور صرف اپنا پیغام ہی دے جاتے تو بھی ان کی عظمت کے کنگروں کو چھونا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا مگر اُنھوں نے انقلاب کی عملی جدوجہد کی ذمہ داریاں بھی اُٹھائی ہیں اور مردانہ وار اُٹھائی ہیں!

قوم کو پکارا، لبیک کہنے والوں کو جمع کیا، ان کو نظم میں پرو دیا، ان کی تربیت کی، نصب العین کے لیے ان کو وقت، قویٰ اور مال کی قربانی دینے کا درس دیا۔ ان کو سیاسی و عمرانی مسائل کا گہرا شعور دیا، ان کو مفاد کی کش مکش سے بے نیاز رہ کر زندگیوں کو انسانی اور ملکی خدمات کے لیے وقف رکھنے کا جذبہ

دیا، پھر اس بہم شدہ قوت کے بل پر ایک طرف الحاد پسند کمیونسٹ، مغرب پرست اور جاہ طلب عناصر کی مزاحمت نظریاتی اور سیاسی میدانوں میں جاری رکھی، دوسری طرف عوام ملک کو اسلامی نظام کے لیے تیار کرنے کی مہم چلائی۔ اخلاقی فساد کا مقابلہ کرنے کے لیے "انجمن تحفظِ اخلاقِ عامہ" کی تاسیس کی، تعلیمِ عوام کے لیے قرآن وحدیث کے درسوں، دارالمطالعوں، تعلیم بالغاں کے اداروں اور اسکولوں اور مدارس کا اجرا کیا، وقت کے مسائل سے جمہور کو آگاہ رکھنے کے لیے سلجھے ہوئے خطیبوں اور مقرروں کی ایک بہت بڑی ٹیم میدان میں اتاری، محنت کشوں کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا، غریب طبقوں کو بیماریوں سے بچانے اور بڑے بڑے مواقعِ مصیبت پر سہارا دینے کے لیے شعبۂ خدمتِ خلق قائم کیا۔ خواتین میں دین، اخلاقیات، اجتماعی مسائل کا شعور اور جدوجہد کا جذبہ پھیلانے کے لیے ان کی تنظیم کی، نوجوان طلبہ کو الحاد، کمیونزم اور مغربیت کا مقابلہ تعلیمی دائروں میں کرنے کے لیے خطوطِ کار بہم پہنچائے اور ان کو رہنمائی اور تربیت دی، ادب کی دنیا میں اسلامی قدروں کے مشعل بردار کھڑے کیے، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں تعمیرِ نو کے لیے ایک حرکت پیدا کر دی۔

آج اتنی رفیع الشان دینی و قومی خدمات کو انجام دینے والی مشین نصب ہو چکی ہے اور اس کے پرزے حرکت کر رہے ہیں۔

بدقسمتی سے مولینا مودودی کو نہایت گھٹیا حریفوں سے سابقہ پڑا اور زمانے نے اس داعئ فلاح کا خیر مقدم اولاً گالیوں، پھبتیوں، الزام تراشیوں اور تکفیر و تفسیق سے کیا (اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی حد تک برابر جاری رہا ہے) اور پھر غداری اور تخریب اور پاکستان دشمنی کے سیاسی الزامات وضع کیے گئے۔ یہاں تک کہ آخرکار سیفٹی قوانین کے ترکش سے تیر برسائے جانے لگے۔ قید و بند کے دور آئے اور بالآخر ایک دن اس مسافرِ راہِ حق نے دیکھا کہ پھانسی کی کوٹھڑی اس کی منزل بن گئی ہے۔

چلی تھی بات جو منبر سے، دار تک پہنچی
قلم کی نوک سے خنجر کی دھار تک پہنچی
مگر صدا تیری گردوں کے پار تک پہنچی

ظلم و جور کی یہ بھٹی ہر داعئ حق کے لیے گرم کی جاتی ہے۔ کیونکہ بغیر اس سے گزارے کھرے کھوٹے کا امتیاز نہیں ہو سکتا ہے ؎

بچہ گیر نہ عیارِ ہوس و عشق دِگر
رسمِ بیداد مباد از جہاں برخیزد!

اسی لیے عشق کی نگری کا یہ دستور ہے کہ کلمۂ خیر کہیے اور گالیاں کھائیے۔ پھول برسائیے اور کانٹوں سے دامن بھریئے، موتی لٹائیے اور پتھر کھائیے۔ بے لوث خدمت کیجیے اور مجرم ٹھہریئے۔ راستی کے مسلک پہ چلیے اور تعزیر بھگتیے۔

مولینا مودودی کی شخصیت، بفضلہٖ تعالیٰ ان بھٹیوں سے گزر کر کھرا سونا ثابت ہوئی۔

اور آج اس لمبی کشمکش، عمر بھر کی تعمیری جدوجہد اور امتحانِ بلا کی لذت کشی نے صورت ایسی پیدا کر دی ہے کہ مولینا مودودی راہِ حق کی ایک علامت ٹھہرے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ عقوبت سے گزرنے کے بعد اپنے دور میں علامتِ حق بن گئے تھے اور ان کی ذات معتزلہ اور دوسرے فتنہ طرازوں کے مقابل میں محاذِ سُنت کا ایسا مرکز بن گئی تھی کہ ایک شاعر پکار اُٹھا ؎

تری ذا الھوی جھلاً لِاَحمدَ مُبغضا ۔۔۔ وتعرف ذا التقوی یُحب ابن حنبل

"تو بندگانِ ہوس کو دیکھتا ہے کہ وہ جہالت زدہ ہوں گے اور احمد بن حنبلؒ سے بغض رکھتے ہوں گے اور اہلِ تقویٰ کو تو اس علامت سے پہچان سکتا کہ ابن حنبلؒ کے لیے ان کے دلوں میں محبت موجزن ہوگی"

مولینا مودودی بھی اس دور میں اور اس ملک میں حق کے محاذ کی ایک نمایاں علامت بن گئے ہیں۔ وہ ایک شخص نہیں رہے، بلکہ ایک دعوت، ایک

پیغام، ایک تحریک، ایک جدوجہد، ایک نظامِ زندگی اور ایک انقلابی محاذ کا مظہر ہیں۔

عینی مشاہدہ ہے کہ صدہا لوگ آتے ہیں، ایک نظر مولینا مودودی کو دیکھتے ہیں اور بس اٹھتے ہی سے ان کی اُمیدیں، امنگیں اور ہمتیں استوار ہو جاتی ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ تجدید و احیائے اسلام کا کام اس تاریک ترین دور میں بھی ہو سکتا ہے۔ اُنھیں یقین ہو جاتا ہے کہ رات کتنی بھی لمبی ہو اس کی کوکھ سے صبح جنم ضرور لے گی۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مودودی کے اندر جو انسانِ عظیم پایا جاتا ہے وہ بہ حیثیت انسان کشمکش اور امتحان ہی کے مراحل میں نہیں بلکہ غیر معمولی درجے کی شہرت و اعزاز کے درمیان بھی برابر حسن پاش رہا ہے۔ اس کی طرف سے کسی کو کچھ بھی گھٹیا پن کا تجربہ نہیں ہُوا۔

ہزارہا انسان اس سے ہر سال ملتے ہیں۔ ہر روز مختلف طبقوں کے اور علاقوں کے نت نئے ملاقاتی آتے ہیں، مختلف قسم کے ظروف و احوال میں اسے دیکھتے ہیں مگر اسے دیکھ کر کبھی کسی کو مایوسی نہیں ہوئی۔

حتیٰ کہ اس کے نادان حریف بھی تنہائیوں میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آدمی بس وہ ایک ہے جو نہ کبھی بکا، نہ جُھکا۔

جی ہاں! لوگوں نے عجیب عجیب حرکتیں کیں۔

بعض نے اسے نظر انداز کرنا چاہا کہ گویا وہ موجود ہی نہیں۔ اُنھوں نے اس سے آنکھیں بند کر لیں، لیکن ان کے ساموں کو بھی دکھائی دیا کہ ایک کوہِ گراں سامنے کھڑا ہے اور یہ تردید نہیں کی جا سکتی کہ وہ موجود نہیں ہے یا وہ محض ایک ذرۂ ناچیز ہے، بعض نے بہت اُونچی اونچی مسندیں بچھا کر مصنوعی مناصب کی بلندیوں سے اسے دیکھا کہ شاید وہ اس طرح ان کے مقابلے میں پست رہ جائے گا مگر اس سروِ بلند و بالا کا قامت کوتاہ نہ ہو سکا۔ بعض نے اسے "ملّا" کہہ کر ادنیٰ

بنانا چاہا، مگر اندازہ ہوا کہ بحیرۂ عرب کو چپہ چپہ کہہ کر سکیڑنے کی کوشش کا کچھ حاصل نہیں۔ یہ مقام قدرت کی دین ہے۔ کیا خوب کہا تھا، بغداد کے زند شاعر ابو نواس نے کہ ؎

ولا یطمئن فی ذالک منی طامعٌ

ولا صاحب التاج المحجب فی القصر

(مجھ سے میرے مقام فخر کو چھیننے کے لیے کسی شائق کا جی نہ للچائے، حتیٰ کہ اس تاجدار کو بھی اس کے درپے نہ ہونا چاہیے جو قصر شاہی کے سراپردہ میں دربانوں کے درمیان گھرا بیٹھا ہے۔)

ایسی درخشاں شخصیت کی سوانح نگاری یا شخصیت نگاری کی ذمہ داری اٹھانے والوں کے لیے ایک اہم کام یہ ہے کہ اس کی شخصیت کا صحیح مرتبہ اور مقام اور موقف واضح کریں۔ ہونے کو تو یہ کام ازخود ہو رہا ہے اور ایک شمعِ روشن کے گرد کتنا بھی غبار کیوں نہ پھیلا رہے وہ اپنے تعارف کے لیے اس کی محتاج نہیں ہوتی کہ کوئی قصیدہ خواں یہ بیان کرے کہ یہ شمع ہے اور اس کی روشنی بھی ہے۔

ابو نواس کا جو شعر اُوپر درج ہوا اسی کے ساتھ ایک مصرعہ ہے۔ ؎

غنی عن جمیع الناس حسبی من الفخر

(میرا دہن، یعنی کلام تمام لوگوں کے مقابلے میں میرا سرمایۂ افتخار بننے کو کافی ہے)

سو مولینا مودودی کے لیے بھی ان کا اپنا ایمان و کردار اُن کا مقام متعین کرنے کے لیے کافی ہے، مگر معاصرت زدہ عناصر (خصوصاً سیاسی حلقے) جب کسی کام کے آدمی کے گرد تعصبات اور غلط فہمیوں کا غبار پھیلا دیتے ہیں تو بہت سے لوگ استفادہ کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ تاآں کہ حقیقت ازخود ان سے اپنا حقیقت ہونا تسلیم کرائے۔

بڑا سوال یہ ہے کہ معاشرے میں تاریخ میں، اور اپنے دور میں اس کی جگہ

کیا ہے؟

معاشرے میں لوگوں نے اسے زیادہ سے زیادہ علماء کی صفوں میں جگہ دی ہے۔ تاریخی کشاکش کے لحاظ سے اسے حریفوں نے ایک اقتدار طلب شخصیت کے رنگ میں دکھانا چاہا ہے اور دَور کے لحاظ سے اسے بیرونی اور اندرونی مخالفین نے مغرب کے اسلام دشمن پروپیگنڈا کی مروّجہ اصطلاح کے مطابق ایک قدامت پسند اور رجعتی شخصیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ معاشرے کے موجودہ طبقوں میں سے کسی میں بھی مولٰنا کی ذات پوری طرح نصب نہیں ہوتی، ان کے لیے ایک نئی جگہ درکار ہے۔ کیونکہ وہ قدیم و جدید طبقوں کے درمیان بالفاظ خویش "بیچ کی راس" کے آدمی کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ تاریخی کش مکش کے لحاظ سے وہ اسلامی نظریہ اور اصولوں کو برسر اقتدار لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ دور کے لحاظ سے وہ علم اور سائنس کی ساری ترقیوں سے استفادہ کرنے اور مسائل تازہ کو اجتہادی زاویۂ نگاہ سے حل کرنے کے داعی ہوتے ہوئے مادیت کا طلسم توڑ کر انسانیت کی لازوال اخلاقی قدروں پر تمدن کی بنیاد رکھنے کے خواہاں ہیں۔

مگر کم لوگ، اور مخالفین میں تو بہت ہی کم لوگ ان کے صحیح مقام کو جان سکے ہیں۔ یہ کام مولٰنا کے سوانح نگار اور شخصیت نگار کا ہے کہ وہ ان کو صحیح مقام پر دکھائے۔

میرا کام محض تعارف کرانے تک محدود ہے اور شخصیت نگار کا کام اس سے آگے شروع ہوتا ہے۔

---

# ایک انسان

کہتے ہیں کہ پاکستان میں خوراک کی کمی ہے، تعلیم کی کمی ہے، اسلحہ کی کمی ہے۔ اور دوسری طرف آدمیوں کی بہتات ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں سب سے خوفناک آدمیوں ہی کا توڑا ہے۔ کوئی قوم اگر آدمیوں کے قحط سے دوچار نہ ہو تو اور ہر چیز کی کمی وہ پوری کر لے جاتی ہے۔ بلاشبہ مرد و زن کا "بے پناہ" ہجوم یا ایک ٹھاٹھیں مارتا "سمندر" ہے جو پاک زمین کے حصے میں آیا ہے۔ دس کروڑ نفوس! ان میں وزیر بھی ہیں، لیڈر بھی ہیں، ایم ایل اے بھی ہیں، صحافی بھی ہیں، ادیب اور اہلِ فن بھی ہیں، تاجر اور صنّاع بھی ہیں، سپاہی اور سپہ گر بھی ہیں، لیکن انسان بہت ہی کم ہیں "بڑے آدمی" ہماری قسمت میں بہت لکھے گئے ہیں لیکن "آدمی" ہمارے پاس نہیں ہیں! آج بھی ہمارے شہرِ زندگی کے گرد پیرِ رومی کا "شیخ" چراغ ہاتھ میں لیے سرگرداں ہے اور سراپا رہا ہے کہ "انسانم آرزوست!" ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں روایتی مردم شماری کا ریکارڈ کئی آدمیوں کا بوجھ ہو، لیکن اگر ہم اپنے ہاں کے ہر ذی عقل "معاشی حیوان" کو محض بطور مروّت انسان کہنا چھوڑ دیں تو پھر شاید مردم شماری کا سارا اندراج چاول کے ایک دانے پر ہو سکے گا! ــــــــ یہ آپ نے سنا ہو گا کہ ماہرِ فن خطّاط چاول کے دانے پر پوری سورۂ یٰسین لکھ دکھاتے ہیں! ہمیں آدمی بننے کے لیے ابھی ارتقا کی بڑی لمبی اور کٹھن راہ طے کرنی ہے۔

"آدمی" گوشت اور ہڈی کے اس بولتے اور چلتے پھرتے ڈھانچے کو نہیں کہتے جس پر چند اندرونی خواہشات سواری کرتی ہیں۔ آدمی نام ہے شعور اور احساس کا، آدمی نام ہے اصول اور ایمان کا، آدمی نام ہے سیرت اور اخلاق کا۔ اور یہ مخلوق ہمارے ہاں ایک ناقابلِ ذکر اقلیت کا مقام رکھتی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی اس اقلیت کا ایک فرد ہے ـــــ "ایک آدمی!"

وہ اگرچہ ایک انقلابی مفکر بھی ہے، ایک سحر طراز ادیب اور خطیب بھی، لیکن اس کی بڑائی کا اصل راز یہ ہے کہ وہ ایک آدمی ہے ایک ایسا آدمی جو پاکستان بھر میں نمایاں ہے۔ اگر ہم ہمالہ کی کسی چوٹی پہ کھڑے ہو کر ارضِ پاک پر نگاہ ڈالیں تو شاید پہلی نگاہ اسی شخصیت کے حصے میں آئے گی۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ یہ ایک ایسی شخصیت ہے کہ جس کی اہمیت کسی آبائی جاگیر، کسی سرکاری عہدے، کسی خاندانی منصب اور کسی مصنوعی شہرت اور نمائشی پروپیگنڈے کے سبب نہیں، بلکہ محض ایک نظریہ و مقصد، ایک سیرت و کردار، ایک سرگرمِ عمل انسان کے بل پر ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے تو فقط اس بنیاد پر کہ وہ ایک آدمی ہے، وہ ایک انسان ہے!

ہاں مگر ـــــ اب مودودی ایک فرد کا نام نہیں رہا۔ اب اس لفظ کو بولتے ہی زندگی کا ایک مکمل فلسفہ، ایک اجتماعی کیریکٹر، ایک سیاسی تصور، ایک منظم تحریک اور ایک نصب العین نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مودودی کا نام لیتے ہی اسلامی دستور کے مسائل ذہن میں اُبھرنے لگتے ہیں اور اسلامی نظام کا ہیولیٰ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اس معیار کی شخصیتوں کو ہمیشہ دیکھا اور دکھایا جاتا ہے۔ دیکھنا اور دکھانا ایک تو "اکابر پرستی" کے گھٹیا جذبے سے ہوتا ہے لیکن اس دیکھنے اور دکھانے کا ایک اعلیٰ محرک بھی ہے اور وہ یہ کہ اُن اوصاف اور عادات کو معلوم کیا جائے جنھوں نے ہم جیسے کسی پیکرِ آب و گِل کو ابنائے نوع کے لیے بہت بڑے پیمانے پہ خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا ہوتا ہے۔ اس تحریر کا منشاء بندگانِ خدا کے لیے ایک نیا ذہنی دیوتا گھڑ کے پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ہم یہی جاننا چاہتے ہیں کہ یہ شخص جس کے نام سے پاکستان کا ایک اَن پڑھ دیہاتی تک واقف ہے اور جس کا حلقہ تعارف عراق اور شام اور حجاز تک پھیلا ہوا ہے آخر اس کا اصل جوہرِ شخصیت کیا ہے!

جو لوگ بڑے آدمی کہلاتے ہیں اُن کی سب سے بڑی چھوٹائی یہ ہوتی ہے کہ ان کا بڑا پن بالعموم ان کی شخصیت پر باہر سے ایک خول کی طرح چڑھا ہوتا ہے۔ اس چمکتے دمکتے خول کو دُور ہی دُور سے دیکھتے رہیے تو بڑی مرعوبیت طاری رہتی ہے۔ اس کے اندر کے آدمی سے اگر مڈبھیڑ ہو جائے تو ناظر کے تصورات کے محل چکنا چور ہو جاتے ہیں، لیکن مودودی کی شخصیت اپنے بیرونی مظاہر سے لے کر اپنے باطنی جوہر تک بالکل یکساں اور یک آہنگ ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مودودی کی سوانح عمری اس کی پیشانی اور چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ مولانا عبیداللہؒ سندھی مرحوم جلا وطنی کا دور ختم کر کے واپس تشریف لائے تو کسی موقع پر ریل میں سفر کرتے ہوئے لاہور سے گزرے۔ مولینا مودودی ان سے ملاقات کرنے پلیٹ فارم پر پہنچے، مگر کچھ معلوم نہ تھا کہ مولینا سندھی کس درجے میں ہیں۔ تلاش میں تھے کہ مولینا سندھی مرحوم نے دیکھتے ہی خاص طور پر متوجہ کر کے (غالباً کھڑکی سے) مصافحہ کیا اور پہلے سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود بڑے جزم و یقین کے ساتھ استفہامیہ انداز میں فرمایا۔ "آپ مولینا مودودی ہیں نا؟" پہلی بار ایک چہرے کو اور وہ بھی ایک نظر دیکھ کر غائبانہ تعارف کے بل پر ایک شخصیت کو پہچان لینے کی جو حیرت انگیز نظیر سندھی صاحبؒ نے قائم کی وہ خود شاہد ہے کہ مودودی کا ظاہر اس کے باطن کا کتنا مکمل آئینہ دار ہے۔ ظاہر و باطن کے درمیان خود پیدا کردہ فاصلے نہیں ہیں، تصنع اور تکلف کے پردے نہیں ہیں، تضاد اور تناقض نہیں ہے۔ دُور سے جو کچھ دکھائی دیتا ہے، قریب آکر وہی اور زیادہ نکھر کر نگاہوں میں آجاتا ہے۔

آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے، اور اگر میں ان برسوں کی گنتی کر کے گن نہ لیتا تو میرا گمان یہی ہوتا کہ گویا کل کا واقعہ ہے ــــــ ــــــ میں ابھی اپنے گاؤں ہی میں مقیم تھا اور آئندہ زندگی کے متعلق بنتے

بگڑتے نقشوں میں گم سم کچھ لکھنے، کچھ سوچنے اور زیادہ تر پڑھنے اور سمجھنے میں مصروف! اُس چھوٹی سی دُور افتادہ دیہی آبادی کے برانچ پوسٹ آفس میں ہر روز ڈاک کا میلا سا جو تھیلا آیا کرتا تھا اس میں میرے نام کا کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ ضرور ہوتا۔ ایک رسالے میں مولینا کے نام سے جب پہلا مضمون میری نظر سے گزرا تو مضمون نگار کا نام ابوالاعلیٰ مودودی بڑا ہی عجیب لگا۔ یہ مضمون بھی کسی زورِ بیان کا متحمل نہیں تھا کیونکہ اس میں محض ایک اسلامی نوآبادی —— دارالاسلام —— کے عملی قیام کی دعوت دی گئی تھی[1] اس تحریر میں سادگیٔ بیان کا حُسن تو تھا ہی، مگر اس کا خاص اثر (جو اب تک میری کتابِ ذہن کے اوراق پر ثبت ہے) یہ تھا کہ لکھنے والا ان تمام لکھنے والوں سے مختلف چیز ہے جنھیں میں جانتا تھا اور اس کے اندر بڑا غیر معمولی پن ہے۔ ہمارے ہاں کی روایت کا تقاضا یہ تھا کہ اس ترغیبی مضمون میں ایک تو جوش انگیزی موجود ہوتی اور دوسرے روشن ہی روشن پہلو پیش کیے جاتے، لیکن نہیں، جذباتیت کے بجائے اس کا مزاج فکری تھا اور اس میں روشن پہلوؤں کے ساتھ مشکلات و موانع کو بھی قاری کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود بغیر صحافیانہ اور خطیبانہ لفاظی سے مدد لیے، لکھنے والے نے اس میں پوری پوری ترغیبی روح پیدا کر دی تھی۔ اس مضمون کے بین السطور کے دھندلکے میں ایک نئی قسم کی شخصیت میرے سامنے تھی جسے پہچاننے سے تو میں قاصر تھا، لیکن جس کی جاذبیت نے مجھے اسی لمحہ ناآشنائی میں اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ یہ کون آدمی ہے؟ یہ انوکھا سا نام کس کا ہے؟ یہ کیا اسکیم ہے؟ بس یہ

---

[1] ایسی آبادیوں کے ایک تخیل کا نقش میرے ذہن نے علامہ اقبال کے ایک مطبوعہ خطبے سے اخذ کیا تھا۔ اسی پس منظر کے ساتھ میں نے اس مضمون کو پڑھا۔ واقعہ میں بھی دارالاسلام کی اسکیم کے پیچھے اقبال کا ذہن کام کر رہا تھا۔

سوالات سامنے تھے اور مضمون کو بار بار پڑھا جا رہا تھا۔ والدِ محترم سے ذکر کیا اُن کو پڑھ کر سُنایا۔ اس رسالے کے مدیر نے اپنے نوٹ میں خود بھی مجوزہ سکیم سے دل چسپی کا اظہار کیا تھا، لہٰذا ان کو خط لکھا اور خط کے جواب میں سرسری سی ابتدائی معلومات مزید حاصل ہوئیں، مگر ان معلومات نے مزید تشنگی پیدا کر دی۔ میرے دل میں اس سے قبل صرف ایک ہی ملی شخصیت سے غیر معمولی دلچسپی کار فرما تھی ــــــ میرا اشارہ اقبال کی طرف ہے ــــــ لیکن اب ایک اور متوازی قسم کی شخصیت سے میری دلچسپی کا آغاز ہو چکا تھا ــ بعد میں غائبانہ تعارف کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

۱۹۳۷ء کے بالکل آغاز میں ہفتہ بھر کا پروگرام بنا کر لاہور آیا اور مدعائے سفر یہی تھا کہ اقبالؒ سے ملاقات کروں گا، بلکہ اس دور کے ذہن کے مطابق کہنا چاہیے "زیارت" جو بیک وقت پہلی بھی ثابت ہوئی اور آخری بھی۔

چند ہفتے بعد اقبالؒ اپنا نغمۂ حیات افروز پورا کر کے ازلی و ابدی فضاؤں کی طرف پرواز کر گیا۔ ۱۹۳۸ء کے وسطی حصے میں مولینا مودودی کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق لیے ہوئے پٹھانکوٹ کا عزم باندھ کر دوسرا سفر کیا۔ غائبانہ تعارف تو اب کافی آگے تک جا چکا تھا، کیوں کہ ماہ نامہ "ترجمان القرآن" کے متعدد شمارے نگاہ سے گزر چکے تھے اور "سیاسی کش مکش حصہ اوّل" کے فکر انگیز مباحث دل و دماغ میں اپنی جگہ پیدا کر چکے تھے، نیز مولینا کے ساتھ کام کرنے والے ایک کرم فرما سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہاں اس امر کا ضمناً تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اگرچہ ایک غیر سیاسی علاقے کا دیہاتی نوجوان تھا اور عملاً پارٹی پالیٹکس سے بُعد رکھتا تھا لیکن ملک میں مسلمانوں کو انگریزی استبداد اور متعصب ہندو اکثریت کی دو بلاؤں سے جو ہمت آزما کشمکش درپیش تھی اس سے نظری حد تک گہرا ربط رکھتا تھا۔ اپنی

پوری قوم کی طرح میں بھی اندھیرے میں تھا کہ اب کیا ہونا چاہیے اور راہِ نجات کیا ہے؟ مولینا مودودیؒ کی تحریریں دیکھ کر اُمید کی ایک کرن ہاتھ آئی کہ شاید یہ شخص صحیح طرز پر سوچ رہا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ذریعے اُلجھنوں کے اس جنگل سے باہر نکلنے کا راستہ مل سکے جو واقعاتی تاریخ کی صورت میں دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ میری ابتدائی دلچسپی مذہبی سے زیادہ سیاسی تھی، لیکن خود اس سیاست کے اندر "مسلم قومیت" کی روح تہ نشین تھی۔

ہاں تو میں گھر سے چلا اور کچھ وقفہ دارالاسلام کی اسی نو آبادی میں رہ کر مولینا مودودی اور ان کے خیالات اور ان کی عملی سکیم کو سمجھنے کا ارادہ لے کر چلا۔ بس والوں نے اپر باری دوآب نہر کے کنارے اُتارا۔ کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا کہ کوئی دیہاتی آئے اور مزدوری لے کر سامان پہنچا دے۔ آخر اس بستی کا خاکروب "فقیریا" اُدھر سے گزرا اور جب اُس کو معلوم ہوا کہ مجھے دارالاسلام جانا ہے تو اُس نے سوٹ کیس اور بستر سر پہ رکھ لیا اور ہم چلے۔ میرا یہ رہنما مجھے بسوں کی سڑک کے بجائے ریل کے پُل کے راستے لے گیا جو نیچے سے بند نہیں تھا اور ایک ایک قدم اس کے (غالباً ستر) سلیپروں پر رکھ کر اسے پار کرنا پڑتا تھا۔ پہلے تو اتنے لمبے پُل اور اس کے نیچے شور کرتے اور بپھرے ہوئے رواں دواں پانی کو دیکھ کر دل دہل گیا۔ ارادہ کیا کہ واپس ہو کر جرنیلی سڑک کے راستے نہر کو پار کر لوں، لیکن پھر خیال آیا کہ فقیریا کے سامنے مجھے ایسی کمزوری نہیں دکھانی چاہیے۔ چلا، مگر دس پندرہ سلیپروں پر لمبے لمبے ڈگ بھرنے کے بعد سر چکرایا، بیٹھ گیا، لیکن ایک بار پھر اسی ہمّت افزا خیال نے سہارا دیا اور پھر فقیریا کے نقوشِ قدم پہ آگے بڑھنے لگا جو بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے بے ساختگی سے چلا جا رہا تھا۔ پُل پار کرنے کے بعد جھاڑیوں، درختوں اور سبز گھاس کے بنے ہوئے ماحول میں چند کوارٹر دکھائی دینے لگے۔ اور ان کوارٹروں کے درمیان مسجد اپنے میناروں کی دونوں باہیں

اُوپر کو پھیلائے کھڑی تھی۔ پہلے سے اطلاع تھی اور ایک دوست منتظر تھے۔
نہایا دھویا اور پھر ملاقات کا بے چینی سے منتظر رہا۔ غالباً مغرب کی نماز کا وقت
قریب ہوا تو بستی کی مختصر سی آبادی —— تین چار افراد —— مسجد کی طرف
سمٹنے لگے۔ اذان ہوئی اور اس کی آواز پر قریب کے ایک بڑے کوارٹر سے
ایک شخص برآمد ہوا۔ وائل کا کرتہ، لٹھے کا "غرارہ نما" پاجامہ، سر پر وائل ہی
کی ایک ٹوپی (جو نماز کے لیے گویا خاص تھی) پاؤں میں غالباً باٹا کے سیاہ
رنگ کے سلیپر —— پورا لباس اُجلا جو سبز پس منظر میں عجیب شان سے
نمایاں تھا —— اس سادہ لباس کے ساتھ ایک روشن چہرہ (جلد کی سپیدی
کے ساتھ جوہر سیرت کی مخفی سی دمک لیے ہوئے) جس پر سکّہ بند مذہبی معیار
سے چھوٹی شوخ سیاہ رنگ ڈاڑھی!! —— کسی تعارف کے بغیر میں پہچان
گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے خیالات سے میں نے تھوڑا سا استفادہ کیا
ہے۔ آنے والے نے مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک ایسے انداز سے "السلام علیکم"
کہا جو آج تک میں نے کسی میں نہیں پایا۔ مؤدبانہ جھجک کے ساتھ مصافحہ کیا،
کھڑے کھڑے دوستوں نے مختصر تعارف کرایا اور پھر جماعت کھڑی ہو گئی۔
نماز کا امام بھی وہی شخص تھا۔ دلچسپ یہ کہ نماز اور قرأت کا اسلوب بھی بے حد
ندرت لیے ہوئے تھا اور اس میں بھی اس شخص کی سیرت کی جھلک موجود تھی۔

اپنے پروگرام کے مطابق دو مہینے کا عرصہ میں نے جنگل کے دامن میں
آباد شدہ اسی چھوٹی سی بستی میں گزارا۔ مولینا مودودی کا بیشتر وقت ترجمان القرآن
کی ادارتی ذمہ داریوں، تصنیفی کاموں اور خط و کتابت میں صرف ہوتا۔ مولینا سے
ملاقات یا تو نمازوں کے اوقات پر مسجد کے کشادہ صحن میں ہوتی اور کبھی
نماز سے قبل اور کبھی نماز کے بعد بات چیت رہتی یا عصر کے بعد
مولانا جب سیر کو نکلتے تو ترجمان القرآن کے منیجر اور کاتب مولانا صدرالدین
اصلاحی اور میں —— اور کوئی مہمان آجاتا تو وہ بھی —— سب ساتھ جاتے۔

دین وسیاست کے اہم مسائل پر بحثیں بھی ہوتیں، لطائف بھی ہوتے، بستی اور اس کی مقصدی سکیم سے متعلق معاملات بھی چھڑتے، ترجمان القرآن اور اس کے مکتبہ کے امور کا تذکرہ بھی ہوتا اور اہم اور دلچسپ خطوط اور باہر سے آئے ہوئے سوالات اور اعتراضات پر بھی بات چیت ہو جاتی۔ اس "بزم متحرک" کی دلچسپیاں اور ان کی یادیں تو اب دل و دماغ کا مستقل سرمایہ بن گئی ہیں۔ کبھی مغرب کے بعد کا کھانا یکجائی ہو جاتا اور سلسلۂ گفتگو عشا تک جاری رہتا۔ اس "بزم متحرک" کا نشہ دو ہی چار دن میں اتنا تیز ہو گیا تھا کہ صبح ہی سے عصر کا انتظار رہتا اور اشتیاق کہتا کہ؎
"سورج خدا کے واسطے ہو جا تلے تلے!"

ابتدائی رابطے کے اس دور کی واقعاتی تفصیلات اب کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہیں اور نہ گفتگوؤں ہی کا پورا مواد سامنے رہ گیا ہے، البتہ وہ تاثرات میں بیان کر سکتا ہوں جن کو اپنے ساتھ لیے میں بعد کے اسلامی تحریک کے اس چھوٹے سے کیمپ سے رخصت ہوا۔

خیالات ہی کے مطالعے سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ شخص "مولوی" نہیں ہے (یہ بات مولویت کے بارے میں ہر طرح کے تحقیر آمیز تاثر سے الگ ہو کر محض حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے کہہ رہا ہوں) پہلی بار چہرہ سامنے آنے پر میری نگاہ نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ بعد کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں نے اس رائے کو قطعی بنا دیا، مگر حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ یہ شخص "مسٹر" بھی نہیں تھا۔ وہ مومن اور دین کا رمز شناس ضرور تھا، مگر اس کے گرد روایتی تقویٰ کی پُر تکلف اور بوجھل فضا نام کو بھی موجود نہ تھی۔ وہ آزاد خیال اور وسیع النظر تھا، مگر اس میں وہ لاابالیانہ پن بالکل نہیں تھا جو اسلام تک کی حدود کو پامال کرتا کہیں کا کہیں جا پہنچتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک گفتگو مجھے نہیں بھولتی جب کہ ہماری "بزم متحرک" میں ڈاڑھی کی بات چھڑی۔ مولینا

مودودی کہہ رہے تھے کہ (الفاظ یاد نہیں صرف مفہوم ذہن میں ہے) ڈاڑھی کو آج جو غیر معمولی اہمیت دے دی گئی ہے اصولاً وہ نظام دین میں نہیں تھی۔ مجھ ایسا روزانہ بدستِ خود شیو بنانے والا اور ڈاڑھی کے بارِ گراں سے ڈرنے والا نوجوان یہ الفاظ سُن کر مطمئن بھی ہوا اور حیرت زدہ بھی! اسی حیرت زدگی میں بے اختیار میں نے سوال کیا کہ کیا ڈاڑھی نہیں رکھنی چاہیے؟ جواب ملا کہ میرا مطلب یہ نہیں، رکھنی تو چاہیے، لیکن اس کو دینی حلقوں نے جو حد سے بڑھی ہوئی اہمیت دے دی ہے وہ خود دین میں نہیں پائی جاتی۔ آج تو ایک مسلمان سے مذہبی حضرات کے ہاں جو اہم ترین اوّلین مطالبات کیے جاتے ہیں ان میں ڈاڑھی پیش پیش ہے[1]۔ اس گفتگو سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ شخص متوازن مزاج اور انصاف پسند ہے۔ انصاف پسندی اور توازن کی ایک اور اہم شہادت جو میرے سامنے آئی اس نے بھی مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔ ان دنوں میرے دل میں مسلم لیگ کے لیے دبی دبی سی ہمدردی موجود تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ چند دوستوں کی مبلغانہ بحثوں نے خاکسار تحریک کے بارے میں کچھ جاننے اور سمجھنے کی تحریک پیدا کر دی تھی۔ مودودی صاحب سے کسی موقع پر میں نے علامہ مشرقی کے نظریے اور ان کی پیدا کردہ تنظیم کے متعلق رائے دریافت کی۔ اس پر ایک لمبا سلسلۂ گفتگو

---

[1] اس سلسلے میں یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ لباس، رہن سہن، پردے اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے متعلقہ مسائل میں مروجہ جامد اور انتہا پسندانہ مذہبی تصورات اور ان کے خلاف نمودار ہونے والے ردِ عمل نقطۂ نظر کے درمیان مجھے اس خطِ اعتدال کو پا لینے کا موقع ملا جو مدتوں سے کھو چکا تھا۔ ایسی گفتگوؤں کے زیرِ اثر بنیادی طور پر میرا نقطۂ نظر بدل گیا۔ اگرچہ مجھے اس وقت اس تبدیلی کا پورا شعور نہ تھا۔

ہماری بزمِ متحرک میں چھڑ گیا۔ مولینا نے نظریۂ ارتقاء کی توضیح کر کے بتایا کہ درحقیقت علامہ صاحب نے اپنی فکر اور تحریک کی اساس اسی نظریے پر رکھی ہے اور اُوپر سے اُسے اسلامی اصطلاحات کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مولینا نے مشورہ دیا کہ سُنی سنائی باتوں کے بجائے مجھے علامہ صاحب کے اصل لٹریچر کو خود دیکھنا چاہیے اور ٹھوس طریق سے کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔ کتابیں مولینا کے پاس موجود تھیں جن میں سے "تذکرہ" اور "اشارات" کو میں نے پڑھا۔ دونوں کتابوں پر مولینا مودودی کے حواشی موجود تھے اور ان کو میں ساتھ ساتھ دلچسپی اور ذوقِ تجسس سے پڑھتا گیا۔ ان حواشی میں کہیں تو کلمہ ہائے اعتراف اور کلمہ ہائے تحسین موجود تھے، کہیں بیزاری اور اختلاف کا اظہار، اور کہیں کہیں فکری لغزشوں پر سخت درجے کی گرفت پائی جاتی تھی۔ ان حواشی کو پڑھنے سے مجھے خاکسار تحریک کی ماہیت سمجھنے کے ساتھ ساتھ مودودی صاحب کی سیرت کے ایک اہم گوشے کو بھی زیادہ اچھی طرح جاننے کا موقع ملا۔ میرے سامنے اب تک زیادہ تر ایسے ہی لوگ تھے جو نظریاتی اور سیاسی میدان میں آ کر کسی کے مخالف ہوں تو اندھے مخالف ہوتے ہیں اور حامی ہوں تو غالی حامی! لیکن اس میدان میں مجھے پہلی بار ایک نئے کردار سے تعارف حاصل ہوا۔

یہ بات بھی میں نے سمجھ لی کہ یہ شخص "با زمانہ ساز قسم" کا آدمی نہیں ہے، نہ جامد اور منفی اور منفعل قسم کی فطرت پر اس کی شخصیت مبنی ہے، بلکہ یہ ایک اصول و مقصد رکھنے والے نایاب مردانِ کار کی طرح "با زمانہ ستیز" کے حوصلے رکھتا ہے۔ تھوڑی سی معلومات کی روشنی میں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے اب تک سفرِ حیات با مقصد قربانیاں دیتے ہوئے کاٹا ہے اور آئندہ اس کے سامنے معاشی نقصانات اور سیاسی مخالفتوں کے سنگین تر مراحل ہیں، لیکن یہ اپنی منزل سے منہ موڑنے والا نہیں ہے۔

مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اس کے سامنے جو کچھ بھی سکیم ہے (اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی عملی صورت میرے ذہن میں مشخص نہیں ہو سکی تھی) وہ ایک لمبا پروگرام اور ٹھنڈا طریقِ کار اور کسان کا سا صبر چاہتی ہے۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر کام کے نتائج کی فصل جلد از جلد کاٹ لینے والوں میں سے نہیں ہے اور نہ جوشیلے پن کا مریض ہے جو ہماری قوم کا موروثی روگ بن چکا ہے۔

یہ رائے بھی میرے ذہن میں قائم ہو گئی کہ یہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے، اپنے ارادوں میں مخلص ہے اور اس کی متاعِ فکر و عمل منڈی کا مال نہیں ہے۔

سب سے زیادہ مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ میرے جیسے ایک دیہاتی نوجوان کو جس کا علمی یا عملی، دینی یا سیاسی، کسی بھی لحاظ سے کوئی مقام نہ تھا، مولانا مودودی کی نگاہوں میں ایک اہمیت حاصل تھی۔ میں نے کسی لمحے یہ محسوس نہ کیا کہ ایک بڑا آدمی کسی اونچے مقام سے مجھے دیکھ رہا ہے اور "بڑے آدمیوں" کے بارے میں میرا جو کچھ تصور چلا آ رہا تھا وہ مودودی صاحب کے حق میں قطعی طور پر بدل گیا۔ وہاں بُعدِ مراتب کے بجائے میں نے قُربِ اخوت محسوس کیا۔ یوں یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح تھی کہ مولینا "پیرانِ کہن سے نومید ہیں" اور "بر جواناں سہل کن حرفِ مرا" کی دُعا کے ساتھ قوم کی نئی نسل کی طرف رُوئے سخن رکھتے ہیں۔

الغرض میرے لیے یہ ایک نیا کردار تھا جس کا عنوان تجویز کرنا مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ ہمارے مستقبل کا "کردار" ہے۔ "اگلے وقتوں" کے لوگوں کے بالکل خلاف "یہ آنے والے وقتوں" کا کردار تھا۔ یہ کردار "مرعوب کن" نہیں بلکہ جاذبیت دار تھا۔ اس سے ڈر نہیں آتا تھا بلکہ اس کے لیے محبت و احترام کے جذبات پیدا ہو گئے تھے! ان سارے تاثرات کے ساتھ مودودی کی ذات اور اس کی فکر سے ایک گہرا رابطہ استوار کیے ہوئے میں نے دارالاسلام کو الوداع کہی۔

یہی ہے وہ ایک "آدمی" جس کی شخصیت کا مطالعہ کرنا پیشِ نظر ہے۔ مطالعۂ شخصیت کا اصل مقصود اُس جوہرِ سیرت کا سراغ لگانا ہے جس کا پرتو آدمی کی زندگی کے بعید ترین گوشوں تک جا پڑتا ہے اور جس کے سرچشمے سے زندگی کی کیاری کا ایک ایک ذرّۂ خاک سیراب ہوتا ہے۔ کسی کے جوہرِ سیرت تک پہنچنے کے لیے جب ہم ذہنی سفر کرتے ہیں تو سب سے پہلے سابقہ "مظاہرِ شخصیت" سے پیش آتا ہے، اور آگے بڑھیں، تو اخلاقی اطوار سے دوچار ہوتے ہیں اور سب سے آخر میں جا کر نظریات و افکار اور اصول و مقاصد دیکھے جاتے ہیں۔ مولینا مودودی کی شخصیت کے فکری پہلو[1] تو میں نے ایک الگ مضمون میں پیش کر دیا ہے۔ اخلاق و اطوار پہ یہاں براہِ راست بحث کرنے کا ارادہ نہیں، یہاں صرف مظاہرِ شخصیت کو پیش کرنا مطلوب ہے۔ "مظاہرِ شخصیت" سے میری مراد آدمی کے وہ مخصوص اسالیب و اطوار ہیں جو بول چال، تحریر و تقریر، کھان پان، نشست و برخاست اور "ذوقیات" کے اندر پائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے اس کے ذہن اور اس کی سیرت کی کتاب کو پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی گھر کے جس ماحول میں رہتا ہے، جس بیٹھک میں بیٹھتا اور جس دفتر میں قلم چلاتا ہے، جس لباس کو پہنتا اور جن اشیا کو اپنے استعمال میں رکھتا ہے، ان سب پر اس کی شخصیت کی چھاپ پڑی ہوتی ہے۔ کوئی شخص فرنیچر اور دوسرے سامان کو جو ترتیب دیتا ہے، جس ڈھنگ سے وہ خطوط لکھتا ہے، جس طرز پر وہ دستخط ثبت کرتا ہے، اس کے اندر اس کی شخصیت کی رُوح شامل ہوتی ہے۔ یہ سب مظاہرِ شخصیت ہیں اور ان کا مطالعہ کر کے کسی شخص کے اصل جوہرِ سیرت کی قدر و قیمت مشخص کی جا سکتی ہے اور اس

---

[1] ملاحظہ ہو "مولینا مودودی۔ اپنی اور دوسروں کی نظر میں"۔

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

کا اخلاقی مقام متعین کیا جا سکتا ہے، چاہے اس سے ملاقات تک کا موقع نہ ملا ہو۔ آدمی کی داستان عمر بھر اس کے ماحول اور اس کے املاک اور اس کے مستعملات پر کسی پر اسرار قلم سے مرقوم ہوتی رہتی ہے۔ مظاہر شخصیت کے مطالعہ کے معنی خفیہ رسم الخط میں لکھی ہوئی اسی داستان کو پڑھنے کے ہیں۔ ورنہ بجائے خود معلومات کہ فلاں کیا پہنتا اور کیا کھاتا ہے اور کیسے بیٹھتا ہے اور کیونکر بولتا اور لکھتا ہے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتیں، اور ان کے حاصل کرنے اور قلم بند کرنے اور دوسروں تک منتقل کرنے میں وقت اور قوت صرف کرنا کسی معقول آدمی کا مشغلہ نہیں ہو سکتا۔

آدمی کا سراپا اس کی شخصیت کا نشیمن ہوتا ہے اور سراپا کو ایک نظر دیکھتے ہی انسانی کرداروں کا ایک رازداں اس کے اندر رہنے بسنے والی شخصیت کا حدود اربعہ پا لیتا ہے۔ مولینا مودودی کا سراپا، بلکہ وجاہت دار چہرہ کسی بھی ماحول میں ہو ـــــ گھر میں، مجلس میں، دفتر میں، ریلوے اسٹیشن پر، گاڑی کے کسی ڈبے میں، جلسۂ عام میں ـــ بالکل ممتاز اور نمایاں رہتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ جس شخصیت کا آئینہ دار ہے اس کے نمونے تقدیر نے بہت زیادہ تعداد میں نہیں بنائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے آغاز میں مولینا مودودی کی ایک قلمی تصویر پیش کر دی جائے۔ یہ تصویر میں اپنے قلم سے کھینچنا چاہتا تھا، مگر اس میں وقت زیادہ درکار ہے۔ وقت بچانے کے لیے

---

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کچھ لوگ ہمیشہ ایسے پائے گئے ہیں جو بڑے آدمیوں کے مظاہرِ شخصیت کا چربہ اتارتے ہیں حالانکہ اصل نتیجہ خیز چیز اپنے اندر کسی اچھے جوہر سیرت کا پیدا کرنا ہے اور اس کے نتیجے میں ہر آدمی کے اپنے مظاہرِ شخصیت ایک امتیازی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی کی شخصیت کا لباس پہن کر ہم اپنا قد و قامت اس کے مطابق نہیں بنا سکتے، بلکہ ہمیں اپنے ہی قد و قامت کے مطابق لباس سج سکتا ہے۔

میں اپنے صحافی دوست علی سفیان آفاقی کی مرتبہ تصویر مستعار لے لیتا ہوں:

"چھوٹے بالوں کے پٹے جن میں درمیان سے مانگ نکلی ہوئی، کھلتا ہوا گندمی رنگ، چوڑا ماتھا، آنکھوں پر ہلکے سے نیلے رنگ کے شیشوں کی عینک (نہیں — مولانا سفید شیشے استعمال کرتے ہیں۔ ن ص) دوہرا جسم اور مسکراتی ہوئی آنکھیں، چہرہ ہنس مکھ، اور سفید سی ڈاڑھی پر[1] جہاں تہاں سیاہی مترشح!"

(ماخوذ از "ابوالاعلیٰ مودودیؒ")

مولینا مودودی ان "بہ قیمت بہتر" لوگوں میں سے ہیں جن کی قامت پر توجہ نہیں دی جاتی۔ یوں قد بہت چھوٹا نہیں ہے، دوہرے بدن کی وجہ سے نظر کو مغالطہ ہوتا ہے لیکن موزونیت اس درجہ کی ہے کہ مودودی صاحب کے سراپا میں کوئی بات کھٹکتی نہیں۔ دوہرے بدن کے باوجود مولینا کی چال ڈھیلی ڈھالی اور مریل قسم کی نہیں ہوتی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی خاص مشن پر جا رہا ہے۔ "چال" کے بارے میں انھی دنوں تفہیم القرآن کے حاشیے میں خود مودودی صاحب نے بڑے کام کی بات لکھی ہے، ملاحظہ ہو:

"مگر غور طلب پہلو یہ ہے کہ آدمی کی چال میں آخر وہ کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیات گنتے

---

[1] آفاقی صاحب نے دورِ اوّل نہیں دیکھا جب ڈاڑھی بالکل سیاہ تھی اور ذرا چھوٹی تھی۔ اس کے حلقے میں کشادہ پیشانی والا روشن چہرہ عجیب منظر سامنے لاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولینا مودودی کی ڈاڑھی کے بال غیر معمولی تیز رفتاری سے سفید ہوئے ہیں اور بعد میں تو کوئی اکا دکا بال ہی سیاہ رہ گیا ہوگا۔

ہوئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا ؟ اس سوال کو ذرا تامل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی چال محض اس کے اندازِ رفتار ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ درحقیقت اس کے ذہن اور اس کی سیرت و کردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیار کی چال، ایک غنڈے بدمعاش کی چال، ایک ظالم و جابر کی چال، ایک خود پسند متکبّر کی چال، ایک باوقار مہذب کی چال، ایک غریب مسکین کی چال اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے آدمیوں کی چالیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ پس آیت کا مدعا یہ ہے کہ رحمان کے بندوں کو تو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لو گے کہ یہ کس طرز کے لوگ ہیں۔ اس بندگی نے ان کی ذہنیت اور ان کی سیرت کو جیسا کچھ بنا دیا ہے اس کا اثر ان کی چال تک میں نمایاں ہے۔ ایک آدمی انھیں دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا ہے کہ یہ شریف اور حلیم اور ہمدرد لوگ ہیں، ان سے کسی شر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

(ترجمان القرآن، ج ۴۴، عدد ۵)

میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مولینا مودودی کی چال یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ شخص احساسِ ذمہ داری کے عالم میں کوئی فرض ادا کرنے جا رہا ہے، مگر گھبراہٹ کے انداز سے نہیں، پُر وقار طریق سے! ممکن ہے دوسروں کا تاثر کچھ اور ہو، لیکن اتنا بہرحال ہر کوئی محسوس کر لے گا۔ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا کے معیار پر یہ چال پوری اُترتی ہے۔

مودودی صاحب کے سراپا کا ایک جزو لباس بھی ہے اور میں پہلے

ذکر کر چکا ہوں کہ وہ گھر اور دفتر میں رہتے ہوئے کیسا لباس پہنتے تھے۔ سردیوں میں کھلے پاجامے کے ساتھ دھاری دار قمیض اور اُونی سوئیٹر استعمال کرتے تھے، سر پر گرم اُونی ٹوپی پہن لیتے تھے۔ پاؤں میں جرابوں کے علاوہ چمڑے کے موزے بھی ہوتے تھے اور باٹا کا کینوس کا نیوکٹ جوتا، گاہے گاہے سخت سردی ہو جانے پر سفید رنگ کی اُونی قبا بھی اوڑھ لیتے تھے جسے زیارت سے آتے ہوئے ساتھ لائے تھے۔ باہر جانا ہو تو تنگ موری کا چوڑی دار پاجامہ، موسم کے مطابق گرم یا سرد شیروانی اور قراقلی کی بنی ہوئی اُونچی باڑھ کی سیاہ رنگ ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ گرمیوں میں باہر جانے کا لباس کبھی کبھی شیروانی سمیت بالکل سفید ہوتا اور غالباً اس لباس میں مولٰنا مودودی صاحب کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہو جاتی تھی۔ وضو کے لیے لکڑی کی کھڑاویں موجود رہتی تھیں۔ لباس کے تنوع کا دائرہ وسیع، لیکن شخصیت کی ترجمانی اور زیبائش کے لحاظ سے ہمیشہ موزوں رہتا تھا۔ مودودی کے لباس کے اصل اجزا تھے —— صفائی، سادگی اور حسنِ ذوق!!

آدمی حیوانِ ناطق ٹھہرا۔ نطق سے بڑھ کر اس کا کوئی ترجمان اور غمّاز نہیں ہو سکتا۔ نطق شخصیت کے بہاؤ کی رودگاہ ہے۔ آدمی نے بات کہی اور اس کی حقیقت کھلی۔ ناطقہ کی تانت باجی تو زمانے بھر نے راگ پا لیا۔ "تا مرد سخن نگفتہ" والی بات پرانی نہیں ہوئی۔ موضوعات کی پسندیدگی، زبان کا معیار، الفاظ کا انتخاب، لہجہ کا اتار چڑھاؤ، بولنے کی رفتار، آواز کی پستی و بلندی، بات چیت میں جذبات کی آمیزش اور اس کا تناسب وہ چیزیں ہیں جو پانچ منٹ میں ایک آدمی کی ساری مخفی حقیقتوں کا خود اسی کی زبان کے لاؤڈ سپیکر سے اعلانِ عام کر دیتی ہیں۔ کسی کا ذہنی و علمی معیار کیا ہے، کسی کا ظرف کتنا ہے، کسی کا ذوق کس نوعیت کا ہے، کسی میں سنجیدگی کس درجہ پائی جاتی ہے، کوئی کہاں تک بااصول ہے، یہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے سوالات

ہیں جن کا جواب ایک شخص دو چار فقرے بول کر دے چکتا ہے، مگر بسا اوقات خود نہیں جانتا کہ اس نے اپنی کن کن حقیقتوں کو دوسروں کے سامنے رکھ دیا ہے۔

مولینا مودودی کی گفتگوؤں سے میں گزشتہ چودہ پندرہ برس کے زمانے سے بہرہ اندوز ہوتا رہا ہوں۔ مولینا کے اندازِ گفتگو پر چند باتیں جو مستقل تاثرات کی حیثیت میں میرے ذہن میں موجود ہیں، اس موقع پر بیان کرتا ہوں۔

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ تحریر یا تقریر کے آدمی کو ہم جتنا بلند پاتے ہیں وہی آدمی مجلسی زندگی میں گفتگو کرتے ہوئے انتہائی پست ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس کی تحریر یا تقریر میں اصول پسندی اور مقصدیت ہوتی ہے، لیکن اپنی گفتگو میں اس کا بے اصولا پن اور اس کی لامقصدیت صاف صاف نمایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں جو سنجیدگی اور معقولیت کسی کی شخصیت میں محسوس ہو رہی تھی، بے تکلفانہ گفتگو کے ماحول میں ملمع کی وہ ساری چمک دمک غائب ہو کر رہ گئی۔ تحریر و تقریر میں علمیت و تفکر کے کچھ آثار جھلملا رہے تھے، لیکن گفتگو کے دائرے میں سامنا ہوتے ہی یہ راز کھل جاتا ہے کہ وہ سب کچھ تصنع کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں زبان کے ٹھاٹھ موجود تھے، لیکن بات چیت میں سب غائب۔ الغرض تحریر و تقریر کا آدمی ہمارے ہاں بالعموم اس آدمی سے بالکل الگ ہوتا ہے جس سے ہم مصافحہ کرتے ہیں، جس کے ساتھ بیٹھتے اور جس سے بات چیت کرتے ہیں، لیکن مولینا مودودی اس معاملے میں اپنی مثال آپ تھے کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر کے دوگونہ میدانوں میں ایک ہی سی حالت پر رہتے تھے، بلکہ اظہار کے ان وسیع میدانوں سے لوٹ کر جب کبھی عام بات چیت کے نسبتاً محدود دائروں کی طرف پلٹتے تھے تو بھی اپنی یکسانی کو برقرار رکھتے تھے۔ وہی بلندیٔ فکر، وہی سنجیدگی و وقار، وہی حُسنِ گفتار، وہی غیر جذباتی لب و لہجہ، الفاظ کا وہی حسنِ انتخاب، ظرف کی وہی وسعت، معلومات کی وہی بے کرانی، مقصدیت و اصولیت کا وہی

زور، اور کلام کا وہی مزاج آپ کو عصرانہ نشست کی ہلکی پھلکی بات چیت میں بھی ملے گا جو موصوف کی تحریر و تقریر میں پایا جاتا تھا۔

بڑے لوگوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے اندر دوسروں کے لیے بڑی زوردار جاذبیت پائی جاتی ہے اور جاذبیت کا یہ اثر ان کی گفتار میں پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ جاذبیت کے لیے بہت ساری چیزیں تباہ کن ثابت ہو سکتی ہیں، مگر ان میں سے ایک سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ ہے آدمی کی خودی کا متورم ہو جانا! خودی جب متورم ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان اور اس کی گفتگو اس کے زہر سے متاثر ہوتی ہے۔ اس عالم میں آدمی کی "میں" کا بوجھ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور وہ ہر موقع پر اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے، اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں پر ٹھونستا ہے۔ اپنے آپ کو اہمیت دیتا ہے۔ اپنے آپ کو کچھ تسلیم کرانا چاہتا ہے، لیکن متورم خودی کے بوجھ کو اٹھانے پر کوئی دوسرا تیار نہیں ہوتا۔ لوگوں کو ایسے شخص کی گفتگو سے انقباض ہوتا ہے اور اس کے اردگرد سے چھٹ چھٹا جاتے ہیں۔ مولٰینا مودودی کو اللہ نے صحت مند خودی دی ہے اس شخص نے اپنے آپ کو دوسروں پر ٹھونسنے اور اپنے آپ کو کچھ منوانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ میں نے بارہ پندرہ برس میں سینکڑوں مجالس میں مولٰینا مودودی کی گفتگوؤں کو سنا ہے مگر کبھی کسی گفتگو کے دوران میں ایسا نہیں ہوا کہ میرے یا دوسرے ساتھیوں کے ذہن نے مولٰینا کی انا کا بارِ گراں اپنے اوپر پڑتا محسوس کیا ہو۔ ایک رُخ یہ، اور دوسرا رُخ یہ کہ مولٰینا مودودی کی زبان پر کبھی کوئی فریب کارانہ کلمۂ انکسار بھی نہیں آیا۔ یہ بھی انسانی خودی کا ایک دوسرا رنگ ہے اور شاید پہلے سے کچھ زیادہ ہی خطرناک! مودودی صاحب سے ملنے والوں کو کبھی یہ ابتلا پیش نہیں آتی کہ انھیں ایک شخص کی مسلسل سننی پڑے اور خود ان کو مافی الضمیر

کے کہنے کا موقع نہ ملے۔ یہاں ہر شخص کو بات کرنے کا کھلا موقع ملتا ہے۔ جس میں نہ مودودی صاحب کی شخصیت رکاوٹ بنتی ہے نہ جدید یا قدیم قسم کے مراسم و آداب!

ہمارے معاشرے کی ایک عام روایت بن چکی ہے کہ لوگ اختلافی گفتگوؤں میں ضرور ہی لڑنے جھگڑنے پر اُتر آتے ہیں۔ ہماری یہ قومی صفت صرف معمولی درجے کے لوگوں میں نہیں، اُونچے درجے کے مصنفین، لیڈروں، وزیروں، حکام، اخبار نویسوں اور مذہبی رہنماؤں سبھی میں پائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں گفتگو کا بنیادی فارمولا یہ ہے کہ اپنی بات دوسرے سے منوا کے چھوڑنا ہے۔ اس کے لیے دو بڑے ہتھکنڈے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو ذرا کم کم استعمال میں آتا ہے وہ لجاجت کا ہتھکنڈا ہے، یعنی ہونٹ لٹکا لٹکا کے، خوشامد کر کر کے اور اپنے جذبات کے حق میں رحم کی اپیلیں کر کر کے مخاطب سے کوئی بات منوانا! دوسرا ہتھکنڈا جو بھٹیار خانوں اور قہوہ خانوں سے لے کر پارلیمانی ایوانوں تک کثیر الاستعمال ہے قوت غضبیہ کو کام میں لانے کا ہتھکنڈا ہے۔ یعنی آپ نے بات کہی، نہیں مانی گئی تو پھر ذرا زور دے کر اسے دُہرایا، پھر نہیں مانی گئی تو آواز اُونچی ہو گئی، پھر نتھنے پھولنے لگے، ہونٹوں پر جھاگ آنا شروع ہوا۔ گردن کی رگوں کا اُبھار بڑھ گیا۔ آخری حد نہ جانے کیا ہو!

مولانا مودودی اختلافی امور پر گفتگو کرتے ہوئے ان دونوں طریقوں سے دُور ہٹ کر ایک تیسرا راستہ اختیار کرتے ہیں، ان کا ہتھکنڈا افہام و تفہیم کا ہتھکنڈا ہے۔ یعنی مقصدِ کلام دوسرے کی بات کو سمجھ لینا اور اپنی بات سمجھا دینا ہوتا ہے! بارہا ایسا ہوا کہ مخاطب مولانا کا سارا استدلال سن کر اپنے موقف سے نہیں ٹلا۔ اسی پر قائم رہا، یا مولانا کے مقابلے میں کسی دوسرے عالم یا لیڈر کی رائے کو ترجیح دیتا رہا تو ایسے موقعوں پر مودودی صاحب ہمیشہ ٹھنڈے

انداز سے یہ کہا کرتے ہیں کہ "آپ چاہیں تو وہ رائے رکھ سکتے ہیں"۔
اس فقرے نے بار ہا مناظرہ پسند لوگوں کی اسکیموں کو درہم برہم کر دیا ہے۔
مولینا مودودی کو مناظرانہ انداز کی گفتگو سے شدید درجے کی نفرت ہے۔ وہ
ایسی گفتگو کو اوّل تو اپنے خاص حکیمانہ اسلوب سے افہام و تفہیم کے میتھڈ
پر لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیاب رہتے ہیں، لیکن اگر کسی طرح
سے کامیابی نہ ہو تو پھر "فَالُوا سَلَامًا" قرآنی ہدایت کے مطابق بڑے
حسن فرار کا مظاہر کرتے ہیں۔

معقول استدلال کو جب کوئی شخص محض حمق اور نامعقولیت یا ضدم ضدا
کی وجہ سے رد کر رہا ہو، اور اندازہ ہو جائے کہ بار بار ایک ہی دلیل دہرانے
سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا، تو ایسی صورت میں مودودی صاحب بالعموم
صاف صاف اعترافِ شکست کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ میرے پاس
جو دلائل تھے وہ میں نے بیان کر دیے۔ اگر آپ ان سے مطمئن نہ ہوں تو
اپنی رائے پر قائم رہیے، اور کوئی دلیل میرے پاس نہیں ہے —— کم لوگ
اس طرح اعترافِ شکست کر سکتے ہیں۔

ہر لیڈر اور ہر عالم اور بڑے آدمی کو خبطیوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔
خبطیوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے خیالات اور جذبات میں توازن نہیں
ہوتا اور جن کو اپنے ذہن سے خود آگاہی نہیں ہوتی۔ نہ اُن کو اپنے عالمِ افکار
پر کوئی قابو حاصل ہوتا ہے۔

اس طرح کے غیر منظم ذہن کے لوگ طرح طرح کے مسائل، قسم قسم
کی کہانیاں، رنگ رنگ کی بجھارتیں لے کر مولینا مودودی کو بھی شرفِ ملاقات
سے سرفراز فرماتے رہتے ہیں۔ نوعِ انسانی کی اس صنف سے اگر آپ بحث
کرنے لگیں یا ان کے خیالات کو منظم کرنے کی کوشش کے درپے ہو جائیں
یا ان کو آپ ان کے عدمِ توازن سے آگاہ کرنے کی کاوش میں لگ جائیں

تو پھر ان کی طبع اور زیادہ رواں ہوتی ہے۔ پھر ان سے گھنٹوں اور مہینوں گفتگو کرتے رہیے، بلکہ برسوں دماغ لڑاتے رہیے، یہ اسی حالت پر رہیں گے جس پر تھے۔ مودودی صاحب ایسے آدمی کو دو چار باتوں سے جب پہچان جاتے ہیں تو بڑے بھاری ایثار سے کام لیتے ہیں، یعنی اسے کھلا موقع دیتے ہیں کہ وہ بولتا چلا جائے اور خود چُپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ کوئی اختلاف نہیں کرتے، کسی چیز کی تردید نہیں کرتے، کسی بات پر لُقمہ نہیں دیتے، بلکہ سراسر "تختۂ مشق" بن کر رہ جاتے ہیں۔ بچارا خبطی کتنا ہی بڑا خبطی کیوں نہ ہو، مقابل سے کسی ردِ سخن کے بغیر گھنٹہ دو گھنٹہ مسلسل بولنے کے بعد آخر ہمّت ہار دیتا ہے! چنانچہ ان تجربات سے مولٰینا مودودی کو ہم نے خود گزرتے دیکھا ہے اور جبھی یہ اندازہ کر لیا تھا کہ جو شخص اس شہادت گاہِ نفس سے یوں گزر سکتا ہے اسے جیل اور پھانسی لغزش نہیں دلا سکتے۔

ہم جو اتنی مدّت سے مولٰینا مودودی کے ساتھ رہے دو باتوں کی شہادت ہم بڑے وثوق سے دے سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مودودی صاحب کو ہم نے ایک لمحے کے لیے بھی مغلوب الغضب نہیں دیکھا اور نہ آپ کو کبھی غضب آلود الفاظ میں بات کرتے سُنا ہے۔ حد یہ کہ جن گوناگوں مخالفتوں اور الزامات اور گالیوں اور دوسری زیادتیوں کا مولٰینا کو لمحہ لمحہ سامنا کرنا پڑتا تھا، ان کے ردعمل کے طور پر بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولٰینا کی زبان کا معیارِ پاکیزگی و سنجیدگی اپنی مقررہ حد سے نیچے گرا ہو۔ بے شمار گھٹیا الفاظ ہیں جن کو ادیب اور صحافی گفتگوؤں ہی میں نہیں، اخباری کالموں میں ہر روز استعمال کرتے ہیں، لیکن مولٰینا مودودی کے چمنستانِ تکلّم میں ان کانٹوں کی کوئی جگہ نہ ہوئی۔ اَن گنت اسالیب ہیں جو ادنیٰ قسم کی جذباتیت نے اپنے اظہار کے لیے وضع کر لیے ہیں اور ہمارے معززین اور شرفا دن رات ان کو استعمال میں لاتے ہیں، لیکن مولٰینا مودودی کے جہانِ ذوق میں ان کی سمائی قطعاً نہیں! مولٰینا

کے حسنِ ذوق کا شعور رکھنے والے کسی آدمی کے سامنے آپ کوئی لفظ بول کے دریافت کریں تو وہ آپ کو بتا سکے گا کہ مولینا یہ لفظ بول سکتے ہیں یا نہیں!

ایک شخص جس کی مادری زبان دلّی کے شریف گھرانوں کی خاص بولی ہو، پھر اس بولی کو حیدرآباد کی علمی فضا نے سیراب کیا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اسلام کے آداب و اخلاق نے ایک خاص مزاج دیا ہو، اس سے آپ کو کس اندازِ گفتگو کی توقع کرنی چاہیے ——— حلقۂ یاراں ہو یا مجلسِ بیگانگاں، سوشل زندگی کے وسیع تر دائرے ہوں یا گھر کی چار دیواری کے اندر کا حلقہ، بیوی بچوں سے ربط ہو یا نوکروں اور ملازموں سے، مولینا مودودی کی گفتگو نفاست، سنجیدگی اور پاکیزگی کے معیّن معیار سے کبھی بھولے سے بھی نیچے نہیں گرتی!

مولینا کے اندازِ گفتگو کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ بڑے جماؤ کے ساتھ . . . ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں۔ بقول ملک غلام علی صاحب (مولینا کے خاص معاونِ کار) اگر کوئی شخص چاہے تو پوری گفتگو معمولی رسم الخط میں قلمبند کر سکتا ہے۔ یہ اندازِ گفتگو وہی شخص لے کر چل سکتا ہے جو غصّے، تندی، جلد بازی اور ذہنی اضطرابات سے مغلوب نہ ہو۔ مولینا مودودی جیسی شخصیت کا ایک مستقل ابتلائیہ ہوتا ہے کہ طرح طرح کے لوگ آآ کر ذریعۂ امتحان بنتے ہیں۔ خبطی، ذہنی اُلجھنوں کے مریض، خود پسند، تیز زبان، مناظرہ باز، بخشیلے، حمقاء، غرضیکہ قسم قسم کی مخلوق . . . مولینا کو تختۂ مشق بناتی ہے۔ ایسے لوگ بات کر کے مخاطب کا ذہنی سکون درہم برہم کر دیتے ہیں اور ان کے مقابلے میں انضباط کو قائم رکھنا معمولی آدمیوں کے بس میں نہیں ہوتا، لیکن مولینا مودودی ایسے لوگوں کی گفتگوؤں کے ریلوں کے درمیان سنجیدگی و وقار کی چٹان بنے اپنے مزاج کو قائم رکھتے ہیں۔ غالباً اس سلسلے کے چند خاص کرشمے "امتحانات" میں سے ایک وہ تھا

جب ایک قادیانی پارٹی مولینا پر تبلیغ کرنے "دارالاسلام" پہنچی تھی اس "امتحانِ صبر و وقار" کے موقع پر میں بھی شریکِ مجلس تھا، مگر چونکہ یہ روداد پہلے سے ملک غلام علی صاحب بیان کر چکے ہیں اس لیے اُنھی سے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک مجلس میں مولینا اور ہمارے سامنے ان لوگوں نے اپنے فنِ مناظرہ اور علمِ کلام کے خوب خوب کرتب دکھائے۔ کئی گھنٹے تک اُلٹے سیدھے سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہمیں کوفت بھی ہوتی تھی اور غصّہ بھی آتا تھا۔ کبھی ہمارا جی یہ چاہتا تھا کہ ان سے رُخصت اور معافی طلب کی جائے اور کبھی ہم اس پر آمادہ ہوتے تھے کہ اُنھیں ترکی بہ ترکی جواب دیے جائیں، مگر مولینا تحمل سے ان کی باتیں سُنتے رہے، نرمی سے جواب بھی دیتے رہے اور حق کو ان پر واضح کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ آخر جب مولینا نے دیکھا کہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے تو قادیانی حضرات سے دھیمے لہجے میں کہنے لگے کہ "میں نے اپنے ساتھیوں کو بڑی محنت سے کافی مدت تک ضبط اور برداشت کی مشق کرائی ہے، خطرہ ہے کہ آپ لوگ میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر کر نہ جائیں"۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ بات کام کر گئی یا "مبلغین" اتمامِ حجت کرتے کرتے تھک گئے۔ بہرحال اس کے بعد وہ تشریف لے گئے۔"

(مودودی۔ اپنی اور دوسروں کی نظر میں)

جو لوگ مولینا کو دُور ہی سے دیکھتے ہیں اور بے تکلفی کے دروازے کے باہر ہی باہر جھانکتے ہیں، ان کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ مولینا گفتگو اور ملاقات میں "بے پناہ" قسم کی گرمجوشی نہیں دکھاتے۔ کوئی نیا آدمی

ملنے آئے گا تو خوبصورتی سے سلام کا جواب دیں گے۔ ہاتھ کی تھوڑی سی مہذبانہ جنبش اور بالائی حصہ جسم کے بالکل خفیف سے جھکاؤ کے ساتھ ہلکا سا مصافحہ کریں گے، نووارد عام مجلس میں آکر بیٹھنے تو تھوڑی دیر کے لیے سکوت اختیار کرلیں گے تاکہ اگر وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہو تو اُسے موقع ملے۔ ورنہ جو سلسلہ چل رہا تھا، وہی از سرِ نو شروع ہو جائے گا۔ ملاقاتی علیحدگی میں خاص طور سے ملے تو دریافتِ مدّعا کے لیے سادہ انداز میں کہیں گے: فرمائیے! یا پھر یہ سوال کریں گے کہ "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" مولینا نے بطورِ خود کبھی معانقہ نہیں کیا، البتہ ہمارے پٹھان رفقاء اس معاملہ میں کبھی کبھی پیش دستی کر لیتے ہیں۔ ہاں یاد آیا ـــــ جیل کے زمانے میں تنہائی اور رفقاء سے علیحدگی کے ردِعمل کی وجہ سے مولینا معانقے کرنے لگے تھے۔ بعض لوگ مولینا کے طرزِ عمل کے اس ظاہری پہلو کو سرد مہری سمجھتے ہیں اور مایوس ہوتے ہیں۔ خصوصیت سے پاکستان کے اندر پٹھان اور پاکستان کے باہر اہلِ عرب اس کو شدت سے محسوس کرتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ مولینا کے مزاج کا ایک مجبورانہ جماؤ تھا جو علمی کاموں میں انہماک کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس مزاج کی سطح کے نیچے ایک حددرجہ ملنسار آدمی پایا جاتا ہے، چنانچہ دارالاسلام سے لے کر اب تک مولینا کا یہ حال ہے کہ وہ رفقاء اور ملاقاتیوں سے ملے بغیر اور عصرانہ مجلس میں کچھ وقت بیٹھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ چاہے کیسے ہی سخت ضروری کام اور اہم معاملات درپیش ہوں۔ وہ "آدم گریز اور خانہ نشین اور اپنے کام سے کام رکھنے والے" آدمی ہرگز نہیں ہیں ملنے والوں سے وہ ملتے ہیں اور بات کرنے والوں سے وہ خوب باتیں کرتے ہیں، اگرچہ خواہ مخواہ کی زبان چلانے اور گپ لگانے کی صلاحیت ان میں نہیں ہے۔ پروفیسر سرور آفاقی کے فلسفے کی رُو سے ایسا آدمی "عوامی" نہیں ہو سکتا۔

طبائع اپنے جوہرِ سیرت کے لحاظ سے اپنا ایک مستقل رنگ رکھتی ہیں۔
کسی میں حزن و یاس، کسی میں اضطراب، کسی میں غضب و تنفر، کسی میں شوخی و شرارت، اور کسی میں مسخرہ پن کا بنیادی رنگ ہم نمایاں دیکھتے ہیں۔ مولانا مودودی کا رنگِ طبیعت وقار کے ساتھ شگفتگی کے امتزاج سے بنتا ہے۔
سنجیدہ شخصیتیں جو علمی، تحقیقی اور فکری کاوشوں میں منہمک رہتی ہیں، بالعموم شگفتگی کا جوہر کھو بیٹھتی ہیں اور نری سنجیدگی آخر کار خشونت بن کر رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف شگفتگی کا جوہر جن اشخاص میں اپنی حدود پھاند جاتا ہے، وہ وقار کا رنگ کھو بیٹھتی ہیں۔ مودودی کی شخصیت دونوں جوہر صحیح تناسب کے ساتھ اپنے اندر لیے ہوئے ہے، اس لیے حسنِ اعتدال ضائع نہیں ہوتا۔

مولانا مودودی پر مختلف ادوار گزرے اور گوناگوں احوال سے سابقہ پڑتا رہا، لیکن تفریح اور بے تکلفی کے خاص الخاص لمحات میں بھی دامنِ وقار ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ اسی طرح جب میں پچھلی تاریخ کو دیکھتا ہوں تو بے شمار واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جو ایک پیکرِ خاکی کے لیے پوری طرح غارت گرِ سکون ہونے چاہئیں تھے اور ان کا اثر لازماً مودودی کے دل و دماغ پر رہا ہوگا —— بلکہ کبھی کبھی تو ہم قریبی ساتھیوں کو ان پر رحم بھی آتا —— لیکن نمازوں میں، دفتر میں، اجتماعی کھانوں میں، مجالس گفتگو میں اور سیر کے اوقات میں جب بھی سامنا ہوا تو ہمیشہ ایک ایسا چہرہ سامنے آیا جس پر گویا ایک غیر مرئی تبسم کی افشاں چھڑکی ہو۔ مضمون نگارانہ اور مصنفانہ کاوش کے لمحات ہوں، جماعتی و تحریکی مسائل کی پیچیدگیوں کا دور ہو، مخالفین کی شرارتوں اور اپنوں کی نادانیوں سے سابقہ ہو، کسی بھی حال میں اس چہرے کی شگفتگی کا رنگ نہیں مرجھایا۔ یہ شگفتگی گفتگو میں ہلکے ہلکے مزاح کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔
بے جا نہ ہوگا کہ اس موقع پر چند مثالیں بیان کروں جن سے مولانا کے مخصوص اسلوبِ مزاح کا اندازہ ہو سکے گا۔

ایک مذہبی طرز کے بزرگ اپنے اخبار میں کئی برس سے مولینا مودودی پر خدا واسطے کی عنایات فرماتے رہتے تھے۔ ایک صاحب نے کسی مجلس میں مودودی صاحب سے کہا کہ ایک مرتبہ آپ ان کے بارے میں بھی کچھ لکھتے تو مناسب ہوتا۔ "میں ان سے بالکل مایوس ہوں" مودودی صاحب دھیمے انداز میں کہنے لگے۔ "میں نے ان کی شخصیت کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا ہے اس میں جزم کہیں نہیں ہے، بس زیر وزبر ہی زیر وزبر ہے"

مرکز کی گاڑی کی چھت پر سامان رکھنے کے لیے ایک مربع شکل کا جنگلہ لگوایا گیا تھا، یاد نہیں کب کی بات ہے، ہم مولینا کے ساتھ گاڑی کے انتظار میں لاہور کی کسی سڑک پر کھڑے تھے، دُور سے اسی رنگ اور ماڈل کی کوئی گاڑی آتی دکھائی دی۔ کسی نے کہا کہ لیجیے گاڑی آ گئی۔ مولینا نے ایک نگاہ ڈالی اور کہا "نہیں —— اس کے سر پر وہ ملکہ وکٹوریہ کا سا تاج نہیں ہے"

قیوم خانی دور میں پشاور جانے کے لیے مولینا مودودی گاڑی کے انتظار میں ہم کو ساتھ لیے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے اور جماعتی اور سیاسی امور پر بڑی اہم گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب میری توجہ کی زد میں آ گئے جو ہمارے پیچھے پیچھے چلتے اور پھر جب ہم ایک سرے پر پہنچ کر مڑتے تو وہ پھر پیچھے ہو لیتے۔ گفتگو میں احتیاط کی ضرورت واضح تھی، مگر مولینا ساتھ لگے ہوئے "سائے" سے بے خبر تھے۔ میں نے توجہ دلانے کی مختلف تدبیریں سوچیں مگر بالآخر "ڈائرکٹ میتھڈ" ہی اختیار کرنا پڑا۔ انگریزی میں کہا ("There is a fifth person behind us") واضح رہے کہ ہمارا گروپ چار افراد پر مشتمل تھا، مولینا نے برجستہ کہا "نہیں۔ کہنا چاہیے۔

( A fifth Colummist )"

ماہر القادری صاحب نے اپنے مضمون میں ایسا ہی ایک مزاح آمیز نکتۂ لطیف درج کیا ہے جس زمانے میں علماء کرام دستوری رپورٹ پر مشورت

کر رہے تھے، ایک صاحب نے پوچھا "مولینا علماء کی مجلسِ مشاورت کا کیا رنگ ہے؟" فرمایا! "صبغتہ اللہ!"[1]

۱۹۴۸ء میں پہلی گرفتاری سے کچھ ہی قبل مولینا نے فیصل آباد اور جھنگ کا سفر کیا تھا۔ بہت سے لوگ ساتھ تھے۔ میں بھی تھا۔ ایک مقام پر کار کسی ضرورت سے رک گئی۔ چودھری محمد اکبر صاحب فطرت کے بلاوے پر لبیک کہہ کر لوٹے تو مولینا نے پوچھا: کیا پانی کہیں سے مل گیا ہے؟" چودھری صاحب نے کہا: نہیں دوسری طرح کام چلانا پڑا۔" مولانا نے فوراً کہا: "اچھا تو یوں کیسے کہ ڈرائی کلیننگ کی ہے"

مرکز کی گلی فیروز پور روڈ سے جہاں ملتی ہے، پہلے وہاں نشیب تھا۔ بعد میں مٹی ڈلوا کر راستہ اونچا کیا گیا جس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ ایک دفعہ کہیں سے گاڑی پر آرہے تھے تو ڈرائیور نے جب گاڑی کو گھمایا، مولینا نے کہا:
"دیکھنا بھئی! احتیاط سے! کہیں فَاُمُّہٗ ھَاوِیَہ ہی نہ ہو جائے"[2]

(ماخوذ از "مودودی۔ اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

ایک لطیفہ ـــــ جو ہے تو پرائیویٹ قسم کا، لیکن شاہکار درجے کا ہے، اسے راز نہیں رکھا جا سکتا۔ ایک موقع پر مولانا کی طرف سے چائے دی گئی۔ بسکٹ اور پیسٹری ساتھ تھی۔ مولانا نے باقر خاں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "افسوس ہے کہ ہم باقر خانی کا انتظام نہ کر سکے!" ـــــ خوب قہقہہ ہوا (حوالہ ایضاً) بعد میں معلوم ہوا کہ اس لطیفہ کی موجد اوّل بیگم ملک عزیز مرحومہ تھیں۔ ایک بار انھوں نے باقر خاں صاحب سے پچھوایا تھا کہ آپ کی باقر خانی کا کیا حال ہے؟

---

[1] مسلم سوسائٹی کے مزاج کے بارے میں آیتِ قرآنی ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ! ترجمہ "یہ اللہ کا رنگ ہے! ـــــ اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے؟"

[2] آیت ہے: وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ

زمانۂ جیل کے لطائف میں سے ایک اور شاہکار عرض ہے جو حسنِ تمثیل و تشبیہ کا بھی نادر نمونہ ہے۔ مولینا اختر علی خاں اپنی رہائی کے لیے ہر ہر لمحہ بے چینی سے منتظر تھے اور کبھی کبھی مولینا سے ملتے تو اپنا درد دل بیان کرتے اور ان کی گفتگو سے کچھ سرمایۂ تسکین حاصل کرتے۔ صورتِ واقعہ یہ تھی کہ اب مولینا مودودی کی اسارت کا تسلسل مولانا اختر علی خاں اور بعض دوسرے اصحاب کی رہائی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اسی حقیقت کو مودودی صاحب نے ایک لطیفہ میں سمو کر کہا ”بات یہ ہے کہ گلی میں ایک ٹرک پھنس گیا ہے اور اس کے پیچھے کاریں، بیل گاڑیاں، تانگے سبھی رکتے جا رہے ہیں اور پورا ٹریفک جام ہو گیا ہے۔ ٹرک نکلے تو ٹریفک رواں ہو۔“

لطائفِ تمثیل و تشبیہ کے سلسلے میں دو تین چیزیں قابلِ ذکر ہیں:

اضطراباتِ پنجاب ۵۳ء کی تحقیقاتی عدالت میں تحریری بیان میں مولینا نے اپنی پوزیشن کو حکومت کی زیادتی کے بالمقابل واضح کرنے کے لیے امرِ واقعہ کو یوں بیان کیا کہ ”اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص سڑک سے ہٹ کر کھیتوں میں جا کھڑا ہو اور دوسرا شخص وہاں موٹر لے جا کر اس کو ٹکرا دے۔“ ایک فقرے میں پوری تصویر آجاتی ہے۔

مولینا کو پتھری کی تکلیف ہے، کسی نے آپریشن کرانے کا مشورہ دیا تو کہنے لگے ”ایک بار آپریشن کرا چکا ہوں مگر کیا کروں کہ میرے جسم میں پتھر بنانے کی مستقل فیکٹری کام کر رہی ہے۔“

اضطراباتِ پنجاب ہی کے سلسلے میں ۲۷ فروری ۵۳ء کو جو اخباری بیان دیا تھا، اس میں ایک جملہ تھا کہ کیا اس حکومت میں اب ایک آدمی بھی ایسا نہیں رہا جو ایک تھانیدار کی سطح سے زیادہ بلند سطح پر سوچ سکے؟ ——

چار لفظوں میں شہری حقوق کی پامالی، جمہوری اصولوں سے بے نیازی، دھونس اور قوت کے بے جا استعمال اور سیاسی سوجھ بوجھ اور حاکمانہ صبر و تحمل

سے بالاتر ہو کر اندھا دھند اقدامات کرتے چلے جانے کی پوری تاریخ بیان ہو گئی جو پاکستان بننے کے بعد سے نشوونما پا رہی تھی۔ ایک لفظ "تھا بیدار" کے لطیف تمثیلی استعمال کو دیکھیے!

"جماعت کی تاریخ اور لائحہ عمل" میں ایک مقام پر یہ واضح کرتے ہوئے کہ ہماری اصل کشمکش اشتراکیت، مغربی الحاد اور فسق و اباحت کے خلاف ہے، جماعت کے خلاف مہم چلانے والے مولوی حضرات کے بارے میں لکھا ہے کہ علمائے کرام خواہ مخواہ بیچ میں آ کھڑے ہوئے ہیں، یا کوریا بنا کر لا کھڑے کیے گئے ہیں۔"

ایک خاص عنصر کے اندر مولینا مودودی دستوری مہم کے سلسلے میں کام کرنے کا نقشہ مجلس شوریٰ کے مشورے سے تیار کر رہے تھے۔ رفقاء نے خطرناک پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا، مسکرا کر فرمایا! "سانپوں سے کھیلنے جا رہا ہوں! —— ہاتھ ٹھیک پڑ گیا تو کامیابی! نہ پڑا تو ڈسے جانے کا خطرہ واضح ہے۔"

ماہر القادری صاحب کا بیان کردہ ایک لطیفہ اور ہے، جی چاہتا ہے کہ اسے بھی لے لیا جائے "مولینا نے اپنے صاحبزادے (غالباً فاروق نام ہے[1]) کو کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن ہم تینوں موٹر میں جا رہے تھے، مولینا کے صاحبزادے ان سے مشینوں اور کل پرزوں کا بار بار ذکر نکالتے تھے۔ میں نے کہا کہ ان کو اس فن سے بہت دلچسپی ہے۔ مسکرا کر بولے: باپ مولوی، بیٹا لوہار!"

("مودودی —— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

سود حصہ دوم میں اشتراکیت پر ناقدانہ بحث کرتے ہوئے اس کی

---

[1] مولینا کے صاحبزادوں کے ناموں میں "فاروق" تو بطور ردیف آتا ہے، یعنی احمد فاروق، خالد فاروق، عمر فاروق وعلم جرا۔

آہنی ڈکٹیٹرشپ کے بارے میں دو تین صفحے کا ایک نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں مذکور ہے کہ جب کوئی کارکن اپنے گھر پر نہیں پہنچتا تو اس کی بیوی خود ہی سمجھ جاتی ہے کہ پکڑا گیا۔۔۔ ایک روز یکایک ایسا ہوتا ہے کہ اس کا بھیجا ہوا پارسل واپس آجاتا ہے۔ بس یہی اس امر کی اطلاع ہے کہ اس کا خاوند لینن کو پیارا ہوا۔۔۔۔ اس کا فرض ہے کہ اچھی کامریڈنی کی طرح اس معاملہ کی بھاپ تک منہ سے نہ نکالے (ص ۴۶ نے)۔۔۔ "لینن کو پیارا ہوا" اور "کامریڈنی" کی لطافت اس موقع پر ہر صاحبِ ذوق کو محسوس ہوگی۔

ہاں، وہ بھی تو ایک دلچسپ چیز تھی "دارالاسلام" کے دور میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن کا فرنیچر لاہور سے بذریعہ ریل گیا تھا۔ سرنا اسٹیشن سے اُسے دو فرلانگ دُور لے جانا تھا۔ بالمعاوضہ حمالی کا کوئی قابلِ حصول انتظام تھا نہیں، اس لیے ہم سب مدیر ترجمان القرآن سمیت اس مہم کو نکلے۔ کرسیاں، میزیں اور دوسری چھوٹی چیزیں تو ایک ایک دو دو آدمیوں کے ذریعے جا سکتی تھیں، البتہ ایک بڑی الماری کا بوجھ "اجتماعی مہم" چاہتا تھا سو اسے کئی آدمی باری باری کندھا دیتے ہوئے لے چلے جن میں خود مولینا مودودی بھی شامل تھے۔ وہ کبھی ادھر سے سنبھالتے، کبھی ادھر سے سہارا دیتے۔ اس موقع پر خوب کہا کہ "عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"۔

بے شمار یاد رہ جانے والے اور بھول جانے والے لطائف و نکات میں سے یہ چند چیزیں ہی اس وقت عرض کی جا سکیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا

---

نے پہلے یہ باتیں سرمایہ داروں کا مخالفانہ پروپیگنڈا قرار دے کر مسترد کر دی جاتی تھیں، لیکن اب خروشچیف اور بلگانن کے بیانات نے ان کی صداقت ثابت کر دی ہے۔

ہے کہ مودودی کی شخصیت کے عناصرِ ترکیبی میں شگفتگی کا کیا مقام ہے اور اس کی اصل تصویر ان ڈراؤنی تصویروں کے مقابلے میں کیسی ہے جن کو دُور ہی دُور بیٹھ کر بعض مصوروں نے مرتب کیا ہے۔ ان ڈراؤنی تصویروں کے ذریعے جن لوگوں نے مودودی کو دیکھا ہے ان کی نظر میں ایک ایسا کٹھ مُلا اور مجسمۂ خشونت بسا ہُوا ہے کہ بسا اوقات وہ اس کی وجہ سے ڈرپوک بچوں کی طرح راتوں کو چونک چونک اُٹھتے ہیں۔

ایک صاحبِ دعوت کی، کم سے کم اس دور میں یہ بہت بڑی کمزوری ہوگی کہ وہ قلم سے جہاد نہ کر سکتا ہو اور کاغذ کے میدان میں تگ و تاز نہ دکھا سکے۔ وہ لیڈری جو محض زبان کے چٹخارے پر چل جاتی تھی اس کا دور کبھی کا گزر چکا۔ ایسے بہت سے اہلِ زبان آج دانتوں میں زبان دابے دور دراز گوشوں میں پڑے ہیں۔ یہ لوگ کاغذ کے میدان میں ہر گئے۔ کیونکہ رہوارِ قلم جس ٹھوس فکر کی غذا کے بل پر ترکتازیاں دکھا سکتا تھا وہ فراہم نہ تھی۔ تقریر کی لیڈری آسان ہے، تحریر کی لیڈری مشکل ہے۔ مولینا مودودی جس دعوت کو لے کر اُٹھے ہیں وہ زبان و قلم دونوں کو استعمال کیے بغیر اپنا راستہ نہیں نکال سکتی۔ خدا کی عطا ہے کہ مودودی کو اس نے قلم کی طاقت سے بہرۂ وافر عنایت کیا۔

قلم سے آدمی جو کچھ لکھتا ہے، اس کے معانی و مطالب سے قطع نظر، محض لکھنے کا ظاہری سٹائل اور اس کا رسم الخط بول کر کہہ دیتا ہے کہ لکھنے والا کیا ہے کیا نہیں ہے۔ آدمی کی ہر تحریر میں، خواہ وہ ایک سطر بھر کی کیوں نہ ہو اس کا اپنا ہاتھ اور اس کا اپنا قلم اس کی شخصیت کے احوالِ پنہاں کاغذ پر نقش کرتا چلا جاتا ہے۔ ہماری تحریریں گویا ہماری خود نوشت سوانح عمریاں ہیں —— معنویت کے اعتبار سے بھی اور ظاہری انداز کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ نفسیاتی مطالعہ و تجزیہ کا فن اب یہاں تک ترقی کر چکا ہے کہ ماہرین ایک آدمی کے اپنے لکھے ہوئے نام، پتے یا دو چار سطروں کے

مشاہدہ سے اس کے احوال واطوار کے تمام ضروری پہلو سامنے لا سکتے ہیں اور اچھے اندازے بالعموم اسی پچاسی فیصد صحیح نکلتے ہیں۔

اسی نقطۂ نظر سے مولینا مودودی کی تحریر کا ایک ہلکا سا جائزہ لینا مدّنظر ہے۔ یعنی ہم ان کی تحریر کی ادبیت اور اس کی فصاحت و بلاغت پر نہیں، بلکہ اس کے ظواہر پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

مودودی صاحب کے لکھنے کا ہمیشہ ایک خاص ماحول ہوتا ہے۔ ان کے لکھنے کا کمرہ ـــ جو دفتر بھی کہلاتا ہے ـــ دوہری دیواروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اینٹ گارے کی دیواروں کی اندرونی جانب ایک چار دیواری الماریوں کی ہوتی ہے جن میں دینی اور مغربی علوم کی کتابیں مولینا مودودی کی جائے نشست کے چاروں طرف صف بستہ حاضر رہتی ہیں۔ ایک طرف اگر مبسوط کی جلدوں کی قطار ہے تو دوسری طرف ۔۔۔۔۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی رجمنٹ کھڑی ہے۔ اس ہاتھ بخاری اور اس کی شروح ہیں تو اس ہاتھ دستوریات اور قانونیات پر اچھی اچھی انگریزی کتابیں ہیں۔ ادھر اگر اسلامی تاریخ پر بیش بہا قدیم عربی لٹریچر آراستہ ہے تو اُدھر یورپ کی سیاسی، مذہبی اور فکری تاریخ سے متعلق انگریزی زبان میں جدید لٹریچر آراستہ ہے۔ اِک الماری میں قرآن کی بھاری بھاری بھرکم تفاسیر ہیں تو اُس الماری میں بائبل سے متعلق سیروں وزنی مجلدات موجود ہیں۔ کہیں فقۂ اسلامی کی مستند کتابیں سجی ہیں تو کسی دوسری جگہ انگریزی دور کے محمڈن لا پر چیدہ چیدہ تصانیف موجود ہیں ـــ وہاں ابن خلدون جلوہ فرما ہیں تو یہاں افلاطون۔ وہ ابنِ تیمیہ ہیں تو یہ کارل مارکس۔

لکڑی کے فریم میں مرتب کی ہوئی کتابوں کی اینٹوں سے جو چار دیواری بنتی ہے اس کے درمیان ایک جہازی میز پھیلی ہوئی ہے۔ اس جہازی میز پر بائیں جانب کاغذات رکھنے کا ایک چھوٹا سا خانہ دار ریک پڑا ہے۔ ریک کے ساتھ چند کتابیں، مسودے، پروف، خطوط وغیرہ رکھے ہیں۔ سامنے ایک لمبا چوڑا گتہ پھیلا ہے اور اس پر لکڑی کا زیرِ مشق نشست کے بالکل سامنے

وسط میں رکھا ہے۔ اس "تختۂ نوشت" کے ساتھ لگے ہوئے کلپ نے کاغذ کے نہ بہ تہ تختے اپنے بھینچے ہوئے ہونٹوں میں پکڑ رکھے ہیں۔ اس سے آگے نکل پالش کیا ہوا قلمدان اور پیپر ویٹ، ایک کاغذ جاذب لگانے کا پیڈ، ایک پن گیر، ایک خاکستردان، ایک گھنٹی ـــــ مکمل سیٹ ـــــ ترتیب سے رکھا ہوا ہے۔ دو تین شیشے کے پیپر ویٹ بھی کاغذات پر رکھے ہیں۔ ان چیزوں کو آپ ہمیشہ ترتیب سے رکھا پائیں گے اور ان میں سے ہر چیز کی ایک جگہ ہمیشہ متعین رہے گی۔ ملاقاتی اور رفقاء اگر آ کر اس ترتیب کو بدل دیتے ہیں تو ان کے جانے کے بعد مولٰینا کا ہاتھ سب سے پہلے ان کو ان کی اپنی صحیح جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔ کسی چیز کا بے ڈھنگے پن سے رکھا ہونا مولٰینا مودودی کے ذہن پر فوری اثر ڈالتا ہے۔ کمرے یا برآمدے میں کوئی کرسی ٹیڑھی رکھی ہو، نماز کے لیے بچھنے والی چٹائیاں غیر متوازی ہوں، میز پر کے کاغذات ترچھے رکھے ہوں وہ نگاہ پڑتے ہی اپنے ہاتھ سے پہلے ٹھیک کر لیں گے۔ دو ایک موقعوں پر کرسیاں یا چٹائیوں کے ترچھے ہونے پر مزاحاً فرمایا "اس سے بچھانے والے کے ذہن کا ٹیڑھا ہونا واضح ہوتا ہے۔"

میرا ذاتی خیال یہ ہے، کہ اگر مطالعۂ شخصیت کی صلاحیت رکھنے والا کوئی شخص مودودی صاحب کی عدم موجودگی میں ان کے کمرے میں داخل ہو اور اسے کمرے کا ماحول صرف پانچ منٹ دیکھنے کا موقع ملے تو وہ مودودی صاحب کی آدھی سیرت تو ضرور صحیح صحیح لکھ دے گا۔ اس پُر سکون مگر خیال انگیز ماحول میں ـــــ مودودی صاحب سوچتے اور لکھتے ہیں۔ وہ صبح ناشتے کے بعد اپنے وقتِ مقررہ پر آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں گے۔ پان کی ڈبیہ اور بٹوا ساتھ ہوگا۔ پان کھائیں گے اور دماغ میں فکر و کاوش کا پورا کارخانہ متحرک ہو جائے گا۔ بالعموم ان کا چہرہ بتا دیتا ہے کہ اس وقت وہ کس مضمون یا کس مسئلے پر کاوش میں ہیں۔ جب پورا نقشہ ذہن میں مرتب ہو چکے گا تو وہ قلم اٹھائیں گے، ورنہ

یونہی الل ٹپ انھوں نے کبھی کچھ نہیں لکھا ——— بلکہ پہلے سے سوچے بغیر کوئی بھی کام وہ نہیں کرتے۔ کیا عجب کہ وہ سونے اور کھانے کے لیے بھی پہلے سے سوچتے ہوں، پورا مواد اکٹھا کر لینے، حوالے جمع کر لینے اور سلسلۂ بحث کی کڑیاں دل ہی دل میں جوڑ لینے کے بعد وہ قلم کو حرکت میں لاتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ خط ہو یا مضمون یا کچھ اور ——— پہلے وہ اسے اپنے دماغ کے اوراق پر لکھتے ہیں اور پھر اُن اوراق کو دیکھ دیکھ کر کاغذ پر منتقل کرتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھنے میں بڑی روانی رہتی ہے اور زیادہ قطع و برید نہیں ہوتی۔

مولینا کا قلم بڑا کاغذ خور واقع ہوا ہے۔ ذوقِ نفاست کی وجہ سے وہ ہمیشہ اچھے چکنے اور دبیز کاغذ کو پسند کرتے رہے ہیں اور کثیر رقم یک وقت خرید وا لیتے رہے ہیں، مگر اب کاغذ کی ——— اور خصوصاً اچھے کاغذ کی نایابی کے سبب وہ بات نہیں رہی، تاہم پھر بھی عمدہ سے عمدہ کاغذ موجود رہتا ہے۔ وہ فل سکیپ سائز کے پورے تختے پر لکھنے کے عادی ہیں۔ کاغذ کی پٹیوں اور چیتیوں پر کبھی نہیں لکھتے۔

لکھنے سے پہلے وہ شکن ڈال کر داہنی طرف کھلا حاشیہ چھوڑتے ہیں ہمیرے سامنے اس وقت مولینا کے دو قلمی مسودے ہیں۔ ایک ۱۹۴۷ء کا (تقریر اجتماع شمالی ہند منعقدہ دارالاسلام ) دوسرا ماضی قریب کا (ترجمان القرآن کی ایک سابق اشاعت کے "اشارات") دونوں مسودوں کا حاشیہ اڑھائی انچ چوڑا ہے۔ ہمیشہ تقریباً اتنا ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ۱۹۴۷ء والے مسودے کے ہر صفحے پر پوری انتالیس انتالیس سطریں ہیں، اور بعد کے مسودے میں سینتالیس سینتالیس ——— یہ منظم سطر بندی سفید کاغذ پر بغیر زیر سطر کے، ذہن کی اقلیدسی مہارت اور اعصاب پر اس کے انضباط کی دلیل ہے۔ دونوں میں سے کسی مسودے کے اوراق کو ذرا فاصلے پر پھیلا

دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہی تحریر کی شینی نقلیں ہیں۔ قطع و برید بہت ہی کم ہے اور جو کچھ ہے بھی اس کا زائد از نصف حصہ ایسا ہے جو نظر ثانی کرتے ہوئے ضروری محسوس ہوا۔ پورے اوراق میں تمام کی تمام سطریں بالکل سیدھی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ بائیں جانب سے عبارت صفحہ کے آخر تک جا کر انچ کے دسویں حصے کی حد تک نیچے کو جھکاؤ رکھتی ہے۔ ہر پیراگراف واضح طور پر الگ سے شروع ہوتا ہے۔ حروف کی اشکال بالکل یکساں ہیں۔ نقطے، شوشے، علاماتِ اوقاف اور واوین اپنی اپنی جگہ پر لازماً موجود ہیں۔ بلکہ الفاظ ضروری حرکات بھی اپنے ساتھ لیے ہوئے ہیں۔ حلقہ دار حروف (مثلاً حد، لق، ظ وغیرہ) کے حلقے اندر سے لازماً خالی ہیں جیسے کہ ہونے چاہئیں۔ جہاں کسی لفظ کو کاٹا گیا ہے یا کوئی جزو بعد میں بڑھایا گیا ہے وہاں ضرور ہی علامتِ اضافہ (^) دی گئی ہے۔ گھنی سطروں کے باوجود بین السطور نمایاں ہیں۔

اس طرزِ تحریر کو دیکھتے ہی جو رائے قائم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لکھنے والا بہت ہی متوازن مزاج آدمی ہے اور پورا پورا احساسِ ذمہ داری رکھنے والا ہے۔ دوسروں کے حقوق و آرام کا لحاظ کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں ضبط و نظم اور باقاعدگی ہے۔ وہ جذباتی آدمی نہیں ہے بلکہ مزاج میں مفکرانہ ٹھہراؤ رکھتا ہے۔ وہ مستقل مزاج، صاحبِ عزیمت اور تلون سے خالی ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے اہم نتائج انسانی شخصیت و کردار کا ہر رازداں پیدا کر سکتا ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان نتائج کے حق میں پورا پورا استدلال کیا جا سکے، پیشِ نظر شخصیت خود ان پر گواہ ہے۔ مجھے صحافت کے دائرے میں کام کرنے کی وجہ سے قسم قسم کے رسم الخط دیکھنے کا موقع ملتا رہا ہے اور نئے لوگوں کی طرف سے جو خطوط اور نگارشات موصول ہوتی ہیں ان کے پس پردہ کام کرنے والی شخصیت کا اندازہ کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات

لفافے پر لکھا ہوا پتہ دیکھ کر ابتدائی تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ اُونچی اور صاف ستھری شخصیتوں کے رسم الخط کے چند اہم نمونے میری نگاہ میں ہیں۔ میری شہادت یہ ہے کہ مودودی صاحب کے طرزِ تحریر کے ہم پایہ کوئی دوسرا نمونہ میرے تجربے میں نہیں آیا۔

تحریر ہی کے سلسلے میں آدمی کے خطوط کا طرزِ انشاء بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مودودی صاحب کے لکھے ہوئے خطوط دیکھنے کا خاص موقع مجھے حاصل رہا ہے۔ ایک زمانہ میں ترجمان القرآن اور مرکزِ جماعت کی ڈاک کا کام مولینا کی نگرانی میں میرے ذمے رہا ہے۔ ان کی مستقل عادت یہ تھی کہ ڈاک خود دیکھتے تھے اور پوری توجہ سے دیکھتے تھے اور مختلف شعبوں کے ناظمین کی رہنمائی کے لیے نشانات لگا کر مختصراً ہدایات لکھ دیتے تھے۔ جن خطوط میں خود ان کو مخاطب کیا گیا ہوتا یا اسلام یا جماعت کے متعلق اصولی مسائل دریافت کیے گئے ہوں ان کے جواب وہ اپنے قلم سے لکھتے تھے یا اِملا کراتے تھے۔ ورنہ کم سے کم جوابی مضمون کا خلاصہ اور اس کی ترتیب زبانی بتا دیتے تھے۔

اپنے قلم سے لکھے ہوئے خطوط میں مولینا مودودی کی چند مستقل روایات نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں۔ وہی حاشیہ چھوڑنے اور پیرے بنانے اور علامات ڈالنے کی باقاعدگی اور سطروں کی سیدھائی اور تحریر کی صفائی خطوط میں اور بھی زیادہ اچھا معیار پیش کرتی ہے۔ ہر خط کی پیشانی پر تاریخ ضرور درج ہوتی ہے۔ بلا استثنٰی تمام خطوط کا سرنامہ "محترمی و مکرمی! (خواتین کے لیے محترمہ و مکرمہ) السلام علیکم و رحمۃ اللہ" کے الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تقریباً ہر جوابی خط کا آغاز "عنایت نامہ ملا" سے ہوتا ہے۔ خاتمہ ہمیشہ "خاکسار ابوالاعلیٰ" کے لفظوں پر ہوتا ہے جو خط کے نچلے بائیں کونے میں اُوپر تلے لکھے ہوتے ہیں۔ خط کا پتہ ہمیشہ "بخدمت شریف جناب" کے مقررہ الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور زیادہ تر تین سطروں میں مکمل ہوتا ہے۔ شہر یا مقام زیر خط کشیدہ ہوتا

ہے۔ خط کے اس نقشے میں شاید برسوں سے کبھی کوئی تغیر نہیں آیا۔ بے شمار خطوط کے حاتق مطالعہ کے بل پر میں یہ کہتا ہوں کہ کسی خط میں مصنوعی ادبیت اور غیر ضروری طور پر مزاح کا استعمال نہیں ہوتا اور نہ ضروری نفسِ مضمون پر غیر ضروری فقروں کا اضافہ کہیں محسوس ہوتا ہے۔ خطوط میں مضمون نگاری کے بجائے زیادہ تر گفتگو کا رنگ پایا جاتا ہے۔ عامیانہ گفتگو کا نہیں، عالمانہ گفتگو کا!

وہ لمبا عرصہ جس میں ڈاک میرے سپرد تھی، بالعموم بعدِ ظہر میں مولانا کے ہاں جاتا اور کبھی کبھی دفتر میں اور کبھی باہر آم کے بڑے پیڑ کے نیچے نشست رہتی۔ اہم علمی خطوط کے جوابات مولانا خود اِملا کراتے ــــــ کبھی آرام کرسی پر بیٹھے اور کبھی ٹہلتے ہوئے، کبھی کبھی تو مودودی صاحب مجھ سے خطوط پڑھوا کر پہلے سنتے بھی، لیکن اکثر محض یادداشت کی بنا پر بالکل اسی ترتیب سے جوابات لکھوا دیتے جس ترتیب سے خطوں میں سوالات درج ہوتے تھے ــــــ اور کمال یہ کہ سوالات آیات اور احادیث اور فقہ کے مباحث سے متعلق بھی ہوتے پھر وہ اِملا ایسی روانی سے کراتے کہ کسی موقع پر جملے کا تسلسل اور بحث کا ربط نہ ٹوٹتا۔ بیچ سے اگر اُٹھ کر جانا پڑتا یا کوئی صاحب آجاتے تو بعد میں اتنا پوچھتے کہ آخری فقرہ کہاں تک پہنچا۔ بعض اوقات کچھ خطوط میں اپنی میز پر ہی بھول آتا، لیکن مولانا اچانک کسی خاص خط کے بارے میں دریافت کرتے اور مجھے اُٹھ کر وہ لانا پڑتا۔ ہفتہ دو ہفتہ کی آئی ہوئی ڈاک کے ایک ایک خط کا ان کو متعین طور پہ خیال رہتا اور اس کا نفسِ مضمون مستحضر رہتا، لیکن سارے خطوط اِملا ہی نہیں کرائے جاتے تھے بلکہ بعض کے متعلق مولانا صرف اشارات دے دیتے اور ان کو لکھنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دیتے۔ اس احساس ذمہ داری کی وجہ سے میں بھی پوری کاوش اور محنت کرتا۔ یہ مولانا کا ایک مستقل طریق تربیت تھا۔

اکثر لوگ شرعی مسائل میں "استفتاء" بھیجا کرتے۔ ایسے ہر استفتاء کے جواب میں تمہیداً یا خاتمہ پر یہ ضرور لکھواتے کہ میں مفتی نہیں ہوں۔ فتویٰ نہیں دیا کرتا، صرف اپنی معلومات کے مطابق رائے عرض کرتا ہوں۔ فتویٰ مطلوب ہو تو کسی دارالافتاء کی طرف رجوع کیجیے۔ اور یہ رائے مسئلے کی ٹیکنیکل صورت بتانے کے بجائے اس کی اسپرٹ اور مقصدیت کو نمایاں کرتی۔ خاص بات میں نے یہ نوٹ کی کہ مولٰنا مودودی نے کبھی کسی سوال، اعتراض یا اختلاف کرنے والے کو نفرت اور تحقیر اور غیظ و غضب سے مخاطب نہیں کیا، بلکہ ایسی چیزوں کے آنے کو ہمیشہ کام کے حق میں مفید سمجھتے تھے، چاہے اُن کے الفاظ اور انداز سخت ہی کیوں نہ ہوں، البتہ مناظرانہ اور شرپسندانہ ذہن کا اُنھوں نے کبھی خیر مقدم نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو ہمیشہ نصیحت کرتے کہ مناظرہ بازیاں اور ٹیڑھے سوالات تلاشِ حق میں کبھی مدد نہیں دے سکتے۔

اختلافی معاملات میں بالعموم یہ لکھواتے کہ میرا مطالعہ یہ ہے، آپ کو یہ قرینِ حق معلوم ہو تو قبول کیجیے ورنہ جس کی رائے آپ کو صحیح معلوم ہو اسی کو اختیار کیجیے۔ فرقہ دارانہ جھگڑوں کے متعلق خطوط کو بھی وہ خوش آمدید نہیں کہتے تھے اور معلمانہ انداز سے لکھواتے کہ "ان جھگڑوں کے بجائے دین کی اصل حقیقت کو اپنانے کی ضرورت ہے، فقہی اور فروعی اختلافات کے لیے باہم دگر توسع کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے،" مجھے ایک موقع بھی ایسا یاد نہیں کہ پوری خط و کتابت میں مولٰنا نے کسی کی تکفیر کی ہو یا تفسیق! ——— بلکہ زجر و توبیخ کا مولویانہ انداز بھی کبھی اختیار نہیں کیا۔

چنانچہ مجھے ایک طرف اس خطوط نویسی کے زمانے میں مولٰنا کی سیرت کا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کا موقع مفت میں ملا۔ ساتھ ساتھ میری فکری تربیت ہوتی گئی اور نظامِ اسلامی سے متعلق علمی کاوش کے دروازے مجھ پر کھلنے لگے۔ شاید میرے اسلوبِ نگارش پر بھی

اس دَور کا اثر بہت زیادہ پڑا ہے۔

ہاں! — ہر بڑے آدمی کی طرح مولینا مودودی کو خطوط میں بڑے بڑے قصیدے بھی موصول ہوتے اور کبھی کبھار زہریلی گالیاں بھی لکھی ہوئی آئیں، مگر نہ کوئی قصیدہ مودودی صاحب کے مزاج پر اثر انداز ہو سکا اور نہ گالیوں کا ردِ عمل بجز ایک بے نیازانہ تبسم کے کچھ اور میرے سامنے آیا۔ اس ڈاک کے سوا جو علمی مسائل یا جماعتی معاملات سے متعلق ہوتی، بقیہ خطوط کو محفوظ رکھنے کا اہتمام مودودی صاحب نے کبھی نہیں کیا، ورنہ انبار جمع ہو جاتے۔ اہم محفوظ شدہ خط و کتابت اب "رسائل و مسائل" نامی مجموعے کی صورت میں مطبوعہ ہے۔

ان اشارات سے میں خود نتائج اخذ کرنے کے بجائے، یہ کام اس مقالے کے قارئین پر ہی چھوڑتا ہوں۔

ہر صاحبِ دعوت کو زبان کی طاقت کی ضرورت ہے۔ محض قلم کے بل پر علمی کام کیے جا سکتے ہیں مگر عوام کے قریب ہو کر ان کو سمیٹنے اور منظم کرنے اور کسی تحریک کو آگے لے چلنے کے لیے وہ آدمی موزوں نہیں ہو سکتا جو اسٹیج پر آکر گنگ ہو جائے۔ مولینا مودودی گنگ نہیں ہیں خطیب ہیں۔

میں نے ان کا اوّلین خطاب دارالاسلام کی مسجد میں جمعہ کے موقع پر سنا۔ اَن پڑھ دیہاتیوں کی کثیر تعداد کے اندر تھوڑے سے تعلیم یافتہ لوگ پٹھانکوٹ اور سجان پور کے قصبوں اور قلعہ جمال پور کی مختصر سی آبادی سے آکر شامل تھے۔ مولینا نے ان دنوں اُردو زبان میں خطبات جمعہ کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ (اور اب وہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔) اذانِ ثانیہ پر وقار سے اُٹھے، منبر کے (غالباً) پہلے زینے پر کھڑے ہوئے، آہستگی اور سادگی سے خطاب شروع کیا — ایسے جیسے لوگوں سے باتیں کر رہے ہوں۔ یہ مستقبل کا ایک بڑا مقرر تھا۔ سیدھے سادھے کلمات کا اثر اس خاموش فضا میں پوری طرح نمایاں

تھا۔ بعد میں مودودی صاحب نے متعدد مواقع پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجے کے علمی خطبے دیے۔ ارکانِ جماعت کے مختصر اجتماعات میں بار بار تقاریر کیں۔ سوالات کے جوابات دیے اور ہدایات دیں۔ آہستہ آہستہ ان کی خطابت آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد انھوں نے بہت سے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کی ہیں۔ اور آئے دن یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اب وہ اپنی نوعیت کے ممتاز مقرر ہیں۔

انھوں نے اپنی دعوت کی نوعیت کے لحاظ سے خطابت کے ایک نئے طرز کی نیو ڈالی ہے اور پرانے خلافتی مکتبِ خطابت سے الگ ہو کر ایک نیا مکتبِ خطابت استوار کیا ہے۔ مولینا خطابت کو ایک اہم ذمہ داری سمجھتے ہیں اور ضروری قرار دیتے ہیں کہ ایک ایک لفظ پہلے سے غور کرنے کے بعد زبان پر لایا جائے۔ کیونکہ ہزار ہا بندگانِ خدا پر اس کا اچھا یا برا اثر پڑتا ہے اور اس سلسلے میں آدمی کو آخرت کی عدالت میں جواب دہی کرنی ہے۔ بے ہنگم اور بگٹٹ اور موضوع سے آزاد ہو کر پہاڑی نالوں کی طرح جھاگ اٹھا اٹھا کر بہنے والی تقریر کو وہ تعلیم و تربیتِ عوام کے لحاظ سے مضر سمجھتے ہیں۔ ان کا سوچا سمجھا ہوا نظریہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں سطحی جوشیلے پن کا مرض بڑھ گیا ہے اور ان میں سنجیدہ اور تعمیری دعوت کو جذب کرنے کی صلاحیت کم ہو گئی ہے۔ نیز خطابتی ساحروں نے ان کا مذاق حد درجہ بگاڑ دیا ہے۔ لہٰذا اب اسے جوشیلی اور بے ربط تقریروں کی مزید غذا دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مودودی کے مکتبِ خطابت میں ایسی تقریر کی کھپت نہیں ہے جس میں چٹکلے، لطیفے، کہانیاں، قوالی، مسخرہ پن، شورش انگیزی، شوریدہ سری، دریدہ دہنی اور فکری آوارہ گردی کے عناصر پائے جائیں۔ اس مکتبِ خطابت کی تقاریر، سادہ، رواں، سنجیدہ، مدلل اور ٹھنڈی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان کی روح معلمانہ ہوتی ہے۔ مودودی صاحب نے عمر بھر میں کبھی کوئی ایسی بے سروپا تقریر نہیں کی جو

ایک محدود اور معینہ وقت کی حد سے آگے بڑھی ہو اور ساری ساری رات ہوا میں طوفانی لہریں اٹھاتے صبح کردی ہو، پھر نہ نعروں کی بہار، نہ واہ واہ اور نہ سبحان اللہ کا ہنگامہ۔ نہ زندہ باد۔ مردہ باد کا شور۔ کہنے کی بات کہی اور اسٹیج سے رخصت ہوگئے۔

تقریر کے اس ٹھوس اسلوب کے تقاضے سے مودودی صاحب پہلے سے کئی کئی گھنٹے صرف کر کے تیاری کرتے ہیں، سوچتے رہتے ہیں، مواد اکٹھا کرتے ہیں پھر سلپ لے کر ان پر تقریر کے مطالب کی کڑیاں مختصر اشارات کی شکل میں درج کر لیتے ہیں۔ جب یہ ہو چکتا ہے تو تقریر کے پورے "موڈ" میں آجاتے ہیں۔ تقریر کرنے سے پہلے کے تھوڑے سے وقفے میں ان کے چہرے پر ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے جس کو قریب سے جاننے والے ساتھی ہی پہچان سکتے ہیں۔ اپنے انھی اشارات کے ذریعے وہ اپنی پوری تقریر بعد میں کسی کو بٹھا کر لفظ بلفظ کی ترتیب سے املا کرا دیتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی تقریر مختلف مقامات پر کرنی پڑی تو بالعموم ہر جگہ لفظ بہ لفظ دہرائی گئی اور اس کی ترتیب میں سرِ مُو فرق نہیں آیا۔

اسٹیج پر تقریر کرتے ہوئے ان کا جو کچھ مخصوص انداز ہوتا ہے اس کے امتیازی خد و خال کو میں نے ایک خاص موقع پر تعین سے سمجھا۔ ہمارے ایک دوست کرداروں کا ڈرامائی چربہ اتارنے میں ماہر ہیں۔ خصوصیت سے مقررین کا تو وہ زندہ ریکارڈ بن کر حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے مجبور کن اصرار پر ایک مرتبہ بڑی جھجک کے ساتھ مودودی صاحب کی تقریر کا ریکارڈ سنایا۔ اس ریکارڈ کو سننے کے بعد اب میں بآسانی بتا سکتا ہوں کہ مودودی صاحب کے امتیازات کیا ہیں۔ وہ اسٹیج پر زیادہ تر ڈائس کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں اور کاغذات سامنے رکھ لیتے ہیں۔ سینے تک کا بالائی حصہ کسی قدر آگے کی طرف جھکا ڈلے ہوئے ہوتا ہے، ایک ہاتھ

غالباً بایاں ـــــ کمر کے پیچھے رہتا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے وہ شیروانی کے تیسرے یا چوتھے بٹن کو ذرا ذرا چھیڑتے رہتے ہیں۔ یہی ہاتھ کبھی کبھی بڑی آہستگی سے مختصر سی اشاراتی حرکت کرتا ہے۔ لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ یہ حرکت تیز یا سست ہوتی ہے۔ تقریر کی ابتداء دھیمی آواز اور انتہائی ٹھہراؤ سے ہوتی ہے اور الفاظ میں شخصیت کا وزن محسوس ہو رہا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ آواز اور لہجہ چڑھاؤ کی طرف جاتے ہیں، مگر بس ایک معیّن حد تک۔ اس حد سے آگے کوئی ایسا جملہ ہی جا سکتا ہے جس کے پیچھے شدّتِ جذبات کام کر رہی ہو۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور بہت کم وقفے کے لیے یہ رنگ آتا ہے اور تقریر پھر اپنے مقررہ معیارِ اعتدال پر آجاتی ہے۔ موضوع کے راستے پر مودودی صاحب گویا بخطِ مستقیم چلتے ہیں اور اِدھر اُدھر کی آوارہ گردی نہیں کرتے۔ تقریر میں دردمندی کی روح ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ انھوں نے دستور اور جمہوریت اور انتخابات اور دوسرے اہم اور پیچیدہ مسائل پر جب کبھی خطاب کیا ہے، اپنی بات کو عام فہم بنا کے پیش کیا ہے اور ہر پیچیدگی کا حسن وخوبی سے تجزیہ کر کے غیر تعلیم یافتہ سامعین تک کو متاثر کیا ہے۔ ان کا اندازِ تفہیم اپنی مثال آپ ہے۔

اس طرح کی غیر رنگین اور "بے تفریح" تقریر جس میں مجمع کو اس کی دل پسند ذہنی کوکین نہ کھلائی ہو، دو دو گھنٹے عوام کو بٹھا کر سنانا آسان نہیں۔ اس لیے کہ مودودی صاحب نے جلسوں اور اجتماعات کی ایک نئی فضا برسوں کی محنت سے پیدا کی ہے۔ پہلے اپنے رفقا کو اور پھر ان کے ذریعے عوام الناس کو ضبط وتنظم اور سنجیدگی اور خاموشی کی تربیت دی ہے۔ کھیل تماشے کا عنصر اجتماعات سے بالکل خارج کر دیا ہے۔ خصوصاً پابندئ وقت کے معاملے میں ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ قابلِ ذکر ہے۔ گزشتہ کل پاکستان اجتماع کے موقع پر جلسۂ عام بھی رکھا گیا تھا۔ لوگ آٹھ بجے

سے جہانگیر پارک میں جمع ہو چکے تھے اور کچھ ابھی آرہے تھے۔ سوا آٹھ بجے مودودی صاحب کی تقریر ہونی تھی۔ اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے قریب کے دوسرے ساتھی سے پوچھا: "وقت کیا ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "ابھی آٹھ بج کر سولہ منٹ نہیں ہوئے ورنہ مودودی صاحب کی تقریر شروع ہو چکی ہوتی۔"

بارہا ایسا ہوا کہ کسی مخالف طاقت نے شر پسند عنصر کو تیار کر کے مودودی صاحب کی تقریر میں شرارت کرنے اور جلسہ خراب کرنے بھیجا، لیکن جماعت اسلامی کے جلسوں کی سنجیدہ و منضبط فضا اور مودودی صاحب کی شخصیت اور ان کے اندازِ تقریر نے ہمیشہ ایسی فضول کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ مولینا مودودی (بلکہ ان کے رفقاء بھی) اس طرح کے حالات سے کبھی بھی گھبراتے نہیں، بلکہ جرأت مندی اور اعتماد کے ساتھ ہر قسم کے حوادث کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو کر جاتے ہیں اور خدا ان کو عملاً بھی کامیابی دیتا ہے۔

جلسوں میں جا کر وہ سوالات کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے؛ چنانچہ چٹوں پر چٹیں آتی ہیں اور ڈھیر کا ڈھیر جمع ہو جاتا ہے۔ بڑی حوصلہ مندی سے مولینا مودودی ان چٹوں کو ایک ایک کر کے پڑھتے ہیں۔ اور ایک فقرے میں حاضر دماغی سے ان کے ایسے پھڑکتے ہوئے جواب دیتے چلے جاتے ہیں کہ سامعین اثر لیتے ہیں، مثلاً گول باغ کی تقریر (۱۹۵۱ء) میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ "جب دوسری پارٹیوں نے مل کر ایک متحدہ صورت اختیار کر لی ہے تو آپ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کیوں بنائی؟" مولینا نے فوراً جواب دیا کہ "افسوس ہے کہ مجھے ڈیڑھ ہی اینٹ مل سکی، ورنہ میں اس سے بڑی مسجد بناتا۔"

تقریر کے دوران میں (گردے کی تکلیف کی وجہ سے) وہ دو تین بار پانی

پیٹتے ہیں، نعرے لگائے جانے کو دل سے پسند نہیں کرتے، بس گوارا کرتے ہیں۔ تقریر کرنے کے بعد چند لمحے سستانے کے لیے کرسی پر بیٹھتے ہیں، پھر جلد روانہ ہو جانا چاہتے ہیں، لیکن لوگ آ آ کر مصافحے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ رفقا راستہ بناتے ہیں اور ان کو جلد از جلد بھیڑ سے نکال لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے مولانا کی ریڈیائی تقریریں بھی سنی ہیں (جو اب مطبوعہ صورت میں ملتی ہیں) عام رائے یہ ہے کہ مولانا مودودی کی آواز ریڈیو کی ضروریات کے مطابق بہت ہی موزوں ہے۔ آواز بہت صاف سنائی دیتی ہے، اچھی طرح پہچانی جاتی ہے اور تلفظ کی پوری صراحت محسوس ہوتی ہے۔ ریڈیائی تقریروں میں بولنے کی رفتار اکثر اوقات تیز رہتی ہے کیونکہ ۱۰ یا ۱۵ منٹ میں وہ موضوع سے متعلق اپنی پوری بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اب تو مولانا مودودی پر ریڈیو کے دروازے بند ہیں، کیونکہ "سیاسی آدمی" ہونے کا قصور پاکستان میں ایسا قصور ہے جس کے بعد آدمی سے خالص علمی اور فکری اور دینی استفادہ کرنا بھی حلال نہیں رہتا۔

سالانہ اجتماع کی تقریر کا بنیادی نقشہ بالعموم مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے بنتا ہے اور امیرِ جماعت ــــــ خواہ وہ کوئی ہو ــــــ اسی نقشے کی پابندی کرتا ہے۔ مولانا مودودی اتنی اونچی شخصیت رکھنے کے باوجود اس پابندی سے استثنٰی نہیں رکھتے۔ یوں بھی کسی مہم کے سلسلے میں دورے اور خطابات ہوتے ہیں تو اُن کے لیے بھی مجلسِ شوریٰ ہی کے اندر باقاعدہ منصوبہ بنتا ہے اور تقریر کے اساسی خطوط معیّن ہو جاتے ہیں، البتہ فوری اور ہنگامی اور متفرق مواقع پر، جبکہ جماعت کی پہلے سے بنی ہوئی پالیسی کے اندر کام کرنا ہوتا ہے مولانا مودودی (اور جو کوئی بھی امیر ہو) تازہ مشورہ کے بغیر خطاب کرتے ہیں۔ جماعت کا مؤسس اور داعیِ اوّل بھی، اپنی امتیازی شخصیت

کے باوجود جماعت کے نظم کی پابندی سے بالاتر نہیں ہے۔

نماز کے بھی گوناگوں اسٹائل ہیں اور ہر اسٹائل شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ ریاکار آدمی کی نماز اور خداترس کی نماز، بے سمجھے بوجھے کی نماز اور شعوری نماز، زندگی سے ہم آہنگی رکھنے والی نماز اور اس سے تضاد رکھنے والی نماز، جذباتی آدمی کی نماز اور مستقل مزاج شخص کی نماز، عبادت کی نماز اور ارادے کی نماز، عامیانہ شخصیت کی نماز اور کسی ممتاز شخصیت کی نماز ایک دوسرے سے بالکل الگ پہچانی جاتی ہیں۔

مودودی صاحب ہمیشہ پابندی سے مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے رہے ہیں، لیکن اب جب سے پتھری کی تکلیف اور نزلے کے پے درپے حملوں نے عمر کے تیسرے مرحلے میں آکر ان کے اعصاب کو حد درجہ کمزور کر دیا ہے، وہ بیشتر نمازیں مرکز کے لان میں رفقائے مرکز اور ملاقاتیوں سے مل کر ادا کر لیتے ہیں۔ پھر بھی جمعہ کو ضرور محلے کی مسجد (مسجد رسول پورہ) میں جاتے ہیں۔ ہر قسم کے خطیبوں کے خطبے سنتے ہیں اور ہر سطح کے اماموں کی اقتداء کرتے ہیں۔ اس شخص کو جس کے آج دوستوں، دشمنوں کے حلقوں میں چرچے ہیں اور جس کے ساتھ حامیانہ اور مخالفانہ دلچسپیاں رکھنے والے ہزارہا انسان بیرون پاکستان کے مختلف ممالک تک پھیلے ہوئے ہیں اس کو آپ مسجد رسول پورہ کے کسی کونے میں ایک درویش بے نیاز کے انداز سے بیٹھا پائیں گے۔ اس کا سر جھکا ہوگا اور وہ خطبہ تفکّر کے ساتھ سن رہا ہوگا۔ فرض نماز کے بعد دعا ہوتے ہی وہ اٹھے گا اور ایک موجِ نسیم کی طرح غیر محسوس طور پر چلا جائے گا۔

"دارالاسلام" کی مسجد کی امامت زیادہ تر مودودی صاحب کرتے تھے اب بھی مرکز میں با جماعت کے اجتماعات کے موقعوں پر وہی مصلّے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وضو ہمیشہ گھر سے کر کے چلتے ہیں۔ سنتیں بھی گھر سے پڑھ کر

آتے ہیں اور کبھی مسجد میں پڑھ لیتے ہیں۔ امامت کے لیے کھڑے ہوں، تو سیدھے کھڑے ہوتے ہیں، مگر مؤدبانہ جذبات قیام کے اسلوب سے صاف جھلکتے ہیں۔ نماز کے لیے استقبالِ قبلہ کرتے ہی ان کے اندر ایک خاص طرح کا احساسِ ذمہ داری پیدا ہو جاتا ہے اُن کی نماز ہمیشہ معتدل ہوتی ہے —— نہ غیر معمولی طور پر طویل، نہ جلد بازانہ! —— سکون اور وقار ادائے ارکان میں شروع سے آخر تک جھلکتا ہے۔ قرأت کا انداز بالکل ہی خاص قسم کا ہے۔ ایک ایک آیت الگ الگ کر کے اور اس کے اجزائے مطالب کو واضح کرتے ہوئے قرآن پڑھتے ہیں۔ لہجے میں ٹھیک معانی و مطالب کے مطابق اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ نہ تو مصنوعی طریق سے سُر بناتے ہیں اور نہ بے روح طریق سے عام عبارت کی طرح آیات پڑھتے ہیں۔ کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے اور وہ ساتھ نماز پڑھنے والوں پر اثر انداز ہوتی ہے کہ جیسے کائنات کے فرماں روا کی خدمت میں کھڑے ہیں اور اپنے جذبات پیش کر رہے ہیں اور اُدھر سے لُطف و عنایت طلب کر رہے ہیں۔

مودودی کی نماز میں وہی تحریکی روح پائی جاتی ہے جو اُن کے عملی کام میں ہے۔ اس میں دلوں کو بجھا دینے والا وہ جمود نہیں ہوتا جو ہماری نماز دل پر دورِ زوال سے پرتو افگن ہے اور جس کی وجہ سے اوّل تو نماز کی طلب ہی ختم ہو گئی ہے اور اگر اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جائیے بھی تو الٹی اوس پڑ جاتی ہے۔ فرض پڑھنے کے بعد مختصر سی دُعا ہوتی ہے اور امامت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سنتیں پڑھ کر مولانا مودودی بھی جائے نماز سے الگ ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ بھی منتشر ہونے لگیں گے۔ مودودی صاحب نوافل مسجد میں نہیں پڑھتے کیونکہ قرآن و حدیث کے مطابق اُن کا نظریہ یہ ہے کہ فرائض اجتماعی طور پر اور نوافل اخفاء کے ساتھ ادا کرنے چاہئیں۔ مودودی صاحب کی امامت نہ بے جا طور پر بوجھل ہوتی ہے، نہ بے رُوح

اور بے کیف! بلا مبالغہ عرض کروں گا کہ پہلی نماز جو میں نے مودودی صاحب کے ساتھ ادا کی اس کا ذائقہ پہلے کی تمام نمازوں سے مختلف تھا۔ اس امامت میں نئی شخصیت جلوہ گر تھی۔ نماز اور قرأت کا یہ خاص اسلوب میں نے پہلے بھی اور بعد میں بھی کسی دوسرے میں نہیں پایا۔ اگرچہ دوسرے حضرات کی نماز اور امامت میں بھی طرح طرح کی خوبیاں اور اثرانگیزیاں محسوس کی ہیں نماز کو صحیح تصور نماز بناتا ہے اور تصورِ نماز تصوّرِ خدا پر مبنی ہوتا ہے۔ مودودی صاحب کی نماز میں ان کا انقلاب آموز تصورِ خُدا طاری وساری رہتا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ چیز صرف نفسیاتی وروحانی تجربہ سے تعلق رکھتی ہے اور مقالاتی بحثیں اس کی متحمّل نہیں ہیں۔

دارالاسلام میں مَیں نے دوسرے رفقاء کے ساتھ مولٰنا کے حلقۂ درس میں قرآن اور حدیث کا جو مطالعہ کیا ہے درحقیقت اس نے میرے ذہنی سانچے کو بڑی حد تک توڑ پھوڑ کر موجودہ شکل دی ہے۔ مسلسل پانچ برس یہ حلقۂ درس ایک "اسٹڈی سرکل" کے سے انداز پہ ہماری ذہنی واخلاقی تربیت کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ درس بہت جگہ ہوتے ہیں، بہت سے بزرگ درس دیتے ہیں، لیکن مجبوراً پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ مودودی صاحب کے درس کا انداز بھی بالکل مختلف پایا۔

طریقہ یہ تھا کہ نمازِ فجر یا نمازِ عصر کے بعد تمام لوگ حلقہ زن بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے مصحف سامنے رکھ لیتے۔ اکثر اوقات ہم لوگ پہلے سے زیرِ درس آنے والے حصّہ کا مطالعہ کر لاتے اور اس کے بارے میں سوالات اور الجھنیں نوٹ کر لاتے۔ مولانا ہلکی آواز سے تعوّذ اور تسمیہ کہہ کر آغاز کرتے پھر سلسلۂ کلام کا خلاصہ ذہنوں میں مستحضر کر دیتے، پھر اگلی آیات کا معنوی ربط سامنے لاتے۔ اس کے بعد ایک ایک آیت پڑھتے، اس کا سادہ مگر جاندار اور اثرانگیز اور جدید "اردوئے مبین" میں ترجمہ کرتے پھر خاص خاص اصطلاحی کلمات کی وضاحت کرتے،

جو مغالطے متعلقہ مضمون کے بارے میں عام طور پر پائے جاتے ہیں ان کو صاف کرتے اور آخر میں احکام اور تقاضے واضح کرتے۔ پھر اگلی آیت، پھر اُس سے آگے ——— اور اسی طرح تقریباً ایک رکوع ہر نشست میں ہو جاتا۔ اس درس میں کبھی بھی صرف و نحو اور منطق اور ٹیکنیکل بحثوں کا پر تو انھوں نے نہ پڑنے دیا۔ ان کا اسلوب عام آدمی ——— خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوان ——— کو سمجھانے کا ہوتا اور اسی کی ذہنی سطح، دلچسپی اور اُلجھن کو وہ پیشِ نظر رکھتے۔ جس بحث سے جدید علوم اور جدید مسائل کا کچھ بھی تعلق ہوتا، تو ساتھ کے ساتھ ان پر ضرور گفتگو کرتے۔ نیز مختلف فقہی نقطہ ہائے نظر کو متقابلاً سامنے رکھ دیتے۔ صاحبِ درس کے سامنے اصل نصب العین یہ تھا کہ شرکاء اپنے اندر قرآن کا انسانِ مطلوب پیدا کریں اور درسِ حدیث کے ذریعے اس کے تفصیلی خدوخال نمایاں کریں۔

درس کی ایک ایک آیت اور حدیث پر ہر مرحلے میں سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوتی۔ سوالات ہر قسم کے ہوتے تھے۔ اُونچے علمی قسم کے، سطحی مذہبی گروہوں کے پیدا کردہ، جدید طبقوں کے اُٹھائے ہوئے، ٹھنڈے انداز کے، جذباتی طرز کے ——— اور اکیلا مودودی ان سارے حملوں کو خندہ پیشانی سے چار جانب سے سینے پر لیتا۔ حکیمانہ و تفہیمانہ اسلوب سے ہر بات کی وضاحت ہوتی چلی جاتی۔ کسی معرکے کے مسئلے کے چھڑ جانے پر لمبی بحث کا سلسلہ چل نکلتا اور اس کی وجہ سے درس ایک ہی آیت یا حدیث پر رُکا رہتا۔ بحث میں نوعمر سائلین تیزی بھی دکھاتے اور باہر سے آنے والے مہمان بھی طرح طرح سے حصہ لیتے، مگر صاحب درس ٹھنڈے انداز پر بار بار اصل حقیقت کو نمایاں کرنے کی سعیِ مسلسل کرتا چلا جاتا اور آخری جیت اُسی کی ہوتی۔ خصوصیت سے جہاں کہیں معاشی اور سیاسی بحثیں پیدا ہوتیں وہاں بڑی گرما گرمی پیدا ہو جاتی۔ کیونسٹ پروپیگنڈے کے پھیلائے ہوئے تصورِ مساوات کی بنیاد پر تو ہم لوگ خوب

خوب اُلجھے بلکہ ندامت کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دو ایک موقعوں پر ہماری طرف سے زیادتی ہی ہوئی، مگر وہ مجسمۂ استقلال نہ کبھی گھبرایا، نہ کبھی بگڑا، نہ ہم سے مایوس ہوا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید لعنت ملامت پر اتر آتا، حلقۂ درس سے نکال باہر کرتا، بلکہ سلسلۂ درس ہی کو برطرف کر کے بیٹھ رہتا۔ مگر کیا کرتے کہ وہ وہی مسکراتا چہرہ، وہی ٹھنڈا مزاج اور وہی تفہیمی انداز ہمارے سامنے ہوتا۔ باہر سے مودودی صاحب کے نئے نئے عقیدت مند پیری مریدی کی روایات ذہن میں لیے ہوئے آتے اور ہماری بے تکلفانہ اور آزاد بحثوں کو "غیر شرعی" اور غیر مؤدبانہ سمجھ کر خفا ہوتے، کبھی تو حلقۂ درس ہی میں ٹوک دیتے۔ ہم چپ رہتے اور خود مولٰنا مودودی ہماری مدافعت کرتے اور ہماری آزادی اور ہمارے حقوق کی وکالت کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بحث فلسفۂ ارتقا کے سلسلے میں بہت طول پکڑ گئی تھی۔ اسی طرح ایک مرتبہ اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ (حدیث) پر خوب خوب دماغ سوزی ہوئی۔ غالباً ایک یحیٰی صاحب تھے اور دوسرا میں تھا جن کو کسی علمی بُنیاد کے بغیر اصرار تھا کہ یہ حدیث موضوع ہے اور قابلِ استرداد۔ مولانا مودودی نے بخلاف اس کے اس کا ایک ایسا مفہوم ہمارے سامنے رکھا جس پر کسی پہلو سے اعتراض وارد نہیں ہوتا تھا۔ اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ اَلسُّلْطَانُ کے معنی یہاں بادشاہ نہیں، بلکہ سلطنت یا "حاکمیت" ہیں۔ اور حدیث کا منشاء اُنھوں نے یہ واضح کیا کہ بادشاہت یا حاکمیت یا اقتدار اللہ تعالیٰ ہی کے اقتدار کا ایک پَرتو ہے اور جو شخص بطور حاکم اس خدائی امانت و عطیہ کو پا کر اس کی اہانت کرتا ہے خُدا بھی اسے ذلیل کرتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے علم خدا کا ایک عطیہ ہے اور جو عالم علم کو نفسانیت کے لیے استعمال کرے وہ مجرم ہے۔ اس مفہوم نے نئے دروازے کھول دیے، مگر حدیث کا جو استعمال ہماری تاریخ میں ہو چکا تھا اور اس کی وجہ سے جو اضطراب عام طور پر نوجوانوں میں پھیلا ہوا تھا اس کی وجہ سے ہم اصرار کرتے تھے کہ ایسی حدیث کو آخر بنائے استدلال

بنانا ہی کیا ضرور ہے۔ یحییٰ صاحب تو بڑی صفائی سے کہتے تھے کہ مولینا ! جب معلوم ہے کہ ہمارے بادشاہوں کے حفظِ اقتدار کے لیے دنیا پرست عالموں نے حدیثیں گھڑی اور استعمال کی ہیں تو یہ جانتے ہوئے ایسی حدیثوں کو کیوں لیا جائے۔ صاحبِ درس نے بڑی مغز ماریوں کے بعد یہ اصول ہمارے ذہن نشین کرایا کہ اگر کوئی حدیث روایت و سند کی صحت رکھتے ہوئے کوئی ایسی تاویل و تشریح قبول کرتی ہو جو دین کے اصولوں اور اس کے مجموعی تاثرات کے مطابق بیٹھ سکے تو پھر بلا وجہ اُسے رد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہو سکتا۔ بہر حال آزادانہ فضا میں ہم نے دین کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھا۔

درس ختم ہوتا تو ہم سب اپنے اپنے مصرف لیے منتشر ہو جاتے۔ کسی دن جاتے ہوئے اپنی کسی فکری غلطی اور کسی عملی کوتاہی کا شعور و احساس لے کر جاتے اور اس کی اصلاح کا جذبہ موجزن محسوس ہوتا۔ کسی دن دین کی کوئی نئی حقیقت دلوں کے دامن میں لیے ایک عجیب سی مسرت کے ساتھ ——جسے مسرتِ علم کہنا چاہیے—— مسجد سے نکلتے۔ کسی دن ذہن کی کوئی الجھن اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتی اور وہ اگلے دن سابق درس کے بارے میں ازسرِ نو بحث چھڑنے کا محرک بنتی۔ کسی دن مختلف الخیال رفقار آپس میں بحث کرتے ہوئے نکلتے اور چوبیس گھنٹے میں فرصت کے موقع پر وہی بحث بار بار جاری رہتی یہاں تک کہ اگلے دن کا درس سامنے آجاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ درس کے بعد ہم لوگ مودودی صاحب کو ان کے دفتر میں جا گھیرتے اور دماغ کی رہی سہی بھڑاس نکال لیتے۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر بدتمیزی کے رنگ سے خدا نے فضا کو پاک رکھا۔ کیونکہ بنیادی کلمہ اور مرکزی نظریہ سب کو انضباط میں لیے ہوئے تھا اور سب طالبِ علم تھے نہ کہ مناظرہ باز۔ نظریات ٹوٹتے اور بنتے، جامد خیالات پگھلتے اور نئی شکل اختیار کرتے۔ شخصیت و کردار میں ایک تزلزل سا آتا رہتا۔ ذہنوں میں ہر روز نئے اتار چڑھاؤ رہتے اور ہم محسوس کرتے کہ ہمارے اندر تخریب و تعمیر کا متوازی عمل جاری ہے۔ ہمارے اندر کا پرانا انسان دم توڑ رہا ہے اور ایک نیا

انسان ابھر رہا ہے۔ مذہب کے زنگ آلود موروثی تصورات اکھڑ رہے ہیں اور تحریکِ اسلامی کا نیا تصور دل و دماغ کے مطلع پر جگمگا رہا ہے۔ الغرض ہم نے مودودی صاحب سے جو چیز بھی قبول کی ہے، اپنی آزادیٔ رائے کو برقرار رکھتے ہوئے اور دلیل و عقلیت کی بازیاں لڑ کر قبول کی ہے۔ عقیدت مندی کے ساتھ آمنّا صدقنا شاید کسی ایک امر میں بھی نہیں کہا۔ مودودی صاحب نے بھی اس طریقِ تعلیم و دعوت کو سوچ سمجھ کر اپنایا تھا۔ وہ دراصل اندھے مرید نہیں چاہتے تھے کہ جن کا گلہ بنا کر وہ اپنی عقیدت کے باڑے میں رکھیں اور اس کو اپنی کرامات کی چراگاہ میں چرا کر اس کے گوشت اور دودھ اور اُون سے فائدہ اٹھائیں اور پھر دُنیا سے رُخصت ہوتے ہوئے یہ گلہ اپنی اولاد کے لیے بطور ترکہ اور جائداد کے چھوڑ جائیں ——— وہ ایک سوچنے سمجھنے اور اپنے اندرونی جذبے سے حرکت کرنے والی طاقت پیدا کرنے کے اہتمام میں تھے جو اسلامی اصولوں پر ایک نئی دنیا بنانے کا پارٹ ادا کر سکے۔ ہمیں کبھی مغالطہ نہیں ہوا کہ ہم فی الواقع اس گراں بہا کام کے پوری طرح اہل بن گئے ہیں، احساس صرف یہ ہے کہ دارالاسلام کی تربیت نے ہمیں ایسے سوچنے سمجھنے والے پیروانِ اسلام میں بدل دیا ہے جن کا سرچشمۂ فکر قرآن و حدیث ہے اور جو اعتماد کے ساتھ مخالف حالات کے مقابلے میں کھڑے ہو کر دورِ حاضر میں آگے بڑھنے کا راستہ خود بنا سکتے ہیں۔

اس درس کا سلسلہ کبھی کبھی مرکز میں اب بھی جاری رہتا ہے اور اب بھی سوالات اور بحثیں چھڑتی ہیں، مگر سچ یہ ہے کہ ہم دارالاسلام کے دور کے درس کو ترس گئے ہیں۔ کتنا اچھا تھا ہمارا وہ زمانۂ ناآشنائی! کتنے ناقابلِ فراموش ہیں وہ اجنبیت کے مزے!"

اب اُس صاحبِ درس کی شخصیت کا نقشہ آپ خود اپنے ذہن میں کھینچ سکتے ہیں۔

آیئے، اب ذوقیات کے دائرے کی طرف!

مولینا مودودی کے ذوقیات کا شجرِ طیبہ چائے اور برفاب سے سیراب ہوتا ہے اور اس کی ٹہنیاں پان کے پتوں سے آراستہ ہیں۔ پان مولینا کے ہاں مسرت و تفریح کا ترجمان ہے اور یہی نازک سا برگِ سبز پریشانیوں کے بارہائے گراں اپنے کفِ حنائی پہ سہارتا ہے، لیکن سب سے بڑھ کر یہ کاوش و تفکر کی گھڑیوں کا رفیق ہے۔ دماغ میں جونہی سوچنے کی تحریک ہوتی ہے، معاً مولینا مودودی کا ہاتھ ڈبیہ بٹوے کی طرف بڑھتا ہے۔ ادھر برگِ سبز پہ زردہ چھالیہ ڈالا جارہا ہوتا ہے اور اُدھر خیالات ترتیب پانے لگتے ہیں۔ پان کے چبانے کے لیے جبڑوں کی ہلکی ہلکی جنبش قلزمِ افکار کی نرم خیز لہروں سے بالکل ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ مودودی کی تحریروں میں کوئی شک نہیں کہ پان کے پتے کی سبزی، اس کے کرارے پن، چھالیہ اور چونے کی تیزی اور زردے کی حرارت انگیز اور تحریک زا لطیف تلخی کے سارے پہلو شریک رہتے ہیں۔

اگلے روز مولینا مودودی سے احباب کی مجلس میں (جو سفرِ حج سے واپسی پہ فوراً ہی مرکزی دفتر میں منعقد ہوئی) دریافت کیا گیا کہ کیا پان اس لمبے سفر میں ملتا رہا؟ فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص انتظام یہ کیا کہ مفتی محمد شفیع صاحب کو ہم سفر بنایا۔ ان کے ساتھ پان کا ذخیرہ تھا اور وہ اسے دیر تک محفوظ رکھنے کا کوئی خاص طریقہ جانتے تھے؛ چنانچہ پان ملتا رہا۔ کوئی چار دن کا فاقہ کیا ہو گا کہ مکہ پہنچ گئے اور مکہ کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ضمانت ہے ہی کہ یہاں رزق ضرور ملے گا۔ ایک صاحب نے پوچھا: "کیا مولینا! پان بھی رزق کی تعریف میں آتا ہے؟" ——— "اجی واہ، تو کیا روٹی اور سالن ہی کا نام رزق ہے" ——— مودودی صاحب خندہ آمیز انداز سے فرمانے لگے: "اصل رزق تو پان ہے۔"

ایک گفتگو ماہر القادری صاحب نے یوں روایت کی ہے:

"ایک بار پان کا ذکر چل نکلا۔ میں نے مولینا سے کہا کہ آپ تو بڑے شوق سے مزو لے لے کر تمباکو کھاتے ہیں ـــــ مگر میرا یہ عالم ہے کہ چھالیہ میں تمباکو چھو بھی جائے تو اس چھالیہ کو نہیں کھا سکتا۔ اس کے جواب میں مولینا نے فرمایا کہ میں بھی پہلے تمباکو نہیں کھاتا تھا۔ ایک بار کسی صاحب نے تمباکو کا پان کھلا دیا (میرا خیال یہ ہے کہ پنواڑی نے غلطی سے تمباکو ڈال دیا تھا۔ ن۔ص) اور اس پان کو کھا کر مجھے گھمائی آئی۔ بس اس گھمائی کے بعد مجھے تمباکو کھانے کی عادت پڑ گئی ـــــ مگر اس عادت پر اتنا قابو بھی ہے کہ جیل میں جاتا ہوں تو وہاں پان کی یاد نہیں آتی"

(مولینا مودودی ـــــ اپنی اور دوسروں کی نظر میں

جیل جانے کا واقعہ بھی سن لیجیے جسے میں پہلے لکھ بھی چکا ہوں۔ پہلی مرتبہ کی گرفتاری (۴، اکتوبر ۱۹۴۸ء) کے موقع پر ضروری کارروائی اور تیاری ہو چکنے پر مولانا روانگی کیلئے نکلے۔ برآمدے میں رفقاء سے ملے، سیڑھیوں کے کنارے کھڑے ہوئے اور بہ طرزِ معمول پان طلب کیا: "ڈبیہ بٹوا کہاں ہے؟ آخری پان کھا لیا جائے۔" پوچھا کہ آخری کیوں؟ ہنستے ہوئے فرمانے لگے "بس اب طلاق دے رہا ہوں" پان جیسے رفیق کے بارے میں یہ فیصلہ سن کر میں نے پوچھا کہ کیا جیل کے بعد بھی یہ طلاق جاری رہے گی؟ تو فرمایا: "نہیں یہ طلاق رجعی ہے مغلظ نہیں" اس پر سید نقی علی صاحب اور دوسرے لوگ خوب قہقہہ لگا کر ہنسے۔ یوں یہ شخص ہنستے ہنساتے مصافحہ کر کے نامعلوم مدت کی قید کے لیے مسلح پہرے میں جیپ گاڑی کے اندر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

(مولینا مودودی ـــــ اپنی اور دوسروں کی نظر میں)

مولینا کی رائے میں پان کی ترکیب و ترتیب الہامی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذرا اس کے اجزا کے تنوع اور ان کی باہمی مغائرت کو دیکھیے۔ کہاں کہاں سے یہ اجزاء لا کر جوڑ ملائے جاتے ہیں۔ انسانی ذائقہ محض عقل کی رہنمائی سے کہاں یہ ترکیب

پیدا کر سکتا ہے۔

ایک بار (جب کہ انگریزی دورِ حکومت تھا) کہنے لگے کہ ان انگریزوں نے اپنی عادتِ بد کا تو اتنا اہتمام کیا ہے کہ گاڑی کے اونچے درجے کے ڈبوں میں شراب کے پیگ رکھنے کے اسٹینڈ لگا رکھے ہیں تاکہ راستے میں بھی —— ضرورت ہو تو لیٹے لیٹے —— شراب کی چسکیاں لی جاتی رہیں لیکن ان کم بختوں کو ہمارے پان کا لحاظ نہیں کہ اگال دان لگوا دیے ہوتے۔ اسلامی نظامِ حکومت کبھی آیا تو گاڑیوں کے ڈبوں میں اگال دان ضرور لگیں گے۔

دارالاسلام کے دور میں مولینا مودودی کے پاس ایک بڑا سا پان دان تھا جس پر نکل پالش کیا ہوا تھا۔ یہ بالعموم دفتر کی میز پر دکھائی دیتا اور جب مولینا مجالس شبانہ میں آ بیٹھتے تو پان دان بھی ساتھ آتا۔ حسی ذوق کا یہ نمونہ تاریخی حیثیت اختیار کر گیا، کیوں کہ مولوی منش لوگ باہر سے آتے تو —— سامنے تو نہیں —— اِدھر اُدھر دبی زبان سے کہتے کہ یہ پان دان خلافِ شریعت ہے۔ ہم لوگ مسکرا کے سن لیتے۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ ایسے حضرات اسے چاندی کا پان دان سمجھتے رہے تھے اور سونے چاندی کے برتنوں کو محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے حرام ٹھہرایا ہے۔ خود "پان" بھی بعض لوگوں کے فتووں کا ہدف بنے بغیر نہ رہتا۔ کچھ لوگ اسے ناجائز نہیں کہتے تھے مگر بڑی لجاجت سے مولانا سے درخواست کر دیتے تھے کہ عام تصورات کا لحاظ کرتے ہوئے آپ اسے ترک کر دیں، مگر مولینا مودودی دوسروں کو دکھانے اور دوسروں کو خوش کرنے کے لیے نہ کوئی چیز اختیار کرتے ہیں، نہ کچھ ترک کرتے ہیں۔ ایک پان ہی پہ کیا موقوف، کوئی آ کر میز کرسی کی نشست پر اعتراض کرتا، کوئی سفید اُجلے لباس پر ہی اپنے انوکھے نظریات کے دھبے ڈال دیتا، بلکہ ایک مرتبہ تو ایک مہذب قسم کے مہمان نے دورانِ گفتگو میں دیواروں کی سفیدی کو بھی خلافِ اسلام قرار دیا۔ مودودی صاحب ان امور

میں بحث کرنے کے بجائے خوبصورتی سے طرح دے جاتے۔
ضمناً ایک ضروری بات یاد آئی۔ مولانا مودودی ذوقیات کے معاملے میں گھٹے ہوئے مذہبی ذہنوں کے برعکس بڑے فراخ دل اور عالی ظرف واقع ہوئے ہیں۔ جامد تصورِ مذہب ہر ہر چیز پر اعتراض کی انگلی رکھتا ہے خصوصیت سے پان اور چائے اور سگریٹ تو بہت ہی بڑے مظلوم ہیں۔ جماعت میں آنے والوں میں جو لوگ حقہ اور سگریٹ کے عادی تھے ان کی اکثر شامت آتی رہی ہے۔ خصوصاً مرکز میں جا رہنے والوں کو تو کسی نہ کسی نو وارد کی خشونت سے زک سابقہ رہتا۔ میں خود اس تلخ تجربہ سے گزرتا رہا۔ مگر میری اور اس طرح کے دوسرے رفقاء کی محفوظ پناہ گاہ مولینا مودودی ہوتے۔ وہ رسمی مسئلوں کو شریعت کا جزء نہیں مانتے اور ممنوعات کے دائرے کو خواہ مخواہ وسیع کرتے چلے جانے کے قائل نہیں، بلکہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اباحت اور رخصت سے فائدہ اٹھانے کا حق کوئی کسی سے سلب نہیں کر سکتا۔ ابتداً میں احتراماً میں مولانا مودودی کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ نہیں پیتا تھا اور خطوط نویسی کے دور میں جب مولینا کے دفتر میں زیادہ دیر بیٹھنے سے اعصاب میں ہلچل ہونے لگتی تو چپکے سے ان کے پاندان سے زردہ کے چند ریزے لے کر منہ میں رکھ لیتا۔ مولینا جب میری کمزوری سے آگاہ ہو گئے تو کسی مجلس میں بہ سلسلۂ "حدیث دیگراں" اشارۃً واضح کیا کہ سگریٹ جسے پینا ہو وہ پیئے، اس میں کیا حرج ہے۔ جب سے اب تک مولینا ہمارے سامنے پان کھاتے ہیں اور ہم ان کے سامنے سگریٹ پیتے ہیں۔ کسی طرف سے حملہ ہوتا ہے تو ہم اس پناہ گاہ میں سمٹ جاتے ہیں۔ یوں اب کئی سال کی تربیت سے اس قسم کے جملہ معاملات میں جماعت کی مجموعی فضا انتہائی فراخدلانہ قسم کی ہو گئی ہے اور کوئی بھی اب خوردہ گیریاں نہیں کرتا۔
میں نے جیل کی ڈائری میں (جس کے چند ہی اوراق شائع ہوئے ہیں) لکھا ہے کہ اپنی چند روزہ رہائی کے دوران میں مولینا کے خلاف مقدمے کی

کارروائی سننے ہم فوجی عدالت میں گئے۔ کارروائی ختم ہونے پر ملاقات ہوئی۔ بر سبیل تذکرہ میں نے بیان کیا کہ سگریٹ چھوڑ دیا ہے۔ مولینا ہنس کر فرمانے لگے: ایسے نہیں، جیل میں آیئے تو چھوڑ دیجیے، باہر جایئے تو پھر پیجیے، پھر جیل آیئے تو پھر چھوڑ دیجیے۔"

مولانا مودودی چائے سے بھی رغبت رکھتے ہیں، لیکن مولینا آزاد کے ذوق سے آپ کا ذوق بالکل برعکس ہے۔ مودودی صاحب اس معاملے میں پنجابی نسخہ کے قائل ہیں، یعنی چائے کی پتی بھی بہت ہو، دودھ بھی بہت ہو، شکر بھی بہت ہو؛ چنانچہ شکر کے تین چمچے آپ کے لیے پیالے کو میٹھا کرتے ہیں۔ چائے کی گرمی کے ساتھ آپ کو برفاب کی ٹھنڈک سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ ٹھنڈا پانی مولینا مودودیؔ کے اوّلین مرغوبات میں سے ایک ہے مگر ٹھنڈے پانی کا مفہوم ان کے ہاں یہ ہے کہ آدھی برف ہو اور آدھا پانی حتیٰ کہ جاڑے میں بھی وہ ٹھنڈے پانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ جب دارالاسلام کے زمانۂ خطر میں رات کو پہرے کا انتظام ہوتا تھا اور ڈیوٹی دینے والے گروپوں میں مولینا کی باری بھی جس رات آتی تھی تو آپ برف کا انتظام کر لیتے تھے۔ گھنٹے گھنٹے بعد برف کی سِل کو سُوئے سے توڑا جاتا اور مولینا خود بھی برفاب پیتے اور دوسرے ساتھی بھی!

کھانوں میں مولینا مودودی کے گھر کا ایک خاص مرغوب کھانا "شب دیگ" ہے۔ یہ "شب دیگ" مولانا کی والدہ مکرمہ کی ہدایت و نگرانی میں دبالعموم عیدالاضحیٰ کے موقعوں پر پکتی ہے اور سارے رفقاء مولینا کے ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔ واقعی یہ چیز خوب رہتی تقسیم کے بعد شاید ایک بار اس قصۂ ماضی کی یاد تازہ کی جا سکی ہے۔

مودودی صاحب کے ذوقیات کے سلسلے میں کھانے کا ایک دلچسپ فلسفہ سنیئے۔ ابھی گزشتہ رمضان میں ہمارے ایک "پروفیسر" دوست نے سمن آباد

میں مودودی صاحب کو دعوتِ افطار دی۔ یہ دعوتِ افطار مکمل کھانے سے کسی قدر زیادہ "ثقیل" تھی۔ دسترخوان فرش پر بچھا، لیکن چھری کانٹا موجود! دو چار دوستوں نے چھری کانٹا اُٹھایا مگر مولانا مودودی نے مشرقی وضع نہ چھوڑی۔ میزبان نے پلاؤ کے قریب چمچہ رکھ کر اپنا مشورہ پیش کیا۔ ساتھ ہی کسی صاحب نے پوچھا، "چھری کانٹے سے کھانا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا نہیں؟" فرمایا، "جائز کیوں نہیں، مگر دست و دہن کے درمیان اگر کوئی تیسری چیز حائل ہو جائے تو کھانے کا مزہ غارت ہو جاتا ہے۔" اب ایک لطیف سلسلۂ گفتگو چھڑ گیا جملوں اور ہلکی مسکراہٹوں کے ساتھ چل نکلا۔ مودودی صاحب نے باتوں باتوں میں کھانے سے متعلق ایک مکمل فلسفہ پیش کر دیا۔ خلاصہ یہ تھا کہ کھانے کا مزہ محض اُتنے تاثر کا نام نہیں جو ذائقہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس میں مختلف حسیات حصّہ لیتے ہیں۔ کھانے کا ایک رنگ اور اس کی ایک شکل ہوتی ہے جس سے آنکھیں بہرہ اندوز ہوتی ہیں، ایک خوشبو ہوتی ہے جس سے مشام متاثر ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ مل کر ذائقہ کی حس لُطف اندوز ہوتی ہے۔ کھانے میں لمس کا بھی ایک حصّہ ہے اور وہ ملتا جبھی ہے کہ انگلیاں براہِ راست مس کریں۔ چھُری کانٹے اور چمچے سے کھائیے تو لمس کا یہ حصّہ غارت ہو جاتا ہے۔

ذوقیات کے دائرے میں بہت سی چیزیں قابلِ ذکر ہیں، لیکن اس مضمون کے لیے اتنا ہی حصّہ کافی ہے۔

کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ آدمی کے ساتھ بس کر ہی اسے جانچا پرکھا جا سکتا ہے۔ خصوصیت سے لیڈروں، وزیروں، علماء، مصنفوں اور صحافیوں کو دور سے کبھی جانا ہی نہیں جا سکتا۔ کتابوں اور مقالوں، تصویروں اور بیانوں میں بالکل دوسرا آدمی جلوہ گر ہوتا ہے جو تمام محاسن و کمالات کا جامع معلوم ہوتا ہے۔ اصل آدمی ستر پردوں کے پیچھے بہت دور تاریکی میں چھپا دیکھ رہا ہوتا ہے کہ

دنیا کس طرح بے وقوف بن رہی ہے۔ شہرت شخصیت کا حجاب اکبر ہے۔ مولینا مودودی کے ساتھ ہم نے رہ بس کر دیکھا ہے۔ ان سطور میں یہی دکھانا مطلوب ہے کہ وہ رفقا کے درمیان کس طرح رہتے بستے اور گھلتے ملتے ہیں۔ مطالعۂ شخصیت کا یہی بہترین طریقہ ہے۔

اولین بات یہ ہے کہ مولانا مودودی اپنے ملنے والوں اور کسی طرح کا تعلق رکھنے والوں میں سے ایک ایک فرد کو پوری اہمیت دیتے ہیں۔ خصوصیت سے کام کرنے والے رفقا، چاہے وہ عمر، علم، منصب، کارکردگی اور دوسرے اوصاف کے لحاظ سے کسی بھی درجے کے ہوں، سب کے سب اُن کی نگاہ میں ایک ہی طرح کی دوستانہ اہمیت رکھتے ہیں اور ایک ہی طرح توجہ حاصل کرتے ہیں۔ اپنے ہر ملاقاتی اور اجتماعات میں شریک ہونے والے تمام ارکان جماعت پر وہ فرداً فرداً توجہ صرف کرتے رہے ہیں۔ اب چونکہ تعداد زیادہ ہو چکی ہے اور شرکائے اجتماع بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لیے وہ دورِ اوّل والی بات تو نہیں رہی، پھر بھی ہر ایک سے انفرادی ربط رکھنے کی کوشش مولینا ضرور کرتے ہیں۔ وہ تقریباً تمام ارکان جماعت کو فرداً فرداً نام اور شکل سے جانتے ہیں۔ بیشتر صورتوں میں ان کے ذہنی ارتقاء کے مراحل اور ان کے جماعتی احوال کو سمجھتے ہیں، خوبیوں اور کمزوریوں سے باخبر رہتے ہیں، مقامی جماعتوں کے حالات کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔ کئی کئی سال پہلے جن لوگوں کو کبھی ایک بار دیکھا تھا ان کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں اور اسی طرح گزشتہ سلسلۂ واقعات کو مستحضر کر لیتے ہیں۔ گردہ کے آپریشن کے بعد ان کا حافظہ اگرچہ متاثر ہوا ہے، اور اب کسی کسی موقع پر کوئی چیز یاد لانے کے لیے ان کو ذرا سی کاوش کرنی پڑتی ہے لیکن متعلقہ افراد کو اہمیت اور توجہ دینے کی خوبی جوں کی توں قائم ہے۔

ہر ایک کو اہمیت اور توجہ دینا خود پسندی، علیٰحدگی پسندی اور اپنی ذات میں سمٹے رہنے کی عادت کے بالکل نقیض ہے اور مولانا مودودی کی شخصیت کی

مستقل جاذبیت کا ایک سبب یہی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ ہر ایک کو اعتماد میں لیتے ہیں، شریک مشورت کرتے ہیں اور ذمہ داریاں سونپتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُنھوں نے ساتھیوں سے بات چھپانے کی کوشش کی ہو یا ان کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار کیا ہو۔ ہماری ہزاروں کوتاہیوں کے باوجود مودودی صاحب کی اس افتادِ مزاج میں کبھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ اُنھوں نے رفقاء کے درمیان کبھی اقرب اور ابعد کا امتیاز نہیں کیا۔ ایک کے خلاف دوسرے کے سامنے کسی طرح کا اظہارِ تکدر اور اظہارِ نفرت نہیں کیا۔ دارالاسلام کے دور سے لے کر اب تک ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب کبھی کسی سفر سے آمد ہوئی، کسی ملاقات اور گفتگو اور مشاورت سے فراغت ہوئی، کوئی اجلاسِ شوریٰ ختم ہوا، تو مولینا مودودی کے گرد رفقاء جمع ہو جاتے ہیں اور بے تکلفی سے باتیں پوچھتے اور باتیں سُنتے ہیں۔

مولینا مودودی بہ حیثیت امیر اگرچہ کارکنانِ مرکز اور باہر کے ماتحت اُمراء کے لیے نیز خاص طور پر دفتر ترجمان القرآن کے کارکنوں کے لیے "افسر" کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن برسوں کا تجربہ گواہ ہے کہ اُنھوں نے کبھی بھی افسرانہ اور تحکمانہ انداز سے نہ کوئی کام کسی کو سونپا ہے، نہ باز پرس کی ہے اور نہ بالادستی کے اظہار کے لیے اُس طرز سے نگرانی کی ہے۔ سارا معاملہ دوستانہ انداز سے چلتا ہے۔ اسی دوستانہ انداز کی چاٹ ہے کہ مولینا کے ساتھ رہ کر کام کرنے کا ہر کسی کو شوق رہتا ہے اور کوئی ان کا ساتھ چھوڑ کر جانے پر اس وقت تک آمادہ نہیں ہوتا جب تک جماعتی مصالح کا شدید تقاضا نہ ہو۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولینا مودودی کے ہاں ہر شخص کو خصوصیت سے رفقاء کو اختلاف اور تنقید کا پورا پورا حق حاصل رہتا ہے۔ عام اصطلاح کے لحاظ سے چھوٹے سے چھوٹا آدمی اُٹھے گا اور علیحدگی میں مولینا سے ملے گا اور رد و قدح بات کہہ دے گا جو اس کے ضمیر کی بات ہو۔ تنہائی تک ہی محدود

نہیں بلکہ عام مجالس گفتگو میں کوئی رفیق کسی بات پر کہہ دے گا کہ مجھے اس سے اختلاف ہے یا آپ کا نقطۂ نظر فلاں جماعتی اصول سے یا آپ ہی کے فلاں قول سے ٹکراتا ہے اور پھر اجتماع میں ——— رفقاء اُٹھ کر بے دھڑک سوالات کریں گے۔ اعتراضات سامنے لائیں گے اور اپنے اختلافات بیان کر دیں گے۔ جماعتی نظم میں اسلامی جمہوریت کا یہ پہلو بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے کسی بھی منصب پر آنے والا شخص ایک کڑے امتحان سے گزرتا ہے۔ چونکہ سب سے بڑا منصب مرکزی امارت کا ہے، لہٰذا مرکزی امیر پر معاملات و مسائل اور نزاعات کے بھاری بوجھ کے ساتھ تنقید کی اتنی بوچھاڑ رہتی ہے کہ پہاڑ کا سا عزم درکار ہے۔ تنقید کے حق کو اسلامی تقاضوں کے مطابق استعمال کرنے کی تربیت پاتے رہنے کے باوجود جماعت میں ہمیشہ ایسے نئے لوگ موجود رہتے ہیں (اور بعض دیرینہ ساتھی بھی اپنے مزاج کی وجہ سے ہمیشہ نئے رہتے ہیں) جو بے ڈھنگے پن سے تنقید کرتے ہیں، مگر مولینا مودودی اس بوچھاڑ کا مقابلہ تحمل اور شگفتگی کے ساتھ کرتے ہیں اور ڈانٹ ڈپٹ یا ترش روئی کا کبھی مظاہرہ نہیں کرتے۔ اُنھوں نے اسلامی اصول کے مطابق اپنی پوری زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح جماعت کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کے کسی بھی صفحے کی کسی بھی عبارت پر ہر رفیق کو اظہار رائے اور تنقید، بلکہ کہنا چاہیے کہ باز پرس کا حق حاصل ہے، چنانچہ جماعتی امور سے آگے نکل کر مولینا کے گھر اور ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت اور دوسرے شخصی معاملات تک پر متعدد بار لوگوں نے کھل کر گفتگوئیں کی ہیں۔ زندگی کو اس طرح سب کے سامنے رکھ دینا اور تنقید و اعتراض کا حق دے دینا کوئی آسان کام نہیں ہے جسے آسان معلوم ہو وہ اسے کر کے دیکھے۔ اس مقام تک شاید آج کوئی لیڈر اور عالمِ دین مشکل ہی سے رسائی رکھتا ہوگا اور رفقاء نے جس شخص کو بار بار اعتراضات کی چھلنیوں چھان کر اور تنقید کے چھاجوں پھٹک کر دیکھا ہے وہی اس کی صحیح قدر پہچانتے

ہیں۔ مولانا مودودی کو مصنوعی زندگی سے سخت گریز ہے۔ لباس وضع قطع اور دوسرے پہلوؤں میں مختلف لوگوں نے ان کو طرح طرح کے مشورے دیے ہیں، لجاجت سے اصرار کیا ہے لیکن مولینا نے کسی کو خوش کرنے کے لیے کبھی کوئی ایسی تبدیلی اپنے اندر نہیں کی جس کے لیے دین خود تقاضا نہ کرے اور ضمیر کے اندر جس کے لیے تحریک نہ ہو۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ آپ نوافل پڑھا کریں، بعض کو اصرار تھا کہ ڈاڑھی زیادہ لمبی رکھیں، بعض کا مشورہ تھا کہ سر کے بالوں کی ہیئت بدل دیں، بعض کا تقاضا رہا کہ اسلوب نگارش اور طرز گفتگو میں تبدیلیاں کریں، اور کچھ یہ چاہتے کہ لباس میں پیوند لگایا کریں۔ لیکن مولینا مودودی دوسروں پر اثر انداز ہونے کے لیے کبھی ادنیٰ سی ترمیم پر بھی کبھی راضی نہیں ہوئے۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی کسی عادت اور اپنے کسی معمول کو کبھی کسی سے اخفا میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ڈرامائی کردار بننے پر کبھی ایک لمحہ بھی تیار نہیں ہوئے۔

رفقاء کی عزت نفس کا مولینا کو ہمیشہ خاص خیال رہتا ہے۔ وہ ان کا پورا پورا احترام کرتے ہیں اور اسلامی آداب کے ساتھ ان سے مساویانہ معاملہ کرتے ہیں۔ اُنھوں نے کبھی کسی رفیق کو ملامت نہیں کی، بُرا بھلا نہیں کہا، غضب ناک ہو کر سخت گیرانہ معاملہ نہیں کیا۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی تربیت سے تغافل برتا ہے۔ تربیت ہمیشہ مدنظر رہی۔ بس اس کا منصوبہ جداگانہ نوعیت کا تھا۔ مولانا مودودی کے طریق تربیت کا ایک جزء تو یہی اعتماد میں لینا، احترام ملحوظ رکھنا ذمہ داریاں سونپنا اور دوستانہ سطح پر معاملہ کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کریم النفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر گرفت نہیں کرتے اور اہم ترکوتاہیوں پر وہ ایک خفیف سے اشارے یا بالواسطہ طنز کے ایک جملے کے ذریعے ہنستے مسکراتے احساس دلا دیتے ہیں۔ اس سے آگے کا معاملہ ہو تو بغیر کسی گرما گرمی کے پاس بٹھا

کر تفصیل سے بات سمجھا دیتے ہیں۔ اظہارِ ندامت پر فراخدلی سے معاف کرتے
رہتے ہیں۔ اگر کسی رفیق یا ملازم کی اصلاح سے لمبے تجربے کے بعد وہ بالکل
مایوس ہو جائیں ـــــ اور ایسی صورتیں پورے گزشتہ دور میں شاید دو ہی چار
پیش آئی ہیں ـــــ تو خوبصورتی سے معاملہ ختم کر دیتے ہیں مولینا مودودی کا
یہ طویل المیعاد طرزِ تربیت نتائج کے لحاظ سے بہت کامیاب رہا ہے۔ خصوصاً
انھوں نے اپنی بیگم صاحبہ کی زندگی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے، وہ حیرت ناک
ہے۔ ہماری یہ بہن ایسے خاندان سے آئیں جس میں مغربیت تیزی سے چھا رہی
تھی۔ مولینا مودودی کی والدہ مکرمہ کے اصرار سے یہ رابطہ قائم ہوا۔ شادی
کے بعد جب مولینا مودودی کے نظریات وعزائم زیادہ اچھی طرح واضح ہونے
لگے اور پھر جب وہ ایک ایسے راستے کی طرف مڑ گئے جو دنیوی کامرانیوں
کے باغ و بہار سے نہیں، بلکہ فقر و فاقہ کے خارزار سے ہو کر گزرتا تھا اور وہ
خارزار عملاً دارالاسلام کی بے رونق اور سادہ دیہاتی زندگی کی صورت میں بالکل
سامنے آ گیا تو ان محترم بہن کے سارے خواب درہم برہم ہونے لگے۔ وہ گویا
عیش و مسرت کی ایک دنیا سے ایثار و امتحان کی بالکل ایک دوسری دنیا میں منتقل
ہو گئیں۔ دل و دماغ میں جو ہل چل ایسے انقلاب سے ہونی چاہیے تھی وہ ہوئی۔
لیکن مولینا مودودی ٹھنڈے دل سے ایک ٹھنڈی اسکیم کے تحت ان کی دلجوئی
کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ کچھ درس سنتے سنتے، کچھ لٹریچر پڑھتے پڑھتے،
اور خاص ماحول میں رہتے سہتے آخر کار اپنی جگہ سے ہل گئیں۔ پھر جو وہ ایک
بار آگے بڑھیں تو ایسی جگہ آ پہنچیں کہ جہاں ان کے اندر ایک نئی شخصیت پیدا
ہو گئی۔ بالکل اسی طرح مولینا مودودی اپنے بچوں کو مارے اور برا بھلا کہے اور
بات بات پر ٹوکے بغیر مشفقانہ انداز میں تربیت دینا پسند کرتے ہیں۔ کبھی اچانک
کوئی حرکت کریں تو ایک آواز آئے گی ہاں ـــــ ہائیں ـــــ یاد رہے
ـــــ بس یہی مولینا مودودی کا عصائے تربیت ہے جسے وہ بچوں پر

استعمال کرتے ہیں۔

رفقاء نے ہمیشہ مولینا کی شخصیت سے درسِ عزیمت واستقلال لیا ہے۔ موقع بہ موقع مولینا ہی کی ذات نے ان کی ہمّت بندھائی ہے۔ ڈرپوک اور کمزور شخصیتیں اپنی کمزوری اپنے ساتھیوں میں منتقل کردیتی ہیں اور اسی طرح عزیمت واستقلال کے پیکر قریبی لوگوں پر بھی اپنے اس جوہر کا پرتو ڈال دیتے ہیں۔ دارالاسلام کے دورِ خطر میں مولینا مودودی آس پاس کی بستیوں کی فضا درست رکھنے کے لیے ہمارے گروپ مرتب کرکے بھجواتے تھے اور تاکید کرتے تھے کہ کوئی شخص ایک چھڑی اور ایک چاقو تک ساتھ لے کے نہ جائے کیونکہ مسلّح ہوکر امن وسلامتی کی دعوت دینا بے معنی ہے، اور ہم بے دھڑک علاقے میں گھوم آتے حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ نفرت وکدورت اور فتنہ وفساد کی بارود ہر آبادی کے نیچے بچھ رہی ہے جب دورِ فساد شروع ہوگیا تو اس عالم میں مولانا مودودی نے بہ نفسِ نفیس بستی کی حفاظت کے لیے فوجی نظام تجویز کیا اور بہترین منصوبہ بنایا۔ خود وہ اس نظام کے کمانڈر تھے اور تمام انتظامات میں حصّہ دار رہے۔

جن دنوں کشمیر کے نام پر ہمارے خلاف "جہادِ اکبر" لڑا جارہا تھا، لاہور کے ایک روزنامے نے (جسے جماعت اسلامی سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے) ایک زہریلا نوٹ لکھا اور جھوٹ کی کڑیاں ملا ملا کر فتویٰ دیا کہ یہ لوگ غدّار ہیں، میں تسنیم کے ادارے میں شریک تھا۔ مولینا سے مشورہ لینے گیا کہ اس پر تردیدی نوٹ لکھنا چاہیے۔ مولینا مزاحاً کہنے لگے تردیدی کیوں ـــــ صاف صاف کہیے کہ ہم اقراری مجرم ہیں ـــــ بس اتنے سے فقرے نے مجھے اور دوسرے شرکائے مجلس کو متاعِ عزم وہمت سے مالا مال کردیا اور اس وقت میرے ذہن میں ایک مصرع نمودار ہوا ـــــ "ہم لوگ اقراری مجرم ہیں!" ـــــ اگلی صبح تک نظم مکمل ہوگئی۔ پھر جب یہ ہنگامہ اور بڑھا اور جوابی کام کرنے کیلئے اخبارات کی طاقت بھی ہم سے چھین لی گئی تو طے پایا کہ شہر کے ہر حلقے میں جلسے کرکے

اپنی بات واضح کی جائے۔ سوال یہ تھا کہ ابتدا کس حصے سے کی جائے۔ مودودی صاحب کہنے لگے کہ سب سے پہلے "خطرناک ترین" موقع کو لیجیے، اور وہ موچی دروازہ تھا۔ ان کے اس مشورے نے جو خاص روح کارکنوں کے اندر پھونک دی اس کا آج تک ہمیں اندازہ ہے۔

اور پھانسی کی کوٹھڑی میں! ——— اعزہ و رفقا سے ملنے جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟ "جی ہاں! عینک کے خانے اور خلال کے چند تنکوں کی۔" یہ تھا اس شخص کا جواب جس کے لیے پھانسی کا پھندا تیار ہو رہا تھا۔ مولانا مودودی نے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں دریافت کرنے پر جو تین وجوہ آپ نے بیان فرمائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اگر میرے جیسے آدمی نے بھی جان بچانے کے لیے رحم کی اپیلیں کرنا پسند کر لیا تو پھر اس ملک میں غیرت و حمیت کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔

اور جب فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا ——— مولانا کے وکیل نے ایک راہ یہ سجھائی کہ آپ "تسنیم" کے شائع کردہ بیان کو اپنانے سے انکار کر دیں، لیکن مولانا کی سیرت نے اس مشورہ کو مسترد کر دیا اور جب عدالت میں پوچھا گیا تو آپ نے کسی قدر زور دے کر کہا کہ "ہاں یہ پورا بیان میرا ہے"!

مولانا اپنے رفقا کے درمیان اس سادہ زندگی کی وجہ سے بھی محبوب ہیں جو ان کا تعلق مساویانہ اخوت کی بنیادوں پر جوڑتی ہے۔ ان کا لباس ہمیشہ سادہ رہا اور بسا اوقات تو ان کے کرتے اور پاجامے پر خوبصورتی اور مہارت سے لگے ہوئے باریک پیوند بھی ہم نے دیکھے ہیں۔ لیکن یہ نمائش فقر سے ہمیشہ خالی پائے گئے۔ ان کے ہاں کے کھانے بار بار کھانے کا موقع ملا اور دعوتوں میں شرکت کی، لیکن کھانا ہمیشہ سادہ پایا۔ دفتر میں میز کرسی ہمیشہ رہے، لیکن صوفوں اور قالینوں کو کبھی بار نہ مل سکا۔ کبھی کوئی ماما یا کوئی بچہ گھر میں ملازم رہتا ہے، لیکن تمام کاموں کے لیے نوکروں کا بیڑا کبھی بھرتی نہیں ہوا۔ اس سبب سے

مولٰینا مودودی کو دن میں کئی کئی بار خود ہی اُٹھ کے گھر جانا پڑتا ہے، اور بچے دروازے پر دستک دے کر بلوا دیتے رہتے ہیں۔ مولٰینا مودودی اپنے ہاتھ سے بہت سارے کام کر لیتے ہیں اور ایسے کاموں کی فہرست بہت دلچسپ ہے مگر تفصیل کا موقع نہیں۔ یہ سادہ زندگی ان کے لیے رفقاء سے مساویانہ رابطہ رکھنے کو آسان بناتی ہے —— دارالاسلام میں ہر روز شام کو کبھی کرسیوں پر، کبھی چٹائیوں پر اور کبھی کنارِ جُو چبوتروں اور گھاس پر تکلف برطرف کر کے برادرانہ محفل جمتی اور مولٰینا مودودی اس میں "یکے از ما" بن کر بیٹھتے۔ رات کو اجتماعی کھانا ہوتا اور گوناگوں کھانے یکجا ہو جاتے اور باہم دگر "دست درازیاں" ہوتیں۔ اجتماعی کھانے کی روحِ رواں ہمیشہ مودودی صاحب رہے۔ وہ نہ ہوتے تو کھانا پھیکا ہو جاتا۔ اب لاہور میں صرف عید کے موقع پر اس اجتماعی کھانے کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔

اجتماعات کی صورت میں کئی برس تک مولٰینا ایک عام رکن کی طرح قیام و طعام کے عام انتظام میں حصہ دار ہوتے۔ فرش پر سوتے اور سب کے ساتھ مل کر رہتے۔ اب گُردوں کے آپریشن کے بعد ان کی کمزوری کا لحاظ کر کے ان کے رفقاء نے پرہیزی کھانے کا انتظام شروع کیا ہے اور ان کو اجتماع گاہ میں قیام گاہ کا ایک گوشہ الگ کر کے دے دیا جاتا ہے تاکہ وہاں وہ ضروری امور کے لیے سوچ سکیں، تقریر کی تیاری کر سکیں اور آرام لے سکیں، مگر آرام کہاں! اسی طرح وہ سفر میں جب بھی رفقاء کے ساتھ جاتے ہیں تو اسی درجے میں سفر کرتے ہیں جس میں سب کے لیے سفر کرنا ممکن ہو —— اور یہ تیسرا درجہ ہی ہو سکتا ہے۔ دونوں کل پاکستان اجتماعات (۱۹۵۱ء، ۱۹۵۵ء) میں کراچی تشریف لے گئے تو اسی آخری درجے میں سفر کیا۔ کسی ایک موقع پر کہیں ان سے کسی ملاقاتی کی جانب سے سوال کیا گیا کہ "ہیں! آپ اور تھرڈ کلاس میں؟" فرمایا "اگر چوتھا درجہ ہوتا تو اسی میں سفر کرتا"

اندازہ کر لیجیے کہ یہ کیسی شخصیت ہے اور اس کے ساتھ اس کے رفقاء

کی وابستگی کس نوعیت کی ہو گی!

ہاں ——— اس سادہ زندگی کے پس منظر میں وہ ایثار کام کر رہا ہے جو اس زمانے میں اپنی مثال آپ ہے۔ جب اپنا نصب العین معین کر کے آپ فرض کے راستے پر چل پڑے تو بار بار ایسے مواقع آئے کہ ترجمان القرآن سے کبھی ایک حلقہ کے خریدار ٹوٹ جاتے، کبھی دوسرے حلقہ کے۔ لیکن مودودی کے ایمان نے اس ٹوٹ پھوٹ کی کبھی پروا نہیں کی۔ آخر میں مسلم لیگی حلقوں کے ناراض ہونے کا تو رسالہ کی خریداری پر نمایاں اثر پڑا۔ مگر حق کا وہ سپاہی اپنے موقف سے نہیں سرکا۔ حالات کی اس گردش میں بار بار مولینا مودودی فقر و فاقہ کی بالکل سرحد پر پہنچتے رہے ہیں اور دوسری طرف تن تنہا بہت ساری ذمہ داریاں اٹھانے کی وجہ سے رات کو دو دو بجے تک بیٹھ کر کام کرنے کے عادی رہے ہیں۔ ترجمان کے مقالات کے مجموعے کتابی شکل میں آئے اور دوسری کتابیں شائع ہوئیں تو یہ لٹریچر حد درجہ مقبول ہوا اور کئی کئی ایڈیشن اب تک نکلے ہیں۔ آمدنی کا یہ جائز اور وسیع ذریعہ تھا اور اس سے مولینا مودودی اپنے مالی حالت کو ہمیشہ کے لیے مضبوط بنا سکتے تھے، لیکن انھوں نے یہ کتابیں تحریک کے لیے وقف کر دیں۔ اس وقت دو چار کتابوں کے علاوہ باقی کئی کتابیں جن کی تعداد پچاس ساٹھ کے قریب ہو گی، سب جماعت اسلامی کی ملک ہیں۔ اس ایثار کے ساتھ دوسرا ایثار یہ تھا کہ جماعت اور تحریک کے عائد کردہ مختلف فرائض کا بار شروع سے بلا معاوضہ اٹھایا۔

حالانکہ یہ شرعاً اور اخلاقاً ناجائز نہیں تھا کہ مولینا اپنا پورا وقت دیتے ہوئے بقدر کفالت جماعت سے معاوضہ یا کم سے کم وظیفہ لیتے۔ اس کے لیے اصرار بھی کیا گیا، لیکن وہ قرض اٹھا اٹھا کر تو کام چلاتے رہے، یہ صورت بالکل قبول نہیں کی۔

سوچیے کہ ہمارے پاس کتنی ایک مثالیں ایسی موجود ہیں!

اس موضوع کے سلسلے میں ضروری ہے کہ مولانا مودودی کا پارٹ مجلس شوریٰ میں دکھایا جائے جو بیرونی دنیا کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے۔

مودودی صاحب ہمیشہ مقررہ وقت پر پہلے سے "ایوان" (جو بیشتر ان کا دفتر ہی ہوتا ہے) میں موجود رہتے ہیں۔ لوگ آتے اور بیٹھتے جاتے ہیں۔ ماحول بڑا سنجیدہ ہو جاتا ہے، سابق کارروائی سنائی جاتی ہے، ایجنڈا پڑھا جاتا ہے اور اکثر اوقات تمام ارکان شوریٰ باری باری اپنے علاقوں کے تحریکی حالات کے بارے میں معلومات پیش کرتے ہیں۔ پھر مسائل پر بحث شروع ہوتی ہے۔ مولینا مودودی بحث کے دوران میں "نقطہ ہائے نظر" کو سمجھنے کے موڈ میں پُرسکون طریق سے بیٹھے رہتے ہیں۔ ابتدائی عام بحث کے بعد آہستہ آہستہ دو یا زیادہ اختلافی آرا متعین شکل میں سامنے آجاتی ہیں اور ضرورت ہو تو ان کو مولینا مودودی بصیرت مندانہ تجزیہ کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اب ان آرا کے حق میں مختلف افراد (جو کبھی مستقل گروہ بندیوں کی شکل اختیار نہیں کرتے) انفرادی طور پر استدلال کرتے ہیں۔ بحث اگر انضباط سے ذرا اِدھر اُدھر ہو تو مولینا ٹھنڈے انداز سے از سر نو تجزیہ کر کے اسے پھر راہ راست پر ڈال دیتے ہیں۔ اگر لوگ زیادہ بولنے لگیں تو کسی کسی موقع پر یکایک مولانا اُٹھیں گے اور مُسکرا کر کہیں گے "اچھا، حضرات! آپ بحث جاری رکھیے، میں ذرا ڈبیہ بھوا لے آؤں" اس پر اکثر چہرے مُسکرا اُٹھتے ہیں اور لطیف ترین انداز کی اس "تنبیہ" کو سمجھ کر بحثیلے پن کا از خود سدِ باب کر لیتے ہیں۔ مولینا مودودی نہ تو اس دوران میں اپنی رائے کو سامنے لاتے ہیں اور نہ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ پہلے سے وہ کوئی چیز طے کیے بیٹھے ہیں جسے منوانا چاہتے ہیں۔ واقعی صورت ہوتی بھی یہی ہے کہ وہ دوسروں کی بحث سے بہت کچھ اخذ کر کے وہیں کے وہیں اپنی رائے کو آخری شکل دیتے ہیں۔ اپنے منصب کے زور سے اُنھوں نے کبھی کسی بات کو نہ پیش کیا ہے، نہ منوایا ہے۔ وہ اگر کوئی نقطۂ نظر رکھتے ہوں تو وہ بحث کے

بعد کسی موقع پر دل نشین انداز میں دلائل د وجوہ کے ساتھ اسے پیش کر دیتے ہیں۔ پھر کچھ وہ اپنے رفقائے شوریٰ سے اخذ کرتے ہیں اور کچھ ان کا نقطۂ نظر قبول کیا جاتا ہے۔ اس طرح لین دین سے متفقہ فیصلے طے پاتے ہیں۔ دو یا تین اختلافی رجحانات کے درمیان جب بحث بہت طول کھینچ جاتی ہے تو مولانا مودودی ان کے مابین نقطۂ اعتدال پیدا کر کے اس خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں کہ بحث کا طوفان چھٹ چھٹا جاتا ہے۔ شوریٰ کی تاریخ میں گنتی کے واقع ایسے آئے ہیں جن پر رائے شماری سے فیصلہ ہوا ہو، ورنہ عمومی معمول بلکہ روایت یہ ہے کہ باہمی افہام و تفہیم کے بعد اتفاق رائے اور اطمینانِ قلب و ذہن کے ساتھ ہی معاملات طے پاتے ہیں۔ مجلس شوریٰ میں مولٰنا مودودی کا ایک اہم پارٹ یہ رہتا ہے کہ جب بھی بحث کی فضا بوجھل ہونے لگتی ہے تو وہ ایک تبسم انگیز فقرے سے اس کو ہلکا پھلکا بنا دیتے ہیں۔ یہ حقیقت باہر کے لوگوں کو معلوم نہیں ہوگی کہ ہمارے ہاں اگرچہ تمام مسائل پر ارکانِ شوریٰ باہم بھی اور امیر جماعت سے بھی گفتگوئیں کرتے رہتے ہیں، لیکن "ایوان" کے باہر نہ امیر کی طرف سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ پہلے سے اپنے ہم خیال تیار کر کے لائے اور نہ ارکانِ شوریٰ علیحدگی میں امیر کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ یہ سارا کام ایوان کے اندر ہی ہوتا ہے۔ اس سبب سے نہ گروہ بندی پیدا ہوتی ہے، نہ سازشیں! ——— اور ہر فرد یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ تمام کارروائی میں برابر کا حصہ دار ہے اور اس کی رائے ویسی ہی قیمتی اور اس کا استدلال ویسا ہی اہم ہے جیسے کسی اور کا، اور خود امیر کا!

ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص میرے مطالعۂ شخصیت میں اچھے ہی اچھے پہلو دیکھ کر مجھ پر قصیدہ گوئی کا الزام رکھے۔ میں کسی کو روک نہیں سکتا، مگر اتنا حسنِ ظن اپنے آپ سے ضرور رکھتا ہوں کہ قصیدہ گوئی کے لیے میرا مزاج بنایا ہی نہیں گیا۔ مگر دوسری طرف میرا مزاج یہ بھی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کا تکلف کر کے کچھ

ٹیڑھ کسی کے اندر نکالوں۔ مودودی صاحب کی شخصیت کا مجموعی ڈھانچہ بہت ہی صاف ستھرا اور نفیس ہے اور اس میں کوئی بنیادی اور اہم قسم کی کوتاہی یا فساد موجود نہیں ہے۔ یوں وہ انسان ہیں، رائے قائم کرنے، فیصلے دینے، معاملات کو سمجھنے اور تدابیر اختیار کرنے میں غلطیاں کرتے ہیں ہم سب ایسی غلطیوں پر ان سے بحث بھی کرتے ہیں اور اگر ہمارے دلائل مضبوط ہوں تو مولینا مودودی قائل ہو کر تبدیلی بھی قبول کرتے ہیں، لیکن جہاں تک اُن کے اخلاق و کردار کی ساخت کا تعلق ہے اس میں کوئی رخنہ تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی ہے۔ کمزوریاں ان میں ہوں گی مگر آخر تحریک کی بھٹی میں پڑکر اپنے رفقاء کے ساتھ ساتھ خود مودودی صاحب بھی تو تپتے ہیں اور وہ تو ہم سب سے پہلے (۳۲-۱۹۳۰ء میں) اپنی اس سلگائی ہوئی بھٹی میں از خود پڑے تھے اور اس میں تپتے ہوئے ان کو آج ۲۵، ۲۶ سال ہو چکے ہیں ———

میں اپنے ضمیر کے سامنے بہر حال مطمئن ہوں کہ میں نے عقیدت مندی کے رنگ سے نہیں بلکہ یہ تصویر واقعیت اور حقیقت کے رنگ سے مرتب کی ہے ——

اور اتنی اچھی تصویر سامنے ہونے کے باوجود میں کہتا ہوں کہ مودودی ہرگز کوئی فرشتہ نہیں، وہ معصوم نہیں، وہ انسان ہے اور غلطیاں کوتاہیاں اور کمزوریاں رکھنے والا انسان ہے۔

اہلِ دل و نظر ہر چند کہ خلوت پسند بھی ہوتے ہیں، مگر جلوت بھی اُن پر لازم ہو جاتی ہے۔ وہ ایک طرف بے ہمہ بھی ہوتے ہیں، دُوسری طرف با ہمہ بھی۔ ایک قدم باطن کے غارِ حرا میں، دُوسرا ظاہر کے کوہِ صفا پر! آگے کا اشارہ ہو تو وادیٔ قبا بھی ہے اور اس سے آگے مرحلۂ کدا بھی! (مکہ کا ایک میدانی حصہ جہاں فتح مکہ کے وقت ایک جھڑپ ہوئی)

آج کے دَور میں دُنیا بھر کے مسلم معاشروں کی نوجوان تو تیں اسلامی انقلاب کے عَلَم ہائے تحریک اُٹھائے اگر صف در صف موجوں کی طرح اُمڈ رہی ہیں تو اس میں ایک بڑا حصہ اُس خادم ملت بیضا کا بھی ہے جسے لوگوں نے جتنا گھٹانا چاہا وہ اتنا ہی بڑھتا گیا۔

اس کا حوصلہ دیکھیے کہ برسوں کی دل ہلا دینے والی تحریروں کے پھیلے ہوئے دائرۂ اثر کو دیکھ کر جب پکارا کہ لوگو! آؤ کہ دھارے کے ہلاکت انگیز رُخ کو بدل ڈالیں تو ۱۹۴۱ء میں صرف ۵ آدمی لبیک کہنے والے تھے۔ پھر اُس نے ۱۹۴۱ء میں دعوت دی تو ۷۵ افراد آگے بڑھے اور اُس نے ۷۵ افراد کے ایک مختصر دستے کو لے کر طاغوتی قوتوں سے جہاد شروع کر دیا اور آج پاکستان میں لاکھوں اور پاکستان سے باہر کروڑوں افراد اس کی ایک ایک نگاہ کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔

عشق بلاخیز کے قافلۂ سخت جاں کا یہ سید پیش رَو ہے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، جو اہلِ تصوّف کے مشہور خانوادۂ چشت کے چمنستان کا ایک پھول ہے!

مولانا مودودی نے اسلام کے بُنیادی حقائق اور اس کے نظام دستور و تہذیب کے ہر پہلو کو واضح کرنے کے لیے عظیم الشان تصنیفی و تحقیقی کام کیا، جو ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے لیے تنہا نشینی لازم تھی، مگر اُنھوں نے انسانوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو پوری طرح کتابوں کے حوالے کرنے سے انکار کیا۔

بلاشبہ ہزاروں آدمی اُن سے ملے ہوں گے اور لاکھوں افراد نے اُن کی تقاریر سُنی ہوں گی، بے شمار جماعتی شوراؤں اور مشاورتوں میں اُنھوں نے شرکت کی ہوگی، مگر ان رابطوں کے باوجود ایک کمی ایسی رہ جاتی ہے جس کے لیے محفل آرائی ضروری ہوتی، کوئی نہ کوئی نشست ایسی بھی ہونی چاہیے جس میں ایجنڈے کے بغیر باتیں ہوں، ہر درجے کا ہر شخص اپنی بات کہہ سکے اور ہر طرح کے موضوعات پر قدرے ہلکی پھلکی گفتگو ہو سکے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ اس طرح کی محفل آرائی کرتے تھے، ایسی مجالس میں نو وارد بھی آتے، منافقین بھی ہوتے اور کبھی یہودی بھی پہنچ جاتے، کتنی ہی شکائتیں اور کتنی ہی حکائتیں لوگ بیان کرتے اور کتنی ہی عنائتیں ہو جاتیں۔ بعد میں ائمہ و علماء کے گرد لوگوں کو ہم جمع ہوتے دیکھتے ہیں۔ قریبی دور میں نظر ڈالیے تو حکیم اجمل خاں، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عطا اللہ شاہ بخاری کے گرد محفلیں جمع ہو جاتیں۔ ڈاکٹر اقبال کا معاملہ تو عجب تھا، ایک مجلس مسلسل جاری رہتی۔ بوڑھے اور نوجوان، علما اور عامی، جدید اور قدیم،

ملکی اور غیر ملکی سب طرح کے لوگ آرہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ علی بخش چلم تیار کرتا رہتا ہے اور اقبال اپنے سننے والوں کی ضرورت کے مطابق ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف اور پھر تیسرے اور چوتھے بحث کی طرف جا رہے ہیں۔ فلسفے کی باتیں، دین کی باتیں، شاعری کی باتیں، لطیفے، شہر کے قصے، کھانوں کا تذکرہ، بیماریوں اور دواؤں کا قصہ۔ غرضیکہ ان محفلوں کی گفتگو ایک گلدستۂ گل و گلاب ہوتی۔

مولانا مودودی جب دارالاسلام (پٹھان کوٹ) میں آکر مقیم ہوئے تو وہاں شام کی محفل کا سلسلہ چلا۔ عصر کے بعد درسِ حدیث ہوتا اور مغرب کے بعد مجلس عام!

اس مجلس کے مستقل شرکا تو مقیمینِ دارالاسلام ہوتے ــــــــ صدرالدین اصلاحی، عبدالجبار غازی[۱] (روسی ترکستان کے مہاجر) اعظم ہاشمی (مرحوم)، حافظ عطاءالرحمٰن (مرحوم)، سید عبدالعزیز شرقی صاحب، چراغ دین صاحب، راجہ احسان الحق صاحب، حافظ عظمت اللہ صاحب، نقی علی صاحب مرحوم، ملک غلام علی صاحب، محمد یحییٰ صاحب، محمد حامد صاحب، میاں طفیل محمد صاحب، سید مراد علی صاحب، اور بعد میں مولانا امین احسن صاحب بھی آگئے۔ اور پھر تربیت و تفہیم کے لیے عارضی قیام کرنے والے مہمان، جیسے سید صبغۃ اللہ بختیاری، جنوبی ہند کے محمد علی صاحب، دلتا کم کے شیخ محمد عبداللہ صاحب[۲]، نجات اللہ صدیقی صاحب، ابوالعرفان (مرحوم) بھی باعثِ رونق ہوتے۔ مزید برآں ایک دو دن کے لیے آنے والے مہمان ہوتے جن کی فہرست بیان کرنا مشکل ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی[۳] آکر دو چار روز ٹھہرتے تو مجلس کی اہمیت و دلچسپی بڑھ جاتی۔ کبھی ملک نصراللہ خان عزیز، کبھی عبدالحمید صدیقی[۴]، کبھی صفدر حسن صدیقی، کبھی عبدالمجید قریشی چکر لگاتے۔ اسی طرح سردار اجمل لغاری اور امین لغاری، چودھری علی احمد خاں[۵] اور زمان محمد باقر خاں[۶]، چودھری محمد اکبر[۷] (سیالکوٹ والے)، چودھری محمد اشرف خاں، خان سردار علی خاں[۸] اور سردار محمد اکبر[۹] (ڈھوک سرفا والے) بھی آتے۔ نقی نواب، محمد شفیع دہلوی، عبدالوحید خاں اور اُن کے برادر اکبر[۱۰] کا جانا بھی یاد ہے۔ ایک بار ایس۔ آر۔ صوفی[۱۱] جب ریلوے کے افسر تھے تو اُن کا ریلوے سیلون سرنا اسٹیشن پر جا کر لگا تھا، وہیں انہوں نے مع خاندان ایک آدھ دن قیام کیا۔ ایک دن غلام احمد پرویز جنجوعہ سے بعد میں سنت کی تشریعی حیثیت پر معرکہ چھیڑا، تشریف

---

[۱] [۲] [۳] [۴] [۵] [۶] [۷] [۸] [۹] [۱۰] [۱۱] یہ سب حضرات وفات پا چکے ہیں۔ خدا مغفرت کرے۔

سے لے گئے۔ اسی طرح دارالاسلام کی محفلِ شام میں قادیانی مبلغین نے بھی ہم پر "تبلیغ" کی۔ جرمن نومسلم اسد صاحب، چودھری نیاز علی خاں مرحوم اور ان کے بھائی بھی کبھی کبھار اس محفل میں آتے (یہ دونوں حضرات بیشتر دن کو آیا کرتے تھے)

سارے نام ذہن میں یکایک تازہ ہو بھی نہیں رہے اور اس مقام پر سب کا اندراج ممکن بھی نہیں۔ اس محفل میں مرکزی موضوع تو مولانا کی پیش کردہ تحریکِ اقامتِ دین اور اس وقت کی حکومت اور سیاسی تحریکات اور مذہبی ادارات سے عہدہ برآ ہونے کا ہوتا، پھر خود تصورِ اسلام اور نظامِ اسلامی کی روح اور صحیح اسلامی سوسائٹی کے خدوخال پر گفتگو ہوتی رہتی، نیز اس دعوت کو پھیلانے اور اس کے لیے مردانِ کار تیار کرنے سے متعلق مسائل چھڑتے، لیکن باہر سے آنے والے مخالفین اپنے اعتراضات اٹھاتے، حامیان اپنی مشکلات بیان کرتے، کارکنان اپنی الجھنوں اور پیچیدگیوں کے حل جاننا چاہتے، کام کی کچھ نئی تجاویز تدابیر زیرِ بحث آئیں اور ان امور پر سارے شرکائے محفل کچھ نہ کچھ حصہ لیتے۔ مولانا بحیثیت داعیٔ اوّل اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے، پھر کچھ باتیں متفرق ہوتیں، مثلاً پٹھانکوٹ کا کوئی قصہ، قریبی آبادی میں کسی جرم کی تفصیل، چودھری نیاز علی کے قلعے (قیام گاہ) کا کوئی تذکرہ، جنگِ عالمگیر کے تازہ احوال، پھر لطیفہ گوئی، قصہ بیانی، اسلاف یا اکابرِ وقت کے واقعات کا ذکر، آبادی کے کسی مریض کے متعلق گفتگو، گرانی ارزانی کا بیان ــــــ اور کیا کیا کچھ!

پھر عشاء کی نماز ہوتی، کھانا بھی کبھی کبھی اجتماعی ہوتا۔ کبھی تو عشاء کے بعد بھی محفل جاری رہتی۔ سو جیسے یہ محفل اچھا خاصا ایک تربیتی مدرسہ تھی۔ تفریح کی تفریح اور تفہیم کی تفہیم!

اب کئی سال سے ۵۔اے ذیلدار پارک (مولانا کی اقامت گاہ) میں نمازِ عصر کے بعد محفل آرائی ہوتی ہے۔ حالات کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ بھی بدل گیا ہے، مگر طرز وہی ہے۔ نوجوان طلبہ اور نووارد مہمان (مالی اور دماغی لحاظ سے مختلف سطحوں کے) جن میں کچھ مخالف بھی ہوتے ہیں، مولانا کے گرد جمع ہوتے جاتے ہیں اور جس کے سامنے جو بات ہوتی ہے وہ کہتا ہے اور جواب پا لیتا ہے۔ یہاں بھی موضوعات کی رنگا رنگی ہے۔ سیاسی

حالات بھی سامنے آتے ہیں، دینی حقائق اور فقہی مسائل بھی اور سائنس و فلسفہ جیسے موضوعات بھی چھڑ جاتے ہیں اور کچھ عام قسم کی سرسری باتیں بھی۔ مولانا اب بھی لطیفہ گوئی کرتے ہیں اور نہیں تو کسی کی بات سُن کر اس سے لطیفہ پیدا کر لیں گے۔ جو حضرات مولانا کے حالات کو سمجھتے ہیں انھیں اندازہ ہے کہ اس وقت عمر و صحت کے جس مرحلے سے مولانا گزر رہے ہیں اس میں یہ اللہ کا کرم ہے کہ وہ چند گھنٹے پڑھنے لکھنے کا کام کر لیتے ہیں۔ سیرت کی کتاب کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اس کے بعد کچھ اور کام شروع ہو جائے گا۔ بیچ میں چھوٹے چھوٹے متفرق کام بھی آ جاتے ہیں، ترجمان القرآن کے مواد پر بھی نظر رکھتے ہیں، پڑھنا بھی ہوتا ہے، خاص رپورٹیں اور معلومات بھی اُن کے سامنے دنیا بھر سے آتی ہیں۔ کچھ بین الاقوامی ملاقاتی اور کچھ پاکستان کے لوگ، جماعت کے لیڈر بھی اور بیرونی کارکن بھی مولینا سے خصوصی وقت لیتے ہیں۔ خط و کتابت کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ اس حالت میں اگر ہر شخص مولانا کے کام یا آرام کے اوقات میں ملنے کی کوشش کرے تو ان کی صحت متاثر ہوگی یا کام متاثر ہوگا۔ سمجھ دار حضرات اخفاء میں بات کرنے کے اہم مسئلوں کے استثنیٰ کے ساتھ، مولانا کے قیمتی وقت سے خواہ مخواہ حصہ نہیں لیتے۔ محض شوقِ زیارت و ملاقات یا رسمی بات چیت کے لیے اُن کا وقت لینے کے معنی یہ ہیں کہ دین و ملت کے لیے دعوت کے جو برگ و بار اُن کے دماغ سے حاصل ہو رہے ہیں اُن میں کمی ہو جائے۔ وہ جس کام میں مصروف ہوتے ہیں وہ ہمارا ہی کام ہوتا ہے اور ہمارے ہی لیے ہوتا ہے، ہر شخص اگر اس طرح کرے تو کام بھی ٹھپ اور صحت کی کشتی بھی گرداب میں! پس ذی شعور حضرات عصر کی محفلِ عام میں شرکت ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کچھ وہ لوگ ہوتے ہیں جو مولانا کو دیکھنا چاہتے ہیں یا فیضِ نگاہ کے طالب ہوتے ہیں اُن کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اور کچھ اپنی بات کہنا چاہتے ہیں یا مولانا سے چند کلمات سُننا چاہتے ہیں یا دُعا کرانا چاہتے ہیں، اُن کا مدّعا بھی پورا ہو جاتا ہے۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ قربتِ دیرینہ اور ربطِ مستقل رکھنے اور قریب رہنے کے باوجود خصوصی وقت ․ ․ تو بھی چند لمحات کسی ضروری کام کیلئے) دس دس پندرہ پندرہ دن بعد ہی لیتا ہوں۔

یہ سعادت کچھ کم ہے کہ وقت کے ایک ذی مرتبہ ذی وجاہت خادم دین کے ساتھ نماز میں شمولیت کی جائے اور اس کی محفل میں چند لمحے گزار لیے جائیں۔ اس سے آگے تو پھر پرستش کا دائرہ ہی رہ جاتا ہے۔ سو دجال پرستی کے فتنے سے بچانے کے لیے مولانا جیسے علمبردارِ توحید نے بھرپور کام کیا ہے۔ اس کام کی قدر بھی ہونی چاہیے اور اس کے تقاضوں کو سمجھنا بھی چاہیے۔

مجھے اس بات کی بڑی مسرت ہے کہ چوہتر سال کے ایک بزرگ جواں ہمت کے گرد زیادہ تر نوجوانوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک تو پاکستان میں اٹھنے والی پہلی نسل "نوجوان لیگاڈ" ہنگاموں کے باوجود دین کی محبت سے مالامال ہے۔ دوسرے یہ کہ "جنریشن گیپ" کا جو فتنہ انگیز تصوّر مغرب سے ہمارے معاشرے میں درآمد ہوا ہے، وہ اسلام سے محبت رکھنے والے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں کو زیر و زبر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ تصوّر سیدھا قرآن کے معیارِ قیادت سے ٹکراتا ہے جس نے بیشتر انبیاء ــــــ خصوصاً نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر دعوت و قیادت کا بار چالیس سال کی عمر میں ڈالا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ قیادت چالیس سے تریسٹھ سال تک پھیلا ہوا ہے۔

ایمان ــــــ اور خصوصاً شعوری ایمان ــــــ جن لوگوں میں کارفرما ہوتا ہے اُن کا تصوّرِ شباب و شیب ہی بدل جاتا ہے۔ اہلِ ایمان میں جوان ہر وہ شخص ہے جو باطل کی قوتوں کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہو، ــــــ جوان وہ ہے جو راستے کو مشکل یا طویل دیکھ کر کنی نہ کاٹ جائے اور اپنے مقصد اور پروگرام ہی میں ردو بدل نہ کر دے، جوان وہ ہے جو عمر اور صحت کے ہر مرحلے میں جتنی قوتِ کار سے جو کام راہِ حق میں لے سکتا ہو، عزیمت کے ساتھ اسے سرانجام دے۔ اس طرح بوڑھا ہر وہ شخص ہے جو طاغوت کا زور دیکھ کر خم کھا جائے۔ جو وقت کے غلط رجحانات کے دباؤ کو سہار نہ سکے اور اُن کی رَو میں بہنے لگے اور جو مالی حالت، عمر، صحت یا کسی بھی طرح کی مشکلات کے باعث جتنا اور جیسا کچھ حصہ خدا کے دین کے لیے ادا کر سکتا ہو، اتنے سے بھی ہمت ہار دے۔

یہ ہے معیارِ شیب و شباب ——— خواہ کسی کی عمر کچھ ہی کیوں نہ ہو! کتنے ہی نوجوان
ہیں جو درحقیقت بوڑھے ہیں اور کتنے ہی بوڑھے ہیں جو حقیقت میں جوان مجاہد ہیں، کتنے
ہی صحت مند مریض اور کتنے ہی مریض تندرست و توانا ہیں، کتنے ہی دولت مند قلاش اور
کتنے ہی مفلس غنی ہیں۔ جسم کا بڑھاپا، جسم کی بیماری، جسم کی مجبوریاں الگ شے ہیں۔ یہ تو ان
کا "ٹول باکس" ہے۔ ہتھیار کند یا شکستہ ہو سکتے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ انسان کی روح یا
شخصیت بوڑھی یا بیمار یا کند یا شکستہ یا مجبور ہوتی ہے یا نہیں۔ روح توانا ہے تو جسم کی
معذوریاں اس رعنائی و برنائی میں فرق نہیں لا سکتیں۔ سو مبارک ہیں عمر کے وہ نوجوان، جو
دل کے ایک "جوانِ توانا" سے نئی ایمانی و روحانی قوت حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ مولانا
سے ماضی قریب ہی میں کسی نے کہا کہ اب تو آپ بوڑھے ہیں! مولانا نے تنک کر تردید
کی کہ "میں بوڑھا ہرگز نہیں ہوں"! واہ، کیا بات کہی، اور کس انداز سے کہی!

بالعموم اس طرح کی عام محفلوں کی متفرق گفتگوؤں کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا کیوں کہ
بہت سی باتیں وقتی حالات سے متعلق ہوتی ہیں اور بعد کے حالات میں ان کا صحیح مفہوم
واضح نہیں ہوتا، لیکن مجھے بڑی مسرت ہے کہ ریکارڈ رکھا جا رہا ہے۔ بڑی تحسین کے مستحق
ہیں اس محفل کا ریکارڈ رکھ کر اسے مرتب کرنے، اور شائع کرنے والے نوجوان!

مودودی کی شخصیت کا یہ مطالعہ و تجزیہ ختم کرتے ہوئے میں علی سفیان آفاقی
کے چار لفظوں کو دہراتا ہوں کہ "مولانا مودودی کی زندگی اس اعتبار سے دلچسپ
ہے کہ وہ ایک انسان کی زندگی ہے" (ابوالاعلیٰ مودودی) اور ان الفاظ ہی کی
روشنی میں تعصب کی ان دیواروں پر ماتم کرنا چاہتا ہوں جن کو لوگوں نے خود
اپنے اور مودودی کے درمیان کھڑا کر رکھا ہے اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے والوں
کو اذن دے رکھا ہے کہ ان دیواروں پر نت نیا پلستر لیپتے رہیں۔ مودودی صاحب
سے جسے اختلاف ہو وہ اختلاف کرے، جو ان کے مذہبی تصورات کو غلط سمجھتا ہو
وہ اپنا کلامی اور فقہی نقطۂ نظر پورے زور سے سامنے لائے اور جسے ان کے
سیاسی پروگرام سے بعد ہو وہ سیاسی دائرے میں ان کا پورا مقابلہ کرے،

مگر وہ اپنی نوعیت کے "انسان" اور ایک تاریخی شخصیت ہونے کے لحاظ سے ساری ملت کی متاع ہیں بلکہ انسانی دنیا کے بنیادی سرمایۂ شخصیت و کردار کا ایک جزو! ـــــــ اور ان کی ذات میں علم اور عمل کے کچھ نہ کچھ ایسے پہلو موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کی ہمیں ضرورت ہے۔ انہی پہلوؤں تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ نکالنے کے لیے ان کا مطالعۂ شخصیت مفید ہے، ورنہ محض ایک شخص جس کا نام ابوالاعلیٰ مودودی ہے کسی دوسرے سے قابلِ ترجیح نہیں ہے۔ ٥٥ (ماہنامہ نقوش، شخصیات نمبر حصہ دوم۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

---

# ایک انقلابی مفکّر

"زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" کے الفاظ میں انسانی کردار کا جو آئیڈیل اقبالؒ نے پیش کیا تھا اسے واقعی انسانی پیکر میں دیکھنے کی تمنائے بے تاب مدت تک حسرتِ ناکام رہی۔ اس مصرع کو ہزاروں نوجوانوں کی طرح میں نے بھی برسوں گنگنایا ہے، لیکن اپنے گرد و پیش دنیا وہ دیکھی جس کے چیدہ اور نامور ترین افراد کو "حدیثِ بے خبراں"، یہ کار بند پایا۔ بالآخر اقبال کا وہ آئیڈیل گوشت پوست کے ایک پیکر میں ملا جو تن تنہا اپنے فکر و عمل کا سرمایہ لے کر میدان میں نکلتا ہے اور یہ عزم کر کے نکلتا ہے کہ کوئی میرے پیچھے آئے یا نہ آئے مجھے بہر حال ایک متعین نصب العین کی طرف ایک مقررہ راستے سے قدم بہ قدم بڑھتے جانا ہے اور پھر واقعی وہ پوری شانِ یکتائی کے ساتھ ترجمان القرآن کا ایک ٹمٹماتا دیا لیے ناسازگار حالات کی تاریکیوں میں مخالفتوں کے جھکڑوں میں، غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے بگولوں میں کئی سال رواں دواں رہتا ہے، اپنی منزل کا سراغ خود لگاتا ہے، اپنا راستہ آپ بناتا ہے، اس راستے پر سنگِ میل خود نصب کرتا ہے، پھر اکا دکا مسافر رفیقِ راہ بنتے ہیں اُن سے وہ پہلے ہی قدم پر کہہ دیتا ہے کہ جسے میرے ساتھ چلنا ہو وہ پہلے سے منزل کی دوری، راستے کی صعوبت اور ہم کے مرد آزما ہونے کا پورا پورا اندازہ کر کے چلے، جسے بھی پیشِ نظر مقصد کی سرزمین پر میرے ساتھ قدم رکھنا ہو وہ واپسی کی کشتیاں جلا کے آئے، جو آگے کو قدم اٹھائے وہ یہ طے کر کے اٹھائے کہ آگے بڑھا ہوا قدم واپس نہیں لیا جا سکتا!

چنانچہ کچھ ساتھی چلتے ہیں، کچھ تھوڑی دور جا کر ہمت ہار دیتے ہیں، کچھ نئے ہم سفر آ ملتے ہیں، مگر وہ کٹنے والوں اور جڑنے والوں سے بے نیاز ہو کر اپنی ایک ہی دھن میں، ایک ہی چال سے، ایک ہی رُخ پر گامزن رہتا ہے، آہستہ آہستہ ایک

کارواں کا کارواں اس کے جلو میں متحرک نظر آتا ہے۔ یہ شخص جو دنیا بھر پر چھائی ہوئی عالمگیر فکر اور مشرق و مغرب کے ایک ایک چپے پر کوس لمن الملک بجانیوالی جاہلی تہذیب کو چیلنج کرنے کے لیئے ایک دن اس طرح بے یار و مددگار اور بے ذریعہ و وسیلہ آگے بڑھتا ہے اور زمانے کی طاقتوں کو بالآخر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کی دعوت کو وزن دیں۔ یہی ہے مودودی! ——— "با زمانہ ستیز" کی زندہ تصویر!!

آیئے اس کردار کو خود اس کے اپنے لفظوں میں پڑھیں "ترجمان القرآن" کا ساتواں سال شروع ہونے پر اس کا جو اداریہ مارچ ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا تھا، اس کا ایک حصہ یہ ہے:

"۔۔۔ یہ تمنائیں دل میں پال رہا ہوں اور چھ برس سے اپنے جسم کی ساری طاقتیں انہیں حاصل کرنے کے لیئے خرچ کر رہا ہوں، مگر بدقسمتی سے اکیلا اور تنہا ہوں۔ میری طاقت محدود ہے، وسائل مفقود ہیں، اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں کر سکتا۔ ساتھ دینے والوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں مگر وہ کمیاب ہیں۔ کروڑوں مسلمانوں کی اس بستی میں اپنے آپ کو اجنبی اور غریب پاتا ہوں۔ جس جنون میں مبتلا ہوں اس کا مجنون مجھے کہیں نہیں ملتا۔ برسوں سے جن لوگوں تک اپنے خیالات پہنچا تا رہا ہوں اُن کے بھی جب قریب جاتا ہوں تو وہ مجھ سے دور نظر آتے ہیں۔ اُن کی دھن میری دھن سے الگ، ان کی گرویدگی کے مرکز میرے مرکزِ گرویدگی سے جدا، اُن کی روح میری روح سے ناآشنا، اُن کے کان میری زبان سے بیگانہ۔ یہ دنیا کوئی اور دُنیا ہے جس سے میری فطرت مانوس نہیں، جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور جن نظریات، جن جذبات، جن اغراض و مقاصد اور جن اصولوں کی بنا پر ہو رہا ہے سب کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے پر میں مجبور ہوں۔ میں اس کے اجزاء میں سے بعض کا باغی اور بعض کا

حامی نہیں ہوں، بلکہ کل کا باغی ہوں۔ میں ترمیم کا خواہشمند نہیں ہوں بلکہ موجودہ زندگی کی پوری عمارت کو توڑ ڈالنا چاہتا ہوں اور اس کی جگہ خالص اسلامی اصولوں پر دوسری عمارت بنانے کا خواہاں ہوں۔ اس کلی وہمہ گیر بغاوت میں کوئی مجھے اپنا ساتھی نہیں ملتا ہر طرف مجھے جزوی باغی ہی ملتے ہیں جو اس بت خانے کے کسی نہ کسی بت سے لو لگائے بیٹھے ہیں، ہر ایک کا مطالبہ یہ ہے کہ سب بتوں کو توڑ دو مگر میرے بت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھنا۔ ایسی حالت میں ناگزیر ہے کہ جزئی باغی کسی نہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر مجھ سے الگ ہو جائیں۔ میرا ساتھ صرف کلی باغی ہی دے سکتے ہیں اور وہ کم یاب ہیں۔ جب تک وہ نہ ملیں، اپنے محدود وسائل اور اپنی محدود طاقت سے محدود پیمانہ پر میں تنہا جو کچھ کر سکتا ہوں وہی کرتا رہوں گا۔"

میں کہتا ہوں کہ اگر ذہن و کردار کا مطالعہ کرنے والی کوئی مردم شناس نگاہ مودودی کے بارے میں ان الفاظ کے سوا اور کوئی چیز نہ پائے تو محض اس ایک اقتباس سے اس کی شخصیت کا مقام دریافت کیا جا سکتا ہے، اس کے کیرکٹر کی تصویر مرتب کی جا سکتی ہے، اس کی نفسیاتی ساخت کا تخمینہ تیار کیا جا سکتا ہے، اور اپنے دور کی تاریخ میں اس کا مرتبہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

مودودی ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنے کسی نفسیاتی مرض کے زیر اثر اپنے لیے سب سے الگ ایک راستہ نکالتے ہیں، جن کا احساس کہتری یہ رد عمل دکھاتا ہے کہ وہ بڑا بننے کے درپے رہتے ہیں، جن میں "خود امتیازی" (Self Importance) کا ایک طوفان موجزن رہتا ہے اور وہ ان کو وقت اور معاشرے اور ماحول کے خلاف ضد م ضدا میں مبتلا کر دیتا ہے اور جو دوسروں پر اپنی "ذات" کو مجبور کرنے کی مختلف تدبیریں اختیار کرتے رہتے ہیں، یا جو اپنے لیے شخصیت گر (Personality Builder) بن کر ہر میدان میں تماشائے فرد واحد (One Man Show) دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ شخص نفسیاتی لحاظ سے معیاری

صحت و توازن کا ایک نایاب نمونہ ہے اور اس کا سارا جہاد ایک ایسے اصول آئیڈیل اور آئیڈیالوجی کے لیے ہے جس کے فکری و عملی تقاضوں کی تکمیل اس نے اپنے ذہن کو کبھی قرار نہیں دیا۔ وہ اپنی ذات کی تعمیر میں نہیں، تاریخ کی تعمیر میں مصروف ہے۔

مودودی کی شخصیت پر قلم اُٹھانے کا حق مجھے پہنچتا ہے لیکن میرے لیے سب سے بڑی پیچیدگی یہ اندیشہ ہے کہ میں شخصیت کے ساتھ گہری محبت رکھنے والوں، اس سے ہر طرح کا استفادہ کرنے والوں اور اس کی مشفقانہ رفاقت میں برسوں سے کام کرنے والوں میں سے ایک فرد ہوں، اس لیے اگر میں کچھ لکھوں گا تو چاہے وہ مبالغہ سے کتنا ہی پاک اور قصیدہ آرائی سے کتنا ہی بالاتر کیوں نہ ہو اس پر "مریداں می پرانند" کا فقرہ بآسانی چست کیا جا سکتا ہے، مگر جب واقعہ یہ ہے کہ نہ یہاں کوئی "پیر" ہے جو "مریدوں" کی بے پر کی اڑائی ہوئی باتوں کے بل پر اڑنے کا آرزو مند ہو، اور نہ کوئی مرید ہیں جو کسی بے بال و پر "پیر" کو اڑانے کے درپے ہوں، تو سوچتا ہوں کہ آخر میں کیوں دین و ملت، زبان و ادب اور تاریخ کی ایک ایسی خدمت انجام دینے سے باز رہوں جس کے بارے میں میں سمجھتا ہوں کہ اپنی استطاعت کی حد تک اسے ادا کر سکتا ہوں۔ یہ شخص جو منبر سے دار تک کے ہر مرحلے سے گزر گیا ہے اور جس کا نام لاکھوں افراد کی زبان پر ہے۔ لوگ اسے جاننا بھی چاہتے ہیں کہ یہ کون ہے، کیا ہے! اس سوال کا جواب اگر اسے جانتے والے — قریب سے جاننے والے ... برسوں ساتھ رہ کر جاننے والے بھی نہ دیں گے تو اور کون دے گا۔ لوگ اس کے متعلق متضاد باتیں سنتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کا بے مثل مفکر ہے اور وہ ایک رجعت پسند ملّا ہے! وہ موجودہ نظام کو بدل ڈالنے کے لیے زور کر رہا ہے اور وہ جاگیرداروں کا حامی ہے! وہ اسلامی دستور چاہتا ہے اور وہ ملک کا غدار ہے! وہ امریکی ایڈ کا مخالف ہے اور وہ امریکہ سے خفیہ ایڈ حاصل کر رہا ہے .... ان متضاد باتوں کے درمیان لوگ کھڑے ہو کر یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ پھر آخر اصل حقیقت کیا ہے! مان لینا چاہیے کہ مودودی صاحب

جیسے افراد کے ساتھ ہمیشہ ہی ہوتا ہے، وہ سب سے زیادہ معروف ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ نامعلوم! وہ سب سے زیادہ قریب بھی ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ دُور بھی! وہ سب سے بڑھ کر آشنا بھی ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اجنبی بھی! وہ انسانیت کے اوّل درجہ کے خادم ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ پہلے درجے کے مجرموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ایسے افراد کو اس مظلومی سے پوری طرح تو بچایا جا نہیں سکتا، تاہم ان کو جاننے پہچاننے والوں کا فرض ہوتا ہے کہ نہ جاننے والوں کو صحیح معلومات بہم پہنچائیں۔

میں ان سطور کو لکھتے وقت اس نتنہ سے پوری طرح خبردار ہوں جسے شخصیت پرستی (Hero-Worship) کہا جاتا ہے، لیکن کوئی بھی شخص جو پورے شعور کے ساتھ ایک مرتبہ خدا پرستی اختیار کر لیتا ہے، وہ پھر کبھی کسی "پرستی" میں مبتلا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے جذباتِ عبودیت کے لیئے ایک ہی بارگاہ پالی ہے اور اب اس پر میرا ایک سجدہ مجھے ہزاروں سجدوں سے نجات دلا دیتا ہے۔ دوسرے خود مولینا مودُودی کی تعلیم و تربیت سے جو چیزیں ان کے ساتھیوں اور ان کے قدر دانوں اور ان کے محبت کرنے والوں میں نمایاں طور پہ پیدا ہو جاتی ہیں ان میں سے ایک یہی ہے کہ شخصیت پرستی[1] کی پستی سے آدمی بسا بلند ہو جاتا ہے۔

تیسری اہم حقیقت یہ ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اقبالؒ کے پیغام کی روشنی میں اقدام کرتے کرتے مودُودی تک آ پہنچے ہیں اور جنھوں نے مودودی سے اوّلین تعارف ہوتے ہی محسوس کیا کہ شاید وہ "دگر دانائے راز" بھی ہو جس

---

[1] میں نے اور میری طرح کے بہت سے اور لوگوں نے مولینا مودُودی کے مقابلے میں اپنے نظریات کی سرزمین کے ایک ایک چپے پہ دفاعی جنگ لڑی ہے اور ایسے ہی لوگوں کو خود مولینا مودُودی نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہم لوگوں نے شعبدے اور کرامات دیکھ کر بیعت نہیں کر لی، بلکہ جو کچھ مانا ہے عقل واستدلال کے معرکے لڑ کر مانا ہے اور آئندہ بھی ہم سے جو کچھ منوایا جا سکتا ہے اسی طرح منوایا جا سکتا ہے۔

کے نمودار ہونے کی دلی حسرت لیے اقبالؒ کے لبوں پر آخری گھڑیوں میں آئی اور جس کے لیے اس نے دُعا کی تھی کہ ؎

اگر می آید آں دانائے رازے
بدہ اُورا نوائے دل گدازے
ضمیرِ اُمتاں را می کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

اقبالؒ کے چشمۂ فکر سے پوری طرح سیراب ہو جانے کے بعد کوئی شخص مشکل ہی سے شخصیت پرست ہو سکتا ہے [1]

میری دوسری مشکل یہ ہے کہ مولینا مودودی کی شخصیت پر مجھ جیسا قریبی آدمی اگر چند سرسری تاثرات دے کر رہ جائے تو اس سے بڑی مایوسی ہو گی، لیکن اگر میں مطالعۂ شخصیت کا حق ادا کرنا چاہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جس شخصیت سے ردعمل کی کئی دنیائیں پے در پے ظہور پذیر ہو رہی ہوں،

---

[1] اقبال جیسا حقیقت شناس آدمی تاریخ اور معاشرۂ انسانی کے قوانین کی روشنی میں خوب سمجھتا تھا کہ جس شعور کی شعاعیں میں نے ماحول میں بکھیر دی ہیں اور جن جذبات کو میں نے چھیڑ دیا ہے، اب علمی میدان میں ایک تحریک کی شکل اختیار کیے بغیر نہیں رہ سکتے، اور اس تحریک کے لیے کوئی نہ کوئی شخصیت ایک پیغامِ انقلاب لے کے اُٹھے گی؛ چنانچہ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ اقبالؒ مرحوم اپنے آخری ایام میں نوجوان نسل کو پیشِ نظر نصب العین کے لیے تیار کرنے کی جو اسکیم رکھتے تھے اس کے لیے واحد رفیقِ کار جو انھوں نے منتخب کیا وہ مولینا مودودی تھے اقبال ہی کے بلاوے پر مولینا پنجاب آئے، مگر اُدھر خود اقبالؒ کو عالمِ جاودیت سے بلاوا آ پہنچا۔

جس نے زندگی کے ہر مسئلے اور ہر موضوع پر بے شمار نشتر میدان میں ڈال دیا ہو، جس نے ایک ہمہ گیر تحریک تعمیر اٹھا کھڑی کی ہو، اس کا مطالعہ کس گوشے سے کس طرح شروع کر کے کس پہلو پر جا کر کس طرح ختم کیا جائے۔ پھر اس کام کے لیئے بڑا وقت چاہیئے جو مجھے میسّر نہیں۔ بہت سوچا، بہت سوچا آخر یہ ٹھانی کہ جس موقع پر جتنا کام ممکن ہو اتنا کر دینا چاہیے اور بقیہ کو آئندہ کے لیئے اُٹھا رکھنا چاہیے۔ سو اب :

ع سامنے مہماں کے جو کچھ تھا میسّر رکھ دیا !

## بڑے آدمی

بڑے آدمی کون ہوتے ہیں ؟ ان کی تعریف کیا ہے ؟ اس سوال کے مختلف جواب سوچے جا سکتے ہیں، مگر تمام ممکن جوابات کا اگر کوئی جوہر نکالا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ہر وہ فردِ انسانی جو انسانیت کو خیال اور عمل کے کسی بھی دائرے میں اپنے پاس سے کچھ دے کے جاتا ہے، جو زندگی کو نئی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں سے آراستہ کرتا ہے، جو تاریخ کی شاہراہ پر نئے نقوشِ قدم بناتا اور نئے چراغ روشن کرتا ہے، بڑے آدمیوں کی صف میں شامل ہے۔ جو لوگ دوسروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انسانیت کے پچھلے کارناموں سے نفع اندوز ہوتے ہیں، لیکن جواب میں انسانیت کی کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے اُلٹا اسے چرکے لگانے میں عمریں گزار دیتے ہیں (اور ایسے لوگ مجرموں سے لے کر وزیروں، لیڈروں، صحافیوں اور ادیبوں تک کی صفوں میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں) وہ بنی نوعِ انسان کا سب سے ذلیل اور گھٹیا عنصر ہوتے ہیں۔ اُن سے اوپر دوسرا عنصر آتا ہے جو جتنا فائدہ انسانی کارناموں سے اٹھاتا ہے اپنی صلاحیتوں کی حد تک اس کے جواب میں زندگی کی قابلِ قدر خدمات سرانجام دینے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ خال خال پائے جانے

والے افراد ہمارے سامنے آتے ہیں جو جتنا کچھ لیتے ہیں اُس سے کئی گنا زیادہ بڑے کے جاتے ہیں، اور وہ کچھ دے کے جاتے ہیں جو ہر آدمی کے پاس نہیں پایا جاتا۔ انہی کو ہم بڑے لوگ کہتے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مولینا مودودی کی شخصیت کا ایک نمایاں مقام اسی آخری قسم کے خال خال پائے جانے والے افراد کی صف میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو مجھ سے اختلاف ہو، وہ اپنے اختلاف پر قائم رہ سکتے ہیں۔ میں اپنی رائے دوسروں سے منوانے کے لیئے یہ سطور نہیں لکھ رہا، نہ میری زندگی کے مشن کا یہ کوئی جزء ہے کہ میں مودودی کی عظمت دوسرں سے تسلیم کراؤں!

مودودی میرے نزدیک ویسا ہی گوشت پوست کا ایک متحرک پیکر ہے جیسے پیکر اس کرۂ ارضی پر اربوں کی تعداد میں زندگی کی راہ پر رینگ رہے ہیں میں اسے کوئی فوق الانسانی مخلوق نہیں سمجھتا، میں اسے ایک معصوم اور بے عیب ہستی نہیں مانتا، میں اسے تنقید سے بالاتر تسلیم نہیں کرتا، میں اسے یہ حق نہیں دیتا کہ وہ میری خودی کا خراج مجھ سے سکے۔ میں اس کے سامنے اختلافِ رائے کے فطری حق سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا، میں اسے ایک بُت بنا کر پوجنے پر تیار نہیں ہوں، بلکہ وہ میرے ذہن میں بُت بن کر رہنا چاہے تو میں اسے ایک آن میں چور چور کر کے رکھ دوں، البتہ میں اس کا احترام کرتا ہوں، اُس کی عزت میرے دل میں ہے، میں اس سے محبت رکھتا ہوں، کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے پاس کچھ نہ کچھ ایسا ہے ..... بہت کچھ ایسا ہے ..... جو میرے پاس نہیں ہے، وہ میں نے اس سے لیا ہے اور اس سے لینا ہے، وہ مجھے کسی اور سے نہیں مل سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پاس وہ کچھ ہے جو میرے ملک کو، میری قوم کو، میرے معاشرے کو، اور کرۂ ارضی پر بسنے والی میری محبوب انسانی برادری کو اس سے لینا ہے۔ بس یہی چیز ایک بڑے آدمی کی علامت ہوتی ہے، اور یہی

دوسروں کو مجبور کر دیتی ہے کہ اسے بڑا آدمی مانیں۔ اور یہی چیز ہوتی ہے جس کے لیے بڑے آدمیوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جاتا ہے، ان کی شخصیتوں کو کریدا جاتا ہے، ان کی تحریروں کو چھانا پھٹکا جاتا ہے، ان کے کارناموں کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ بڑے لوگوں سے ہماری کوئی دلچسپی ہے تو صرف یہ ہے کہ کیا کیا استفادہ ہم اُن سے کر سکتے ہیں، ان کی سیرت اور ان کے کارنامۂ حیات میں ہمارے لیئے کیا ہے، انسانیت کے لیئے کیا ہے، زندگی کے لیے کیا ہے؟ وہ ہمارے امن و مسرت کے خزانہ میں کیا دے سکتے ہیں، وہ ہماری ترقی میں کیا مدد بہم پہنچاتے ہیں، وہ ہماری قوتوں میں کونسا اضافہ کرتے ہیں۔ اس مدعا سے ہٹ کر محض اکابر پرستی (Hero-Worship) کے گھٹیا ذوق کی تسکین میں جا پڑنا دنیا کے فضول ترین کاموں میں سے ہے۔

البتہ صاف بات یہ ہے کہ میں کسی کی غلط فہمی کے اندیشے سے مودودی کے متعلق اپنے گہرے اور حقیقی تاثرات کو مصنوعی جھوٹے انکسار کے خزاف پر چھیل کر پیش نہیں کر سکتا۔

## اس شخصیت کا عنوان

مودودی کی شخصیت کو اگر ہم کوئی عنوان دینا چاہیں تو اس میں بڑی مشکل پیش آتی ہے، وہ بیک وقت ایک اونچا مصنف، ایک ادیب، ایک عالم دین، ایک ماہر تنظیم، ایک انقلاب پسند داعی، اور ایک سیاسی لیڈر ہے، تاہم میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہم اسے ایک انقلابی مفکر ..... (Revolutionary Thinker) قرار دے کر اس کی خدمات کے بہت سارے پہلوؤں کو ایک عنوان کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔

تھوڑا بہت سوچنا ہر انسان ہے مگر ہر سوچنے والے کو مفکر نہیں کہہ سکتے، مصنف ہمارے اندر بے شمار ہیں مگر ہر مصنف کو ہم مفکرانہ بلندی پر نہیں رکھ سکتے، لیڈروں کی ہمارے

درمیان کمی نہیں ، مگر ہر لیڈر کے ذہن سے کسی جامع فکر کے جھرنے نہیں پھوٹتے ۔ کسی دور اور کسی ملک و قوم کے حالات میں مفکرانہ عظمت تک صرف وہ لوگ پہنچ سکتے ہیں جو سوچنے کی عامیانہ اور رٹی ہوئی راہوں کی غلامی سے آزاد ہو کر ایک خاص اصولی و مقصدی نقطۂ آغاز سے چلتے ہیں ، اور اپنی سمتِ سفر اپنے اصول و مقصد کے کمپاس کے ذریعے متعین کر کے سوچنے کی نئی راہیں کھول دیتے ہیں ۔ بنے ہوئے حالات کے فریم میں اپنے ذہن کو نصب رکھ کر ہر آدمی سوچتا ہے ، لیکن یہ سوچنا سوسائٹی اور انسانیت کو کچھ نہیں دے سکتا ۔ بنے ہوئے حالات کے فریم کو توڑ کر ان حالات کا ناقدانہ جائزہ کسی خاص درجے کی ذہنی بلندی سے لیتے ہوئے سوچنا وہ سوچنا ہوتا ہے جو فکر و عمل کی نئی دنیا میں بنا کے انسانیت کے سامنے رکھتا ہے ، اور یہی سوچنا ہے جو کسی سوچنے والے کو مفکرانہ مقام پر لا کھڑا کرتا ہے ۔ مولینا مودودی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہوں نے بنے بنائے حالات کے اندر اپنے آپ کو رکھ کر سوچا ہو اور یہ سوچا ہو کہ ان حالات میں بہتر سے بہتر جگہ کیسے بنائی جا سکتی ہے ۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو ماحول کے سکہ بند قدری پیمانوں ، خیر و شر کی تقسیم کے معیاروں اور فکر و نظر کے زاویوں پر اندھا ایمان لا کر اپنی ذہنی قوتوں کو حرکت میں لاتے ہیں ، اور اپنے سارے کارنامے اس اہتمام سے سرانجام دیتے ہیں کہ وہ ان پیمانوں ، معیاروں اور زاویوں کے لحاظ سے قابلِ قدر ٹھہریں ۔ مولینا مودودی اپنے ماحول ، اپنے معاشرے اور اپنے گرد چھائے ہوئے حالات کے لکڑی قفس کا ، اس کی تیلیوں کا اور اس کے اندر پھڑپھڑانے والے طیورِ پر شکستہ کا جائزہ لیتے ہیں ۔ ان کا آزادانہ فکر ایک بجلی بن کر اس قفس کو پھونک ڈالنے کے لیے چمکتا ہے ۔ ان کا فکر طیورِ پر شکستہ کو نئے بال و پر دینا چاہتا ہے ۔ وہ قفس کی جگہ ایک نیا شاداب چمن آراستہ کر دینا چاہتا ہے ۔ مولینا مودودی ماحول کے سکہ بند پیمانوں ، تاریخ کے مہر کردہ اداروں اور

معاشرہ کے بنائے ہوئے فرسودہ زاویوں پر ایمان لانے سے انکار کر کے سوچتے ہیں، وہ ان کے بالمقابل دوسرے پیمانے، دوسرے معیار اور دوسرے زاویے رائج کرنے کے لیئے سوچتے ہیں۔ اس طرح جب کبھی کوئی شخص بنی بنائی دنیا کو قبول کرنے سے انکار کر کے ایک نئی دنیا کا نقشہ سوچنے لگ جاتا ہے تو اسے ہم انقلابی مفکر قرار دیتے ہیں۔

## مربوط اور جامع فکر

### مولانا مودودی کا مفکرانہ کارنامہ کیا ہے؟

زندگی کے مختلف اجزاء کو الگ الگ رکھتے ہوئے، ان میں سے کسی ایک، دو چار کے متعلق ہر ذہین آدمی سوچتا ہے اور بڑے کام کی باتیں سوچ لیتا ہے جن سے زندگی مستفید ہوتی ہے۔ بے شمار جج، وکلا، صحافی، شعرا، ادیب، مصنف، اساتذہ فلسفی اور لیڈر ہر معاشرے میں اسی طرح کی فکری خدمات انجام دے کر ذریعۂ ترقی بنتے رہتے ہیں، لیکن زندگی کو ایک کل کی حیثیت سے سامنے رکھ کر سوچنا، اس کے تمام کے تمام اجزا کو مربوط صورت میں اکائی قرار دے کر سوچنا، اس کے ہر پہلو کو اس شعور سے سوچنا کہ یہ دوسرے پہلوؤں پر اثر ڈال کر اور ان سے اثر لے کر کام کر رہا ہے یہ ہر ذہین آدمی کا کام نہیں ہوتا۔ اس کارنامے کے لیے بڑی ہمہ گیر نگاہ درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے زندگی کی وسعتوں کا احاطہ کر لینے والا ذہن مطلوب ہوتا ہے، اس کے لیے آدمی کے علم کا پیٹا سمندر کا سا ہونا چاہیے۔ مولانا مودودی کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک مسئلے اور کسی ایک پہلو پر محدودیتِ نظر کے ساتھ غور نہیں کرتے؛ بلکہ وہ کسی جزئی مسئلے پر بھی لکھتے یا بولتے ہیں تو اسے ہمیشہ کل کے اندر رکھ کر سوچتے ہیں۔ انسانی زندگی کی ایک جامع اسکیم کا فریم ان کے پاس ہے جس میں کسی مسئلے کی ٹھیک جگہ متعین کرنے کے بعد ہی وہ اظہارِ رائے کرتے ہیں۔ انہیں کہیں بھی جزئی مسائل کی فکر نہیں ہوتی، ہمیشہ اپنی

جامع اسکیم کے فریم کی سلامتی کا وہ خیال رکھتے ہیں. متفرق چیزوں پر سوچنا اور متفرق خیالات دے جانا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ بڑا کارنامہ ہمیشہ ایسے سوچنے والوں کا ہوتا ہے جو نظریہ وفکر کا ایک ننھا بیج لیتے ہیں، اس سے ایک کونپل پھوٹتی ہے، وہ تنا بنتی ہے، تنے سے شاخیں نمودار ہوتی ہیں، شاخوں سے پتے، پھول اور پھل ظہور پانے لگتے ہیں. یوں وہ ہتھیلی پر جو باغ کا باغ "جما" لیتے ہیں اس کی کسی چھوٹی سے چھوٹی کونپل اور کسی حقیر سی پتی پر بھی آپ اُن کے خیالات کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے سارے باغ کو سامنے رکھ کر اس کونپل اور اس پتی پر رائے ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ وہ ہوتے ہیں جو کہیں سے کوئی ٹہنی توڑ لاتے ہیں، کہیں سے کچھ پتیاں اکٹھی کر لیتے ہیں، کہیں سے دو چار پھول حاصل کر لیتے ہیں اور ان سب کو اکٹھا کر کے ایک فکری گلدان میں سجا دیتے ہیں۔ ٹہنی سرو کی ہے تو پتیاں سرس کی اور پھول نرگس کے! اب وہ اپنے گلدستہ کے ایک ایک جزء پر خیالات ..... اور قیمتی خیالات ..... کا بڑا قیمتی یادگاری سرمایہ چھوڑ جائیں گے، مگر زندگی کوئی گلدستہ تو ہے نہیں، زندگی تو ایک مربوط شئے ہے وہ جڑ سے لے کر کونپل تک ایک ہی مجموعی وجود رکھتی ہے۔ اسے بدلو گے تو پورا بدلو گے، قائم رکھو گے تو مجموعی طور پر قائم رکھو گے. کسی درخت کی جڑیں، کسی کا تنا، کسی کی شاخیں، کسی کے پھول پتے جمع کر کے تم زندگی کا ایک نیا درخت نہیں اُگا سکتے۔ نیا درخت تو ہمیشہ کسی نئے نظریے سے اُگے گا جو اپنا سب کچھ اپنے ساتھ لے کر آئے گا. ٹھیک اسی طرح مودودی کی فکر ایک نظریہ سے اُگ کر اپنے تنے پر کھڑے ہونے والے، اپنی شاخیں اپنے اندر سے نکالنے والے، اپنی کونپلیں اور پھل پھول اپنے فطری تقاضوں کے مطابق خود بہم پہنچانے والے اور اپنی ہی جڑوں سے غذا حاصل کرنے والے ایک مکمل درخت کی سی ہے۔ درخت! ..... زندگی کا درخت! .......... اسلامی زندگی کا درخت!!!

مودودی کے وسیع لٹریچر کے مطالعہ کو نکلیے تو آدمی حیرت میں ڈوب جاتا

ہے کہ ایک آدمی، اتنا زیادہ مصروف آدمی، پچاس کی عمر میں اتنا ٹھوس، علمی اور معیاری لٹریچر اتنی ضخامت کے ساتھ کس طرح مرتب کر ڈالتا ہے۔ یہ لٹریچر اسلام کے بارے میں ایک انسائیکلوپیڈیائی علم کا مظہر ہے، مگر صرف لٹریچر کی وسعت اور ضخامت ہی حیران کن نہیں، اور زیادہ تعجب میں ڈالنے والا وہ غیر معمولی تنوع ہے جو بحث و فکر کے موضوعات میں پایا جاتا ہے۔ عقاید اور نظریات اخلاق اور سیرت، قانون اور دستور، سیاست اور معیشت، معاشرے اور تمدن، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ، نظامِ تعلیم اور کلچر، ادب اور آرٹ، فقہ اور قضا، سرمایہ داری اور اشتراکیت، تھیاکریسی اور سیکولر ڈیموکریسی، نیشنلزم، سود اور بنکنگ، مالیات اور تجارت اور سیاست کے وقتی مسائل اور دوسرے بے شمار موضوعات پر نہ صرف معلومات بلکہ ان کے ساتھ اجتہادی نقطۂ نظر، اجتہادی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ ایک جذبۂ انقلابیت، پڑھنے والوں کو مودودی کے ہاں سے ملتا ہے۔ سب سے بڑا کمال یہ کہ زندگی کے مختلف شعبوں، پہلوؤں، موضوعات اور مسئلوں پر ہزاروں صفحات کا یہ لٹریچر جس فکر کو سامنے لاتا ہے وہ ایک ہی نظریے کے سرچشمے سے ظہور پاتی ہے۔ تمام کی تمام متفرق بحثیں ایک ہی جڑ سے پھوٹتی ہیں، ایک ہی مقصد ہر جگہ بول رہا ہے، ایک ہی آئیڈیالوجی کی روشنی ہر جگہ پھیلتی نظر آتی ہے۔ اس دفتر کے دفتر کا شیرازہ ایک ہی طرزِ فکر نے باندھ رکھا ہے۔ یہ ہے وہ وجہ عظمت جس نے مودودی کو ایک امتیازی درجے کا مفکر بنا دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس طرز کا کوئی مفکر ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سے اب تک پیدا ہوا ہے۔ ہمارے دور کا یہ مفکر پوری کائنات کو ایک منظم واحد ادارے کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور اس کے اندر فطرتِ انسانی کی ایسی جگہ تجویز کرتا ہے کہ کائناتی کُل کے ساتھ بالکل ہم آہنگ رہے۔ پھر انسان کی پوری کی پوری نوعی تاریخ کو وہ بسا اوقات سوچتے وقت اس طرح سامنے رکھ لیتا ہے جس طرح جغرافیہ کا ایک معلّم کرۂ ارضی کے ماڈل کو اپنی میز پر رکھ لیتا ہے

اس ہزار ہا سالہ تاریخ کے کسی بھی دور کو وہ باقی سارے ادوار سے مربوط رکھ کر زیرِ غور لاتا ہے، پھر اس دور کے اندر اگر کسی ملک، قوم اور معاشرے کو وہ دیکھتا دکھاتا ہے، تو دور کی پوری بیک گراؤنڈ کے ساتھ وہ اجتماعی زندگی کے جس مسئلے کو لے گا تو اس کے پورے نقشے میں لے گا۔ آدم تا ایندم وہ حقیقت کو ایک ہی پاتا ہے۔ اس کا ظرفِ مکاں اور اس کا ظرف زماں دونوں بہت ہی وسیع ہیں، مگر نہ اتنے کہ وہ ایک تخیلاتی آفاقیت میں کھو کر رہ جائے۔ وہ عملی آدمی ہے اس لیے وہ جہاں ایک طرف وسعتِ نظر اتنی زیادہ رکھتا ہے، وہاں دوسری طرف توجہ کو جس پوائنٹ پہ چاہتا ہے پوری طرح مرتکز (Focus) کر کے قائم کرتا ہے۔ آیئے ہم اس کے جامعانہ زاویۂ نگاہ کو اس کی اپنی دو ایک عبارتوں میں سے خود اخذ کریں:

"کائنات علیحدہ علیحدہ مستقل الوجود اجزاء پر مشتمل نہیں، بلکہ وہ ایک کُل ہے جس کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ زمین کا ایک ذرّہ مریخ اور عطارد کے ذرات سے ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا میرے سر کا ایک بال میرے ہاتھ کے ایک رونگٹے سے رکھتا ہے۔ گویا پوری کائنات جسدِ واحد ہے اور اس کے اجزاء میں باہم ویسا ہی ربط ہے جیسا ایک جسم کے اجزا میں ہوتا ہے۔ پھر جس طرح کائنات کے اجزاء میں ربط اور تسلسل ہے اسی طرح ان واقعات میں بھی ربط اور تسلسل ہے جو اس کائنات میں پیش آتے ہیں، دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا واقعہ بجائے خود ایک مستقل واقعہ نہیں ہے بلکہ وہ تمام کائنات کے سلسلۂ واقعات کی ایک کڑی ہے۔ اور اس کلی مصلحت کے تحت صادر ہوتا ہے کہ جس کو پیش رکھ کر خداوندِ عالم اپنی اس غیر محدود سلطنت کو چلا رہا ہے۔"

(تفہیمات حصہ اول، مضمون "کوتاہ نظری" ص ۱۴۲)

"آپ دیکھیں گے کہ سارا عالم اور اس کا ایک ایک ذرہ ایک

زبردست نظام میں جکڑا ہوا ہے۔ اور ایک قانون ہے جس پر خاک کے ایک ذرّہ سے لے کر آفتابِ عالم تاب تک ساری کائنات طوعاً و کرہاً عمل کر رہی ہے۔ کسی شے کی مجال نہیں کہ اس قانون کے خلاف چل سکے۔ جو چیز اس سے ذرّہ برابر سرتابی کرتی ہے وہ فساد اور فنا کی شکار ہو جاتی ہے۔ یہ زبردست قانون جو انسان، حیوان، درخت، پتھر، ہوا، پانی، اجسامِ ارضی اور اجرامِ فلکی سب پر یکساں حاوی ہے ہماری زبان میں فطرت یا قانونِ قدرت کہلاتا ہے۔ اس کے تحت جو کام جس چیز کے سپرد کر دیا گیا ہے وہ اس کے کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ ہوائیں اس کے اشارے پر چلتی ہیں، بارش اس کے حکم سے ہوتی ہے، پانی اس کے فرمان سے بہتا ہے، سیارے اس کے اشارے سے حرکت کرتے ہیں، .... جس چیز کو ہم زندگی بقا اور کون کہتے ہیں وہ دراصل نتیجہ ہے اس قانون کی اطاعت کا اور جس کو ہم موت، فنا اور فساد کہتے ہیں وہ درحقیقت نتیجہ ہے اس قانون کی خلاف ورزی کا ۔"

(تفہیمات، مضمون "اسلام میں عبادت کا تصور" ص ۴۳، ۴۴)

ایک اقتباس اور! "رسالۂ دینیات" جو ثانوی درجے کے طلباء کے لیے بطور نصاب مرتب کیا گیا ہے اس کے پہلے باب میں "اسلام کی حقیقت" کے ذیلی عنوان سے ذیل کا بصیرت افروز ٹکڑا سامنے آتا ہے:

"یہ زبردست قانون جس کی بندش میں بڑے بڑے سیاروں سے لے کر زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا ذرہ تک جکڑا ہوا ہے، ایک بہت بڑے حاکم کا بنایا ہوا قانون ہے۔ ساری کائنات اور کائنات کی ہر چیز اس حاکم کی مطیع اور فرماں بردار ہے کیونکہ وہ اس کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت و فرماں برداری کر رہی ہے۔ اس لحاظ سے ساری کائنات کا مذہب اسلام ہے، کیونکہ ہم اوپر بیان

کرچکے ہیں کہ خدا کی اطاعت و فرماں برداری ہی کو "اسلام" کہتے ہیں۔ سورج اور چاند اور تارے سب مسلم ہیں، زمین بھی مسلم ہے، ہوا اور پانی اور روشنی بھی مسلم ہیں، درخت اور پتھر اور جانور مسلم ہیں، اور وہ انسان بھی جو خدا کو نہیں پہچانتا، جو خدا کا انکار کرتا ہے، جو خدا کے سوا دوسروں کو پوجتا ہے، جو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتا ہے، ہاں وہ بھی اپنی فطرت اور ودیعت کے لحاظ سے مسلم ہی ہے۔ کیونکہ اس کا پیدا ہونا، زندہ رہنا اور مرنا سب کچھ خدائی قانون ہی کے تحت ہے، اس کے تمام اعضاء اور اس کے جسم کے ایک ایک رونگٹے کا مذہب اسلام ہے، کیونکہ وہ سب خدائی قانون کے مطابق بنتے، بڑھتے اور حرکت کرتے ہیں۔"

(رسالہ دینیات، ص ۱۰، ۱۱)

یہ ہے وہ وسعتِ نظر، یہ ہے وہ جامع نگاہی، یہ ہے وہ آفاق گیری جس کے ساتھ ایک نظریۂ حیات کو جب مودودی پیش کرتا ہے تو وہ ایک عظیم مفکر کی حیثیت پالیتا ہے۔ وہ اسلام کو اس حیثیت سے سامنے نہیں لاتا کہ یہ اس کا ذاتی مذہب ہے، یا جس قوم میں وہ پیدا ہوا وہ اپنے آپ کو اس سے نسبت دیتی ہے، بلکہ وہ اپنے اس محبوب نظریے کو اس قدر و قیمت کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہی ساری کائنات کا دین و مسلک ہے، یہ وہ حقیقتِ عظمیٰ ہے کہ جمادات، نباتات، حیوانات، سبھی پر چھائی ہوئی ہے۔ یہ سارے کا سارا کاروانِ وجود بالکل ہم رنگ، ہم مسلک اور ہم آہنگ ہے، وہی بات کہ

ما ہمہ یک دودمانِ نار و نور   آدم و مہر و مہ و جبریل و حور
(اقبالؒ)

مولانا مودودی انسانی زندگی کو ایک کُل مانتے ہیں۔ ایک وحدت، ناقابلِ تقسیم وحدت قرار دے کر اس پر غور کرتے ہیں، ان کے نزدیک اسے مختلف خانوں میں بانٹ کر ہر خانے کو الگ الگ نظریوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ جغرافیے اور زمانے کی لکیریں ان کے نزدیک فطرتِ انسانی کے تقاضوں کو، اس کے خیر و شر کو، اس کے معروف و منکر کو نہیں بدل ڈالتیں

ذرائع و وسائل کا ارتقا اخلاقی ضابطوں کو متغیر نہیں کرتا، فطرتِ انسانی کی مستقل ساخت اُن کے نزدیک ساری تاریخِ انسانی کو ایک مربوط شے بناتی ہے۔

حق اور باطل یا اسلام اور جاہلیت دو کردار ہیں جو اپنی کشمکش شروع سے آخر تک ہر قسم کے حالات میں جاری رکھے ہوئے ہیں اور انہی کی وجہ سے یہ کہانی ایک مسلسل کہانی بنتی ہے۔ ان حقیقتوں کو مختلف مواقع پر انہوں نے مختلف پیرایوں میں نمایاں کیا ہے۔ یہی نقطۂ نظر ہے جس کے تحت وہ تاریخ میں، امامت (Leadership) کے انقلاب کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں۔

"ٹھیک اسی طرح اس کا ایک اور قانون بھی ہے جو ہماری تاریخ کے اتار چڑھاؤ پر، ہمارے گرنے اور اُٹھنے پر، ہماری ترقی اور تنزل پر، ہماری ذاتی، قومی اور ملکی تقدیروں پر حکومت کر رہا ہے ........ خدا کے اس قانون کی پہلی اور سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ وہ بناؤ کو پسند کرتا ہے اور بگاڑ کو پسند نہیں کرتا۔ مالک ہونے کی حیثیت سے اس کی خواہش یہ ہے کہ اس کی دنیا کا انتظام ٹھیک کیا جائے، اس کو زیادہ سے زیادہ سنوارا جائے، اس کے دیئے ہوئے ذرائع اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ اس کی دنیا بگاڑی جائے، اُجاڑی جائے، اور اس کو بدنظمی سے، گندگیوں سے اور ظلم وستم سے خراب کر ڈالا جائے۔ انسانوں میں سے جو لوگ بھی دنیا کے انتظام کے امیدوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں ان میں سے صرف وہ لوگ خدا کی نظرِ انتخاب میں مستحق ٹھہرتے ہیں جن کے اندر بنانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ انہی کو وہ یہاں کے انتظامات کے اختیارات سپرد کرتا ہے، پھر وہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ لوگ بناتے کتنا ہیں اور بگاڑتے کتنا ہیں۔

جب تک ان کا بناؤ بگاڑ سے زیادہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا
اُمیدوار اُن سے اچھا بنانے والا اور ان سے کم بگاڑنے والا میدان
میں موجود نہیں ہوتا اُس وقت تک ان کی ساری برائیوں اور اُن
کے سارے قصوروں کے باوجود دنیا کا انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے،
مگر جب وہ کم بنانے اور زیادہ بگاڑنے لگتے ہیں تو خدا انہیں ہٹا
کر پرے پھینک دیتا ہے، اور دوسرے امیدواروں کو اسی
لازمی شرط پر انتظام سونپ دیتا ہے۔"

(تقریر "بناؤ اور بگاڑ"، مئی ۴۷ء)

یہ تقریر شروع سے آخر تک تاریخ کی اسی تعبیر کی تشریح ہے، اور
مخاطبین کو واقعات و شواہد کی روشنی میں اس سنتِ الٰہی سے آگاہ کر کے
ان سے چاہا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو "بناؤ" کی صلاحیتوں سے آراستہ کریں۔
ان اقتباسات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مودودی کی فکر ایک ہمہ
گیر مرتب اور مربوط فکر ہے۔ وہ ذہنی سانچہ ہی ایسا وسیع ہے کہ ساری کائنات،
ساری انسانیت، ساری تاریخ اور ساری زندگی کو اپنے اندر لے کر پھر غور و
فکر کا آغاز کرتا ہے۔ اس ذہنی سانچے میں جب اسلام کو رکھا جاتا ہے، تو وہ
بھی ایک منظم اور مربوط نظام کی حیثیت میں سامنے آتا ہے۔ ذرا دیکھیے یہ
چند سطریں:

"اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریقہ ہائے عمل کا مجموعہ نہیں
ہے، جس میں ادھر ادھر سے مختلف چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں،
بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں
پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے
چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ
ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں
کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کیے ہیں اُن

سب کی روح اور ان کا جوہر اس کے اصولِ اوّلیہ ہی سے ماخوذ
ہے۔ ان اصولِ اوّلیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں
کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ
دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں اور جڑوں سے تنا اور تنے سے شاخیں
اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود
اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔"

(اسلام کا نظریۂ سیاسی ص ۵)

ان الفاظ میں مودودی نے خود اپنے فکر کی جامعیت کی تصویر کھینچ دی
ہے۔ اسی ہمہ گیرانہ اور جامعانہ اسلوب سے وہ جب کسی اُلجھے ہوئے مسئلے کو چھیڑتا
ہے تو ایک جزئی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہمیں پورے سسٹم میں وہ خاص
مسئلہ رکھ کے دکھاتا ہے۔ وہ "پردہ" کے پامال موضوع کو چھیڑے گا، تو پورے
کے پورے اسلامی معاشرتی نظام کو دنیا بھر کے معاشرتی نظاموں کے مقابلے
پر رکھ کر پھر ہمیں دکھائے گا کہ اس نظام میں پردہ کی جگہ کیا ہے؟ اور کیوں ہے،
اور اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو کس طرح اصول و مقاصد کا سارا ڈھانچہ
پیوندِ زمین ہو کے رہ جائے گا۔ وہ "سود" کی حرمت پر بات چھیڑے گا تو ایک
طرف سرمایہ دارانہ نظام کا تفصیلی نقشہ سامنے لاکر بتائے گا کہ اس نظام کو
مفاسد سے مالا مال کرنے میں سُود کا پارٹ کیا ہے؟ اور دوسری طرف اسلامی نظام
معیشت کا خاکہ کھینچ کر دکھائے گا کہ اس کے اندر سُود کے لیے سرے سے
کوئی جگہ نہیں نکلتی اور زبردستی نکالی جائے تو اس خاکہ کے سارے مقاصد
غارت ہو کر رہ جائیں گے۔ اسی طرح وہ اگر "اسلام تلوار سے پھیلا" کے
شرانگیز اعتراض کا جواب دینے کو قلم اٹھائے گا تو دنیا بھر کے قوانینِ جنگ
کے بالمقابل اسلامی نظریۂ جہاد اور اس کے اصول و قوانین اور اس کے
مقاصد و مناہج پر "الجہاد فی الاسلام" جیسی سائنٹفک، ضخیم اور علمی کتاب مرتب

کر کے آپ کے سامنے رکھ دے گا۔ وہ اپنی ایک کتاب "خطبات" (جو کم تعلیم یافتہ دیہاتی عوام کے مطالعہ کے لیے لکھی گئی ہے) میں اسلام کے اجزاء کو الگ الگ کر کے دیکھنے اور ان سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرنے والوں کو ایک کلاک کی مثال دیتا ہے کہ جب تک اس کے تمام کے تمام پرزے اپنی اپنی جگہ پر نصب ہوں اور اپنا اپنا کام کر رہے ہوں تو اس کے ڈائل پر مطلوبہ نتیجہ (یعنی وقت بتانا) نکلتا رہے گا۔ لیکن اگر اس کے پرزوں کو کھول ڈالا جائے تو چاہے الگ الگ پرزوں کو لے کر ان کو کتنا پالش کیا جائے اور کتنا ہی تیل دیا جاتا رہے ڈائل پر کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا، بلکہ کسی پرزے کی مقصدیت بھی سمجھ میں نہ آسکے گی۔ اسلام کے کلاک کو کھول کر اس کے پرزے الگ الگ کر کے بلکہ ان کو سائیکل اور سلائی مشین کے پرزوں سے ادل بدل تک کر کے جب لوگ ان میں سے کسی ایک پر غور کرتے ہیں تو ان کو اس نظام کی ڈور کا سرا نہیں مل سکتا۔ مولینا نے ایک دوسرے مقام پر اسلام کے متعلق فکری انتشار کی اس عام وجہ کو کھول کر یوں بیان کیا ہے:

"عام طور پر لوگ جب اسلام کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو اس نظام اور سسٹم پر بہ حیثیتِ مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے جس سے وہ مسئلہ متعلق ہوتا ہے، بلکہ نظام سے الگ کر کے اس خاص جز کو من حیث جز ہو جو لے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جز تمام حکمتوں سے خالی نظر آنے لگتا ہے اور اس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں...... اگر آپ پوری عمارت کو دیکھنے کے بجائے صرف اس کے ایک ستون کو دیکھیں گے، تو لامحالہ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ آخر کیوں لگایا گیا ہے۔" (پردہ)

مودودی کے طریق فکر کا امتیاز یہی ہے کہ وہ ایک ایک مسئلے، ایک ایک جزئی حکم، ایک ایک آیت اور ایک ایک حدیث کو مجموعی سسٹم میں

اُس کی اپنی جگہ پر رکھ کر دکھاتا ہے۔ وہ نظامِ زندگی کی کل کا ایک ایسا انجنیئر ہے جو ایک ادنیٰ سی کیل کو جب اپنے صحیح مقام پر گڑا ہوا اور کام کرتا ہوا سامنے رکھ دیتا ہے، تو اس کی حقیقت و مقصدیت پوری پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے۔

جامع نظریے اور زندگی کے نظام دینے والے لوگ ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ اس لیے بڑے ہوتے ہیں اور اسی لیے بڑے مانے جاتے ہیں کہ وہ انسانی معاشروں کو وہ چیز بہم پہنچاتے ہیں جس سے نئے ذہن پیدا ہوتے ہیں، نئے خیالات اُمڈتے ہیں، حرکت اور سرگرمی پیدا ہوتی ہے، مقصد اور نصب العین ہاتھ آتا ہے، تعمیری قوتوں کو کام کرنے کے لیئے نقشے ملتے ہیں اور زندگی ایک کل کی طرح مربوط ہو کر متحرک ہو جاتی ہے۔

## اسلام کا تعارف بحیثیت نظام و تحریک

مولینا مودودی کی مفکرانہ عظمت کا دوسرا راز یہ ہے کہ آپ نے اسلام کو صدہا برس کے تباہ کن عوامل کی گرفت سے نکالا اور ایک مذہب اور ملت کی سطح سے اُٹھا کر نظامِ زندگی ہونے کا صحیح مقام اسے دوبارہ اس دورِ الحاد میں پورے عقلی زور کے ساتھ دے دیا۔ جو جو کچھ قطع و برید اس کی کی گئی تھی، اس میں جو جو ترامیم، تحریفیں اور تصرفات کیے گئے تھے، اور اس کے عقیدوں عبادتوں، اخلاقی ہدایات کو سیاست و تمدن سے کاٹ کر جو بے معنی حیثیت دے دی گئی تھی، ان ساری حرکات کے ایک ایک اثر کا ازالہ کر کے اسے "دین" کی حیثیت میں ہمارے سامنے رکھ دیا۔ کمال یہ کہ یہ سارا کام جدید دور کے عقلی اور سائنٹفک معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے خصوصیت سے دین و سیاست کی تقسیم کا جو نظریہ مغرب سے آیا تھا، اور ہم آ کر ہماری ذہنی فضا پر اثر انداز ہو گیا تھا، اس کے خلاف ملت کے اجتماعی ذہن نے جو کشمکش

کی ہے، اور جس میں بہت بڑا تاریخی حصہ علامہ اقبال کا بھی تھا، اسے کامیاب تکمیل تک مولینا مودودی نے پہنچایا۔ مولینا مودودی کا تصورِ اسلام زندگی کے سارے مسائل کو اپنے دائرہ میں لیتا ہے، اور ان کو اپنے اسلوب سے حل کرتا ہے۔ وہ کسی جزئی مسئلے کو اپنے حلقۂ اثر سے مستثنیٰ چھوڑ کر کسی دوسری طاقت کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کی تقسیم سے انکاری ہے۔ اس کا نظریہ توحید وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدم کے تصورات پر مشتمل ہے بلکہ مودودی کو اسلام کے اسی تصور نے اپنی طرف کھینچا۔ ورنہ اس جیسا ذہین انسان بے روح عقیدوں، بے مقصد رسموں، بے معنی حرکتوں سے مربوط زندگی کے مجموعے کے حوالے اپنے آپ کو کرنے والا نہ تھا۔ وہ خود کہتا ہے:

"اس بے روح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد محض ایک دھرم (Religion) کے مزعومات بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفہ اجتماع اور نظامِ تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اس کی عبادات محض پوجا اور تپسیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں حالانکہ وہ ان ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظامِ اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عملِ تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی لائحۂ عمل کو چلانے کے لیئے ان عقائد اور ان عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ

تحریک کے بجائے محض عہد گزشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے، اور اسلام کی تعلیم دینے والی درس گاہیں آثار قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہار قدرشناسی تو کر سکتے ہیں، مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر منصوص تعین اور روح سے بڑھ کر مظاہر پر مدار دینداری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا کرے گی اُلٹی اپنوں کی تنفیر کا باعث بن رہی ہے۔ اس غلط مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر آدمی اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دے رہے ہیں؟"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم، ص ۱۱۴)

"اسلام کو جس صورت پر میں نے گردو پیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا، میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید و تحقیق کی صلاحیت پیدا ہو جانے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اس بے روح مذہبیت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا، کیونکہ میرے اندر نازی

فلسفہ کی طرف قدرتی میلان نہیں ہے کہ محض حیاتِ قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکر میں پڑا رہوں، لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور ازسرِ نو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرتِ محمدی کا مطالعہ ہے ...... اس کے تجویز کردہ لائحہ زندگی (Scheme & Life) میں مجھے ویسا ہی کمال درجہ کا توازن نظر آیا، جیسا کہ ایک سالمہ (Atom) کی بندش سے لے کر اجرامِ فلکی کے قانون جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے ..... پس درحقیقت میں ایک نومسلم ہوں، خوب جانچ پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل و دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیئے صلاح و فلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے .... میرا مقصد اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے، بلکہ یہ دعوت اس طرف ہے کہ ...... آؤ ہم اس ظلم و طغیان کو ختم کر دیں ...
.... اور قرآن کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم، ص ۱۵، ۱۶)

یوں مولینا مودودی کا تصوّرِ اسلام ایک نئی دنیا، ایک پورا عالمِ قرآنی اپنے اندر لیئے ہوئے ہے اس معاملے میں مودودی کا کام بالکل نیا اور انوکھا نہیں تھا، بلکہ اسلام کا یہ جامع تصوّر ہمارے ملّی لٹریچر میں ہمیشہ موجود رہا ہے اور وقتاً فوقتاً اسے ہمارے رجالِ اکابر نکھارتے رہے ہیں، ماضی قریب کے مجدّد شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے نظامِ اسلامی کا مکمل تصوّر قوم کو دیا ہے، اس دَور کے متاخرین میں مولینا سید سلیمان ندوی، مولینا آزاد۔ علامہ اقبال اور دوسرے بے شمار لکھنے اور بولنے والے اسی تصوّر کی آبیاری کرتے رہے ہیں، مولانا مودودی

کا کوئی خاص حصّہ اس خدمت میں ہے تو وہ یہ ہے کہ آپ نے اسلامی تصوّرِ نظام کو بالکل ایک سائنس بنا کر دنیا کے سامنے رکھ دیا ہے۔ آپ کی تحریروں اور تقریروں میں ایک ریاضیاتی ذہن کارفرما ہے جو ہر حقیقت کو دو اور دو چار کا مسئلہ بنا کر پیش کرتا ہے۔

دوسری خاص بات یہ ہے کہ مودودی کا تصوّرِ اسلام نظریاتی .... (Academic) نہیں ہے، وہ ایک کتابی آدمی اور ایک مصنف اور ایک مقالہ نگار کی طرح اسے پیش نہیں کرتا، بلکہ ایک عملی آدمی کے ذہن کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہ عملی ذہن نظامِ اسلامی کے تخیل میں ایک تحریکیت پیدا کر دیتا ہے، یعنی اس کا تصوّرِ اسلام ایسا ہے جو اپنے مخالف نظریات و تصورات، ناسازگار ماحول، غلط نظامِ سیاست و تمدّن سے ٹکرانا چاہتا ہے، وہ تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے، وہ ظہور پاتے ہی اپنے سرچشمہ سے بہنا چاہتا ہے اور چٹانوں کو اپنے اندر ریلنا چاہتا ہے۔ یہ تصوّر ایک ٹھہراؤ رکھنے والی جھیل کی طرح نہیں، ایک بہاؤ رکھنے والے موّاج دریا کی طرح ہے۔ تصوّرِ اسلام کو از سرِ نو اس کی تحریکیت سے مالا مال کر دینا مودودی کا خصوصی کارنامہ ہے، اسی سے وہ محض مفکر بننے کے بجائے انقلابی مفکر بنتا ہے۔ مسلمانوں سے اسے گلہ ہے کہ،

"انہوں نے خود بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسے ایک تحریک (Movement) کے بجائے محض زمانۂ سلف کی ایک مقدس میراث بنا کر رکھ دیا ہے۔" (سیاسی کشمکش حصّہ سوم ص ۱۸)

اتنا ہی نہیں، مودودی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام کو ایک تحریک کی سطح سے نیچے اُتار کر دیکھنے سے اس کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کی مشہور تفسیر "تفہیم القرآن" جن خصوصیات کے ساتھ سامنے آئی ہے ان میں مرتبۂ اوّل کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن کو ایک چلتی ہوئی انقلابی تحریک کے گائیڈ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور اسی تحریک کی عملی تاریخ کے مختلف مراحل کے

انداس وقت کی رہنمائی کو رکھ کر اس کا مفہوم متعین کرتی ہے؛ چنانچہ اس کے بصیرت افروز مقدمہ میں قرآن فہمی کے اصول بیان کرتے ہوئے "صاحب تفہیم" نے ایک حقیقت یہ بیان کی ہے کہ :

"یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دنیا کے عام تصورِ مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لیئے جائیں۔ جیسا کہ اس مقدمے کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی، اور وقت کے علمبردارانِ کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑوا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیٔ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جُو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تئیس سال یہی کتاب اس ... عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی

کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو، اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔" (مقدمہ تفہیم القرآن ص ۳۴)

پھر یہ انقلابی مفکر محض تحریکیت کا شعور دلا کر نہیں رہ جاتا، اپنی فکری مہم کے ساتھ ساتھ متوازی طور پر عملی تحریک لے کے چل بھی کھڑا ہوتا ہے، بلکہ درحقیقت وہ سارا فکری کام اسی عملی جدوجہد کے لیئے کرتا ہے۔ بالعموم "مفکرین" عملی میدان میں کچھ نہیں کر پاتے، لیکن مودودی ایک ایسا مفکر ہے جو جیسی فکر دے رہا ہے ویسی ہی تحریک بھی بپا کیئے ہوئے ہے۔

## مسلم قوم پرستی اور اسلام میں تفریق و تمیز

اکثر لوگ اپنی ذات اور خاندان تک سوچ کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ اور محلے اور پڑوس، شہر اور علاقے کے مسائل سے دلچسپی لیتے ہیں اور اس سے آگے کچھ سوچ نہیں سکتے۔ پھر اور لوگ ہوتے ہیں جو اپنے طبقے اور اپنی پارٹی کی فلاح و بہبود تک نگاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ اس درجے کے محدود تفکر سے کوئی مفکر نہیں بنتا۔ مفکرین کا کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ وہ قوم اور ملک کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھنے والے مسائل کو نگاہ کے احاطے میں لیتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ چوٹی کے مفکرین آتے ہیں جو ساری انسانیت سے اپنا رشتہ جوڑ کر ان بنیادی حقیقتوں کو سوچتے ہیں جن سے ہر فرد، ہر قوم اور ہر ملک کا مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ یہ دورِ نیشنلزم کا دور تھا اور اس میں بے شمار قیمتی دماغ ابھرے، لیکن ان میں سے بیشتر کو نیشنلزم نے اپنے محدود قفس میں لے لیا۔ ایک قوم، ایک وطن اور ایک نسل سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکے۔ لیکن اسلام چونکہ ساری نوعِ انسانی کو خطاب کرتا ہے اور ایک عالمی تحریک اور ایک جہانی نظام ہونے کا مدعی ہے اس لیئے اس کا نظریہ جغرافیائی اور قومی اور نسلی حد

بندیوں کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ قدرتی طور پر ایک حقیقی اسلامی مفکر سے بھی ہم یہی توقع کرتے ہیں کہ وہ قوم پرستانہ سطح سے بلند ہو کر سوچے گا۔ مودودی کا فکری کارنامہ ہماری اس امید کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے، وہ "سیاسی کشمکش" حصہ اوّل و دوم اور "مسئلہ قومیت" لکھ کر جہاں ہندوستانی نیشنلزم سے لڑتا ہے اور بازی جیت کے دکھا دیتا ہے، وہاں وہ پلٹ کر "مسلم نیشنلزم" کے اوپر اس سے زیادہ زور و شدّت کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے جو قوم پرستی کے جہانی دور کے زیر اثر آہستہ آہستہ خود مسلمانوں میں پروان چڑھنے لگتا ہے۔ اسلام کو قوم پرستی کے سانچے میں ڈھالنے کی غیر شعوری ابتدا بہت اوپر سے ہو جاتی ہے اور متاخرین میں سے اکثر کو ہم غیر شعوری طور پر اسی "مسلم قوم پرستی" کا مسحور پاتے ہیں۔ اور تو اور اقبال جیسا مفکر اسلام اور مسلم نیشنلزم کو دیر تک گڈمڈ کر کے چلتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلم نیشنلزم کے جذبات کے راستے ہی اسلام تک پہنچتا ہے۔ بالکل آخری ایّام میں آکر وہ مسلم نیشنلزم کی کینچلی کو اتار سکا ہے۔ مودودی اپنے وقت کا وہ پہلا شخص ہے جس نے ہمارے اجتماعی عالمِ افکار کے ان دو گونہ رجحانات کو ایک دوسرے سے جدا جدا کر کے خالص اسلام کو تعیّن دیا ہے اور مسلم نیشنلزم کے خلاف زبردست فکری معرکہ بپا کر دیا ہے۔ اس کی انقلابی کتاب "سیاسی کشمکش" کا تیسرا حصہ درحقیقت اسی خاص معرکے کے لیئے وقف ہے۔ اس کتاب کی تحریک زا بحثوں کی ایک آدھ جھلک دیکھتے چلیے:

"بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیاء (Revival) کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے، یعنی یہ قوم جو مسلمانوں کے نام سے پائی جاتی ہے، اس کو ایک زندہ اور طاقتور قوم بنانا اور برسرِ عروج لانا اصل مقصود ہے اور اسی کا نام اسلام

کا احیاء ہے یہ غلط فہمی ان کو مسلم قوم پرستی کی حد تک کھینچ لے گئی ہے۔ جس طرح مونجے اور ساورکر کے لیئے سوال ہندو قوم کے عروج کا ہے، جس طرح مسولینی کے لیئے اطالوی قوم اور ہٹلر کے لیئے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے، اسی طرح ان مسلم قوم پرستوں کے لیئے اصل سوال اس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اور جس کے ساتھ ان کی قسمتیں وابستہ ہیں۔ ...... یہ ذہنیت سر سید احمد خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مسلط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جا رہا ہے مسلمانوں کے لیئے سوچا جا رہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جا رہا ہے.... اگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ہمارے سامنے اصل سوال کسی قوم کے احیاء کا نہیں بلکہ مسلکِ اسلام کے احیاء کا ہے، قوم کے احیاء کا خیال دماغ سے نکالتے ہی وہ تمام مسائل کافور کی طرح اڑ جاتے ہیں جو قومیّت کی اصطلاحوں میں سوچنے والے لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۱۲۰ تا ۱۲۲)

"اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں، لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جزا اتنا کم اور قوم پرستانہ جزا اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان

طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں۔ اس حدِ کمال کو
پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری
برتنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۸)

"اس (اسلام) کا منتہائے نظر ایک ایسی جہانی ریاست
(World State) ہے جس میں نسلی اور قومی تعصبات کی زنجیریں
توڑ کر تمام انسانوں کو مساوی حقوق اور مساوی مواقع ترقی کے
ساتھ ایک تمدنی و سیاسی نظام میں حصہ دار بنایا جائے۔"

(مسئلہ قومیت، ص ۶۸)

"بلکہ یہ ایک قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظامِ تہذیب و تمدن
(Civilization) بنانے کے لیئے اٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی
تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت
(World Nationality) بنانا چاہتی ہے۔"

ان حوالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مودودی اس
دور میں وہ پہلا شخص بن کر سامنے آیا ہے جس نے اسلام اور مسلم
نیشنلزم کی باہمی ترکیب کو شعوری طور پر توڑ ڈالا ہے، اور
جو اسلام کو نسلی مسلک و مذہب کی حیثیت سے
نہیں بلکہ ساری انسانیت کے دینِ فلاح کی حیثیت سے لے کے
اُٹھا ہے اور جس کے سامنے ایک جہانی ریاست اور واحد انسانی
قومیت کا نہایت ہی بلند اور وسیع مطمح نظر ہے۔ کام کا دائرۂ
آغاز وہ بھی عملاً مسلمان قوم کو قرار دیتا ہے، لیکن وہ مسلم قوم پرستی
کی تنگ حدود کو پہلے قدم پر توڑ کر آگے چلتا ہے۔ یہ مودودی کا
امتیازی کارنامہ ہے۔

# اجتماعی تضاد کا تجزیہ

زوال اور انحطاط کے عمل سے جب کوئی تحریک یا نظریہ یا مسلک گزرتا ہے تو اس کے ماننے والوں کی زندگیوں میں مضحکہ خیز تضاد پیدا ہونے لگ جاتے ہیں۔ یہ واقعہ چونکہ اس وقت رونما ہوتا ہے جب فکری جمود کا زنگ لگ چکتا ہے، اس لیے ایک ایک کر کے تضاد اُبھرتے رہتے ہیں۔ بے جوڑ چیزوں میں سمجھوتے قائم ہو جاتے ہیں، متناقص عناصر باہم ترکیب پاتے رہتے ہیں اور کسی کو ان سے کھٹک نہیں ہوتی۔ زندگی کا سارا فساد — چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا —— جس بھی دائرے میں واقع ہوتا ہے، ہمیشہ تضاد ہی کا واقع ہوتا ہے۔ فرد کے نفسیاتی نظام سے لے کر معاشرے کی سیاسی و اجتماعی ہیئت تک زندگی میں جو خلل بھی آتا ہے بے جوڑ چیزوں کے جمع ہو جانے سے آتا ہے۔ یہ بے جوڑ چیزیں یکے بعد دیگرے جمع ہوتی رہتی ہیں، اور زندگی ایک عجیب معجون مرکب بن جاتی ہے، لیکن عام لوگوں کے ذہن ان کے عادی ہو کر اپنے فکر و نظر کو فساد زدہ ماحول سے کچھ ایسا ساز گار بنا لیتے ہیں کہ پہاڑ پہاڑ جیسے بڑے تضاد محسوس نہیں ہوتے۔ جب تک یہ محسوس نہیں ہوتے، تبدیلی نہیں آتی۔ غیر معمولی درجے کے مفکر ہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو زندگی کے تضادوں کو سمجھ جاتے ہیں، اور پھر ان کو تنقید کا نشانہ بنا کر اجتماعی حس کو بیدار کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ جس صاحب فکر کے کارنامے کا بھی آپ جائزہ لیں، آپ دیکھیں گے کہ وہ زندگی کے کچھ نہ کچھ تضادوں کو نمایاں کرتے ہیں جنہیں عام ذہن نے محسوس نہیں کیا ہوتا۔ اور پھر جو صاحب فکر کسی ہمہ گیر اور بنیادی تضاد پر انگلی رکھ دیتا ہے وہ مفکرانہ مرتبے میں دوسرے بے شمار اہل فکر سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ مودودی نے اس ہمہ گیر تضاد کو اجاگر کیا ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ایک ایک گوشے

پر سالہا سال سے اپنا پرتو ڈالے چلا آرہا تھا۔ وہ ہے اسلام اور مسلمان کے نام کے ساتھ ان بے شمار نظریوں، خیالات، اعمال و کردار اور نظام ہائے کار کا جوڑ جو قطعاً غیر اسلامی اور غیر مسلمانانہ ہیں۔ امر واقعہ ایسا ہے کہ بالکل پیش پا افتادہ ہے لہٰذا ہم سب اس سے ہمہ وقت دوچار ہیں۔ کوئی رازِ نہفتہ نہیں، لیکن ہم چونکہ اس سے ذہنی سازگاری پیدا کر چکے ہیں اس لیئے وہ ہمیں کھٹکتا نہیں۔ جب ایک حسّاس ذہن نمودار ہوتا ہے، تو وہ اس پر یُوں گرفت کرتا ہے:

"بازاروں میں جائیے، مسلمان رنڈیاں آپ کو کوٹھوں پر بیٹھی نظر آئیں گی، اور مسلمان زانی گشت لگاتے ملیں گے۔ جیل خانوں کا معائنہ کیجیے۔ مسلمان چوروں، مسلمان ڈاکوؤں اور مسلمان بدمعاشوں سے آپ کا تعارف ہوگا۔ دفتروں اور عدالتوں کا چکر لگائیے، رشوت خوری، جھوٹی شہادت جعل، فریب، ظلم اور ہر قسم کے اخلاقی جرائم کے ساتھ آپ لفظ مسلمان کا جوڑ لگا ہوا پائیں گے، سوسائٹی میں پھریئے، کہیں آپ کی ملاقات مسلمان شرابیوں سے ہوگی، کہیں آپ کو مسلمان قمار باز ملیں گے، کہیں مسلمان سازندوں اور مسلمان گویوں اور مسلمان بھانڈوں سے آپ دوچار ہوں گے۔ بھلا غور تو کیجیے یہ لفظ مسلمان کتنا ذلیل کر دیا گیا ہے۔" (سیاسی کشمکش، حصہ سوم۔ نیز تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ دوم۔ اشاعت ۸۳ء، ص ۴۴)

"اس سے اونچے تعلیم یافتہ طبقے کی حالت اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے ..... کہیں کوئی صاحب علانیہ خدا اور رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اسلام پر پھبتیاں کس رہے ہیں، مگر ہیں پھر بھی مسلمان ہی! ایک دوسرے صاحب خدا اور رسالت

اور آخرت کے قطعی منکر ہیں اور کسی مادّہ پرستانہ مسلک پر پورا ایمان رکھتے ہیں مگر ان کے مسلمان ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک تیسرے صاحب سود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں لیتے، مگر ہیں یہ بھی مسلمان! ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم صاحبہ یا شریمتی جی بنائے ہوئے سینما لیے جارہے ہیں، یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحبزادی سے وائلن بجوا رہے ہیں، مگر آپ کے ساتھ بھی لفظ مسلمان بدستور چپکا ہوا ہے ..... غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا، مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کرسکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے، کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۲۵، ۲۶)

"پھر لطف یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام سے انحراف کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان کا نظریہ اب یہ ہوگیا ہے کہ مسلمان جو کچھ بھی کرے وہ اسلامی ہے، حتیٰ کہ وہ اگر اسلام سے بغاوت کرے تو وہ اسلامی بغاوت ہے، یہ (سودی) بینک کھولیں، تو اس کا نام اسلامی بینک[1] ہوگا،

---

[1] واضح رہے کہ آج کی معاشیاتی اور مالیاتی ضروریات کے لحاظ سے مولانا مودودی بنکنگ کی ضرورت کے قائل ہیں، مگر وہ اس کا سود کے سسٹم پر چلنا خلافِ اسلام مانتے ہیں، اور اسے ایک دوسرے طرز پہ قائم کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں، اس سلسلے میں ان کی کتاب "سود" حصہ اوّل و دوم میں تفصیلات ملاحظہ فرمائیے۔

یہ انشورنس کمپنیاں قائم کریں گے، تو وہ اسلامی انشورنس کمپنی ہو گی۔ یہ جاہلیت (غیر اسلام) کی تعلیم کا ادارہ کھولیں تو وہ مسلم یونیورسٹی، اسلامیہ کالج یا اسلامیہ اسکول ہوگا۔ ان کی کافرانہ، ریاست (یعنی اسلام کے خلاف کسی دوسرے اصول اور نظریے پر چلنے والی ریاست) کو اسلامی ریاست کے نام سے موسوم کیا جائیگا۔ ان کے فرعون اور نمرود اسلامی بادشاہ کے نام سے یاد کیئے جائیں گے۔ ان کی جاہلانہ زندگی اسلامی تہذیب و تمدّن قرار دی جائے گی۔ ان کی موسیقی، مصوری اور بُت تراشی کو اسلامی آرٹ کے معزز لقب سے ملقب کیا جائے گا۔ ان کے زندقے اور اوہام لاطائل کو اسلامی فلسفہ کہا جائے گا، حتیٰ کہ یہ سوشلسٹ بھی ہو جائیں تو مسلم سوشلسٹ کے نام سے پکارے جائیں گے۔ ان سارے ناموں سے آپ آشنا ہو چکے ہیں اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ اسلامی شراب خانے، اسلامی قحبہ خانے اور اسلامی قمار خانے جیسی اصطلاحوں سے آپ کا تعارف شروع ہو جائے۔ مسلمانوں کے طرزِ عمل نے اسلام کے لفظ کو اتنا بے معنی کر دیا ہے کہ ایک کافرانہ چیز کو اسلامی کفر یا اسلامی معصیت کے نام سے موسوم کرنے میں اب کسی کو تناقض فی الاصطلاح ... (Contradiction in Terms) کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر کسی دکان پر آپ "سبزی خوروں کی دکانِ گوشت" یا "ولائتی سودیشی بھنڈار" کا بورڈ لگا دیکھیں، یا کسی عمارت کا نام "موحدین کا بُت خانہ" سنیں تو شاید آپ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکے۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۲۶)

"میں مسلمان صرف اس وقت تک ہوں جب تک زندگی
کے ہر معاملے میں اسلامی نظریہ رکھتا ہوں۔ جب میں اس نظریہ
سے ہٹ گیا اور کسی دوسرے نظریہ کے طرف چلا گیا تو میری جانب
سے یہ سراسر بے شعوری ہو گی، اگر میں یہی سمجھتا ہوں کہ اس نئے
مقام پر بھی مسلمان ہونے کی حیثیت میرے ساتھ لگی چلی آئی ہے۔
مسلمان ہوتے ہوئے غیر اسلامی نظریہ اختیار کرنا صریح بے معنی
بات ہے۔ "مسلمان نیشنلسٹ" اور "مسلمان کیونسٹ" ایسی ہی
متناقض اصطلاحیں ہیں جیسے "کیونسٹ فاشسٹ" یا "جینی قصائی"
یا "اشتراکی مہاجن" یا موحد بت پرست"۔ (مسئلہ قومیت ص ۶۸)

مودودی کی یہ وہ تحریریں ہیں جنھوں نے مسلم نوجوانوں کے اندر ان کی سوئی ہوئی خودی اور ان کے جمود زدہ احساس کو ٹھوکے لگا کر جگا دیا ہے۔ ان کو اپنے تشخص کا شعور دیا ہے، ان کو اس اصل فساد سے آگاہ کر دیا ہے جس سے مسلم سوسائٹی اور مسلم فکر دوچار ہے۔ ان کو فکر و عمل کے وہ راستے دکھائے ہیں جن پر چل کر وہ نوعِ انسانی کے ارتقاء میں موثر حصہ ادا کرنے والی اور تاریخ بنانے والی ایک نظریاتی و تحریکی طاقت بن سکتے ہیں۔

## فکری استقلال کا داعی

اسلامی فکر کو مسلم نیشنلزم سے الگ کر کے اور تضادوں کے گھناؤنے داغوں سے پاک کر کے مولینا مودودی نے ایسے دور میں پیش کیا ہے جو پوری دنیا میں نظریاتی اور فکری اور تہذیبی کشمکش کا ایک دور تھا۔ اشتراکیت اور فسطائیت اور جمہوریت کے مختلف تصورات مشرق و مغرب میں باہم آویزاں تھے، تاریخ کے سمندر میں مختلف سمتوں سے لہریں اٹھ اٹھ کر ٹکرا رہی تھیں، اور نئے نئے بھنور بن رہے تھے اور ان بھنوروں سے پھر نئی لہروں کے دائرے پھیل رہے تھے۔

ہر فکر اور تحریک اپنے راستے نکالنے اور دنیا کو مفتوح کرنے کے لیے زور کر رہی تھی، فکروں اور تحریکوں کے یہ ریلے مشرقی اقوام، بالخصوص مسلمانوں کے ذہنوں سے بھی آ آ کر ٹکرا رہے تھے، بد قسمتی سے جدید مادّہ پرستانہ تہذیب و فکر جو مختلف ریلے پیدا کر رہی تھی، ہمارے ہاں مغربی قوموں کے سیاسی تسلط ... اور امپریلزم کے جلو میں آئی ہے۔ ہم اس سے ہر جگہ غلامی اور بے لبسی اور پسماندگی کی حالت میں دوچار ہوئے ہیں۔ ہر جگہ ہم نے اس کا چیلنج انتہائی زوال کے گڑھے میں گرنے کے بعد سنا ہے اور کہیں بھی ٹکر برابر سرابر کی نہیں تھی، چنانچہ سیاسی شکست کے ساتھ ہی ساتھ ہماری ذہنی شکست کا آغاز ہو گیا۔ غنیمت بس یہ تھا کہ معرکۂ کشمکش کسی نہ کسی درجے میں جاری رہا۔ ایک سخت جان عنصر شروع ہی سے ہمارے اندر ایسا موجود تھا جس نے زمانے کی ہوا کے حوالے ہو جانے والوں کے بالمقابل زمانہ کے دھارے کے خلاف تیرنے کی جسارت کر دی، اس کے ساتھ امپریلزم اور بیرونی اقتدار کے خلاف روز افزوں نفرت بھی معاون ہوئی، مگر جدید فکر و تہذیب کی یلغار بڑی سخت تھی۔ اس کے مقابلے میں دلوں اور دماغوں نے سپر ڈال دی۔ اس کے سامنے نگاہِ تنقید ایسی جھکی کہ بالکل زمین میں گڑ کے رہ گئی۔ ایک طرف تعلیم کا تیزاب تھا، جو فولاد کی خودی کو بھی گھلائے دے رہا تھا، دوسری طرف لٹریچر کا سیلاب تھا، جو سروں سے اونچا ہو کے بہہ رہا تھا۔ تیسری طرف سائنس کی ترقیات کے ہوش رُبا شعبدے تھے جو ہوش اڑا رہے تھے، چوتھی طرف ایک نیا کلچر تھا جس کی شانِ دلربائی بُری طرح رِجھا رہی تھی۔ پانچویں جانب مادّی طاقت کے وہ دل ہلا دینے والے مظاہر تھے جن سے بھونچال آ رہا تھا۔ ان موثرات کے اندر گھر جانے پر ہمارے اوپر وہ مرعوبیت چھائی کہ ہم نے اپنے چشم و گوش سے دیکھنا، سننا اور اپنے دماغوں سے سوچنا بالکل چھوڑ دیا، اپنے نظریات کے بارے میں ہم شک میں پڑ گئے، اپنے دین سے ہمیں عار آنے لگی، اپنے سرمایۂ

روایات و اقدار نے ہماری نگاہوں میں قیمت کھودی، جیسے ہم اپنی بنیادوں سے بالکل اکھڑ گئے اور ہوا کے جھونکوں پر اڑتے والے تنکے بن گئے۔ ہم نے مرعوبیت کے اس طلسم میں سمجھا کہ ترقی، خیر، فلاح اور سچائی وہ ہے جو یورپ سے آئے۔ ہم نے ذہنی غلامی کے اس سحر میں مبتلا ہو کر یہ مستقل تاثر لے لیا کہ یورپ کی نئی زندگی ایک بالکل بے عیب زندگی ہے۔ ہم نے غیر شعوری رائے یہ قائم کر لی کہ جس کے پاس طاقت ہے اس کے نظریات بھی برحق ہیں۔ اس عالم میں ہمارے مذہبی حلقوں نے بلاشبہ مدافعت کی سعی جاری رکھی ہے، لیکن زمانہ انہیں پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا۔ اچانک اقبالؒ ہمارے ملی محاذ پر ابھرا، ہمارے عالم افکار کا یہ شاہین، یہ عقاب چونکہ اُس علم سے خود آراستہ، اُس فکر کا رازداں اور اُس تہذیب کا خود غواص تھا جس سے معرکہ درپیش تھا، اس لیے جب اس نے آکر مورچہ سنبھالا اور دورِ حاضر کے خلاف "اعلانِ جنگ" کر دیا تو کشمکش کا پانسہ پلٹنے لگا۔ نوجوان نسل کے جذبات نے بالکل نئی کروٹ لی، اور ملی شعور ایک نیا موڑ مڑ گیا۔ اقبالؒ کے کام سے آگے کی مہم کو مودودی نے سنبھال لیا۔ اس نے تفصیل سے جدید افکار، جدید تہذیب اور جدید نظاموں پر تنقید کی اور براہِ راست اس سیلاب کو سمجھ کر تنقید کی۔ مسلمانوں کی اس تاریخی حالت کا تجزیہ کر کے ان کے سامنے رکھا جس کے زیرِ اثر وہ ایک خاص طرح کی محکومانہ نفسیات کا شکار ہو رہے تھے، پھر مثبت طور پر اسلامی آئیڈیالوجی اور نظام کے ایک ایک پہلو کی قدر و قیمت کو ان پہ واضح کیا، اور اسی سائنٹفک معیارِ استدلال سے واضح کیا جو اس دور کا معیار تھا۔ اس مہم کے نتیجے میں "احساسِ کہتری" کا رتوندا اور بقولِ مودودی "یرقانِ ابیض" ان کی آنکھوں سے دور ہوا۔ انہوں نے نگاہیں اٹھا کر از سرِ نو جو غور کیا تو وہ اپنے آپ کو از سرِ نو جان کر حیرت میں رہ گئے کہ ہیں! ہم یہ کچھ ہیں!!

مودودی دیکھ رہا تھا کہ آزادی کی تحریک اٹھ رہی ہے، انقلاب آنے

والا ہے ۔ اگر ٹھیک وقت پر مسلمانوں کو فکری مرعوبیت اور احساسِ کمتری اور ذہنی غلامی اور مغرب کی اندھی تقلید سے نہ نکال لیا گیا تو انقلاب آجانے کے بعد تعمیرِ نو بالکل غلط نقشے پر شروع ہو جائے گی اور پھر سالہا سال تک نہ تو قوم کو اپنی ملّی خودی کو زندہ کر کے اپنی دنیا آپ بنانے کی توفیق ملے گی اور نہ خود اسلام ہی کے اُٹھنے کا کوئی امکان باقی رہے گا ۔ اس لیئے اس نے اس کشمکش میں مسلمانوں کی ذہنی اسلحہ بندی کے لیئے پوری پوری محنت و کاوش صرف کی ـــــ اس محنت و کاوش کے نتائج یوں تو مودودی کی ایک ایک سطر میں گھلے ہوئے ہیں، لیکن خصوصیت سے جو کتاب خاص اسی کشمکش کے زیرِ اثر لکھی گئی ہے وہ "تنقیحات" ہے ۔ تنقیحات وہ مربوط مجموعۂ مقالات ہے جو ان تمام سوالات اور اعتراضات اور ان تمام شکوک اور غلط فہمیوں پر بحث کرتا ہے جن سے مسلمان دوچار تھے ۔

مودودی وہ شخص ہے جس نے نظریات کے میدان میں ہم کو دوسروں کا بھکاری بنے دیکھا اور ہمارا ہاتھ پکڑ کے وہ ہمیں اپنے گھر کے ان قیمتی خزانوں تک لے آیا جن کو ہم فراموش کر چکے تھے، یا جن کی قدر و قیمت ہماری نگاہوں میں ختم ہو رہی تھی ۔ اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اپنی زندگی ہی کا نہیں، اپنی ترقی ہی کا نہیں، اپنی فلاح ہی کا نہیں، ساری نوعِ انسانی کی زندگی اور ترقی اور فلاح کا سر و سامان ہمارے اپنے پاس ہے ۔ اب ہم نہ سرمایہ دارانہ نظام کے در کے بھکاری ہیں، نہ اشتراکی فکر و تمدن کی بارگاہ کے سائل، بلکہ اب ہم کسی سے لینے کے بجائے دوسروں کو وہ کچھ دینے والے ہیں جو ان کے پاس نہیں ہے ۔ اب ہمیں وہ مقام ملا ہے جس پر آئے بغیر کوئی گروہِ انسانی ترقی اور فتوحات کے دروازے اپنے لیئے کھول نہیں سکتا ۔ اب ہمیں اُس "سِم سِم" کی کنجی ہاتھ آئی ہے جس سے ہم ایک نئی دنیا کے تالے کھول سکتے ہیں ۔ اب ہم خود شناس ہیں ۔ اب ہماری آنکھوں میں نگاہِ تنقید کی نئی چمک

ہے۔ اب ہم اپنے دین کے بارے میں کسی احساسِ کہتری میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ الٹا ایک فخر اور ایک برتری کا احساس اپنے اندر پاتے ہیں۔ اب ہمارا اندازِ گفتگو معذرت خواہانہ (Apologetic) نہیں رہا بلکہ داعیانہ ہے۔

# ذہن کا حُسنِ ترتیب

بہت سے وہ لوگ ہمارے اندر موجود ہیں جو معلومات کے سمندر کے سمندر دماغ میں اُتار جاتے ہیں، جن کا مطالعہ غیر معمولی حد تک وسیع ہوتا ہے، لیکن زندگی کی کوئی ایک گرہ سلجھا نہیں سکتے، اور کسی ایک مسئلے کے صحیح حل کا راستہ نہیں نکال سکتے۔ کتابیں لکھتے ہیں اور بے حساب لکھتے ہیں، مقالات نگاری کرتے ہیں اور بڑے بڑے اونچے معیار پر کرتے ہیں، ساری ساری عمر جرائد نکالتے ہیں اور بڑی مقصدیت کے ساتھ نکالتے ہیں، اخبار نویسی کرتے ہیں اور زوردار طریقے سے کرتے ہیں، لیکن زندگی جن الجھنوں میں گھری ہے، دماغ جن پیچیدگیوں میں مبتلا ہیں، خیالات جس طرح متصادم ہیں، مسائل جس طرح پیچ در پیچ ہیں، ان کے برسوں کے کارناموں کے بعد بھی سب کچھ جوں کا توں رہتا ہے اور کوئی ایک گرہ وہ نہیں کھول سکتے، بلکہ الٹا سینکڑوں گرہیں ڈال کے رخصت ہوتے ہیں۔ جس انتشار کے سمندر میں سوسائٹی غوطے کھا رہی ہوتی ہے ان کے کارنامے اس کی طوفان خیزیوں میں کچھ اضافہ ہی کرتے ہیں کمی نہیں کر سکتے۔ وجہ کیا ہے؟

وجہ یہ ہے کہ وہ نہ اپنے ذہن کا جائزہ لے کر اسے منظم کر سکتے ہیں، نہ حاصل شدہ معلومات اور ذخیرۂ علم کو اس میں کسی اچھی ترتیب سے رکھ سکتے ہیں، نہ کسی مسئلے، کسی بحث، کسی سوال، کسی حالت، کسی کشمکش، کسی تاریخی دور، کسی تحریک اور کسی تہذیب کا صحیح تجزیہ کر کے اس پر مرتب طریق سے غور و فکر

کر سکتے ہیں۔ ان کا اپنا ذہن ایک کباڑ خانہ ہوتا ہے جس میں کیل، پُرزے بوتلیں، کپڑے، برتن، لمپ، ہیرے، موتی سبھی طرح کی چیزیں بے ڈھب طریقے سے بکھری ہوتی ہیں۔ اس غیر مرتب اور غیر منظم ذہن کے ساتھ وہ مسائل وحالات کا کبھی صحیح تجزیہ نہیں کر سکتے، بلکہ انتشار سے چلتے ہیں اور سارا راستہ اپنی بے شمار قیمتی معلومات اور بے شمار لایعنی مزخرفات کو بکھیرتے ہوئے ایک خطرناک انتشار پر جا کے سفر ختم کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ معلوماتی مواد کے سرمایہ دار ہونے کے باوجود کبھی مفکر نہیں بن سکتے۔

مودودی کو مفکرانہ مرتبے پر لانے والی ایک خصوصیت اس کا یہی منظم اور مرتب ذہن ہے۔ عملی تجربات ومشاہدات، کتابی مطالعے اور ذاتی غور و تفکر سے وہ جو موادِ معلومات بھی حاصل کرتا ہے، وہ بہترین سارٹنگ کے ساتھ اس کے ذہن میں جگہ پاتا ہے۔ اس منظم اور مرتب ذہن کے ساتھ جب وہ کوئی کام کرنے لگتا ہے تو اس کا سب سے بڑا کمال ماہرانہ تجزیہ ہے۔ وہ معاشرے کو لے گا تو اس کے عناصر کا تفصیلی تجزیہ کرے گا۔ وہ کسی بحث میں حصہ لے گا، تو پہلے موضوعِ بحث اور میدانِ بحث کا تجزیہ کرے گا، وہ کسی فکر و نظام پر بات کرے گا، تو بات کرنے سے پہلے اس کا تجزیہ کرے گا، وہ کسی سوال سے دوچار ہوگا، تو سوال اور اسے پیدا کرنے والے ذہن کا تجزیہ کرے گا وہ کسی سے مخاطب ہوگا، تو اس کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کرے گا، وہ کام کرنے کے لیے کوئی پروگرام اختیار کرے گا تو لازماً اس پروگرام کا تجزیہ کر کے اس کے ایک ایک حصّے کے لیئے منصوبہ بندی کرے گا۔ ہمارا معاشرہ جس پست ذہنی سطح پر ہے اور جس طرح فکری کشمکش سے دوچار ہے اور جو ذہنی انتشار اس میں شائع و ذائع ہے اس کی وجہ سے جو سوال پیدا ہوتے ہیں پہلے تو وہ خود الجھ جاتے ہیں، پھر ان کے جو جواب دیئے جاتے ہیں وہ سوال سے زیادہ الجھ کر سامنے آتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ

سوال تو لا ینحل ہو کے رہ گیا کچھ دوسرے سوال اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ الجھے ہوئے نکلے۔

مودودی کے لٹریچر کو پڑھیے، اس کے خطوط کو دیکھئے، اس کی تقاریر سنیئے، ہر جگہ آپ کو حالات اور مسائل کے ایسے تجزیے کے آثار ملیں گے جن کے تحت ایک ایک بات بالکل اپنی فطری ترتیب میں آئے گی اور سلسلۂ خیالات کی ہر کڑی کا ربط دوسری کڑی سے منطقی قسم کا ہو گا۔ وہ اپنے خیالات کا سفر کبھی بھی منحنی خطوط پہ نہیں کرتا، بلکہ پہلے نقطۂ آغاز کو اور غایتِ آخر کو قطعی یقین سے سامنے رکھ لیتا ہے۔ پھر ایک ایک قدم بالکل خطِ مستقیم میں رکھتا ہوا اپنا سفر ختم کرتا ہے، یہ راست فکری (Straight Thinking) اور راست کلامی اس کا ایک بڑا ہی قیمتی کمال ہے جس کے بغیر وہ عالم تو ہو سکتا تھا مفکر نہیں ہو سکتا تھا۔

مودودی کی یہ وہ خصوصیت ہے کہ اس کے لٹریچر کو کچھ عرصہ تک پڑھنے والے لوگ بھی اس سے اثر اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

## مودودیؒ ایک وسطی مقام پر

اب مجھے اس کے مفکرانہ مقام کے بارے میں صرف ایک پہلو اور واضح کرنا ہے۔ تاریخی شخصیتوں میں دیکھنے کی ایک چیز یہ ہوتی ہے کہ تاریخی حالات اور معاشرے کے مختلف عناصر کے اندر وہ کونسی پوزیشن لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے مودودی کا مقام بڑا ہی اہم ہے۔ ہماری سوسائٹی نظریات اور کلچر کے لحاظ سے دو حصوں میں بُری طرح بٹ رہی تھی۔ ایک طرف مذہبی عناصر تھے جو زندگی کے نظام سے بے تعلق ہو کر فسادِ ماحول کے خلاف ایک منفعلانہ اور منفی قسم کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ دوسری طرف جدید طبقہ تھا جو اسلام سے باغی ہو کر نہیں، تو کم سے کم بے نیاز ہو کر زندگی کے

اجتماعی نظام کو اندھا دھند چلائے جا رہا تھا۔ وہ لوگ زندگی کی گاڑی کو اسلامی نصب العین کی طرف لے جانے کا راستہ جانتے تھے، مگر اس کی ڈرائیونگ کا ان کو عملی تجربہ نہیں رہا تھا۔ یہ گاڑی چلانا جانتے تھے، مگر راستہ بھول چکے تھے۔ ایک کو دین کی حقیقتوں کا علم تھا، مگر جدید حالات اور جدید نظریات سے بے ربطی تھی۔ دوسرے کو جدید حالات و نظریات کی مہارت تھی، مگر دین کا ماہرانہ علم نہیں تھا۔ انگریزی استیلا نے پہلے تو دونوں کو دین و سیاست کی تفریق کے نظریے پر کام کرکے باہم دگر پھاڑ دیا اور پھر آہستہ آہستہ ان کو حریف بنا ڈالا۔ دونوں کے درمیان ایک دوسرے سے لین دین کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ الٹا تنفر اور کھینچا تانی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ادھر یہ دعویٰ کہ دین کا ہم علم رکھتے ہیں تم کو ہماری رہنمائی ماننی چاہیئے۔ ادھر سے یہ مطالبہ کہ زندگی کا جو نیا نظام ہم اپنے روشن دماغوں سے چلا رہے ہیں اس دور میں یہی ذریعہ ترقی ہے، لہٰذا دین کو بھی اگر رہنا ہے تو اپنے آپ کو اس سے ہم آہنگ کرلے۔ اس کھینچا تانی نے آہستہ آہستہ دونوں اہم عناصر کے درمیان طبقاتی بُعد پیدا کرنا شروع کیا۔ تعلیمی مراکز الگ ہو گئے، تنظیمی ہیئتیں الگ الگ ہو گئیں، لباس اور کلچر الگ الگ ہو گئے، بولیاں اور دلچسپیاں الگ الگ ہو گئیں، مسائل اور سرگرمیاں الگ الگ ہو گئیں، یعنی بجائے اس کے کہ معاشرہ اپنی ساری طاقت جمع کرکے ناپسندیدہ حالات اور بیرونی اثرات سے کشمکش کرنے اور کسی صحیح نقشے پر تعمیر نو کرنے کی تیاریاں کرے، الٹا اس کی دو قیمتی طاقتیں کہ جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ضروری صلاحیت سے آراستہ تھی، آپس میں معرکہ آرا ہوتی نظر آئیں۔ دونوں طرف ایک نہ ایک قسم کی کوتاہیاں موجود تھیں۔ اور دونوں طرف کسی نہ کسی طرح کی انتہا پسندیاں کارفرما تھیں۔ حد یہ کہ ان کے ہاں مولوی کا لفظ گالی بنا دیا گیا اور ان کے ہاں مسٹر کا لفظ ملاحی بن گیا۔ زوال اور غلامی میں مبتلا ہونے

والی قوموں کو ایسے تباہ کن حالات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔

لیکن مودودی وہ پہلا شخص ہے جس نے وہ خطِ اعتدال فراہم کر دیا جس پر دونوں طرف کے لوگ آ کر شانہ بشانہ کھڑے ہوں اور تاریخ سازی میں اپنا حصّہ ادا کر سکیں۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مودودی دونوں طرف کے علوم[1] سے بہرہ اندوز تھا۔ دونوں طبقوں کو دیکھ بھال کے آ رہا تھا۔ دونوں کی خوبیاں اور دونوں کی کمزوریاں اور دونوں کا جوہرِ مشترک اس کے سامنے واضح تھا، چنانچہ خود اپنے بارے میں اسی کے الفاظ دیکھئے۔

"فاضل تنقید[2] نگار اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں گروہِ علماء میں سے ہوں اور مولوی ہونے کی حیثیت سے جدید تعلیم اور جدید تعلیم یافتہ گروہ پر حملہ کر رہا ہوں، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مجھے گروہِ علماء میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میں ایک بیچ کی راس کا آدمی ہوں، جس نے جدید اور قدیم دونوں طریقہ ہائے تعلیم سے کچھ کچھ پایا ہے اور دونوں کوچوں کو خوب چل پھر کر دیکھا ہے، اپنی بصیرت کی بنا پر نہ تو میں قدیم گروہ کو سراپا خیر سمجھتا ہوں اور نہ جدید گروہ کو، دونوں کی خامیوں پر میں نے آزادی کے ساتھ تنقید کی ہے، اس لیئے میرا

---

[1] جو لوگ مولینا مودودی کو گالی دینے کے لیئے "ملّا" کہتے ہیں اُن میں سے اکثر کو شاید انگریزی زبان کی اتنی کتابیں سرسری نظر سے دیکھنے کا موقع بھی نہ ملا ہوگا جو اس شخص کی لائبریری میں ہیں اور جن میں سے بے شمار کے صفحات پر اس کے نشانات اور حاشیے لگے ہوئے ہیں۔

[2] مراد ہیں خان بہادر نواب ذکاء اللہ مرحوم جنہوں نے سیاسی کشمکش کے مباحث پر مسلسل تنقیدیں لکھی ہیں۔

کوئی خاص رشتہ کسی گروہ سے نہیں ہے"۔

(ترجمان القرآن جلد ۴۱ عدد ۲، صفحہ ۲۱۷)

یعنی مولینا مودودی نے دونوں گروہوں کی طبقاتی پوزیشن میں سے کسی کو قبول نہیں کیا۔ دونوں کے بیچ میں ایک مقام پر کھڑے ہو کر دونوں پر ضروری تنقید کی ہے۔ دونوں کے اندر جو پہلو کام کے ہیں ان کی اہمیت واضح کی ہے، جو کمزوریاں ہیں ان کو بے نقاب کیا ہے، اور پھر دونوں کے سامنے اپنی دعوت اس طرح رکھی ہے کہ اس میں کچھ وجوہِ جاذبیت اُدھر والوں کے لیئے ہیں، کچھ ادھر والوں کے لیئے۔ مثلاً مولینا مودودی اصول تو اسلام سے لینا چاہتے ہیں اور اس میں اٹل ہو کر بات کرتے ہیں، لیکن دوسری طرف اس اصول پر کام کرنے کے لیئے اجتہادی نقطۂ نظر کو لازم قرار دیتے ہیں۔ وہ نظریۂ زندگی تو سو فیصد اسلامی رکھتے ہیں، لیکن عملاً زندگی کا نظام بنانے میں وہ جدید ذرائع و وسائل، ادارات کی جدید اشکال اور ڈھانچوں، نئے دور کی علمی ترقیوں، سب سے کام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ جدید علوم سے استفادہ ضروری قرار دیتے ہیں، مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ان کے مرکزی نظریے کو ہٹا کر اس کی جگہ اسلامی نظریہ رکھ دیا جائے۔ وہ دعوت توجوں کی توں وہی لیتے ہیں جو قدیم سے قدیم انبیاء سے لے کر اب تک ایک ہی رہی ہے، مگر اسے پیش کرنے کے لیئے جدید انداز، جدید اسلوب، جدید زبان اور جدید پیرایوں کا اختیار کرنا لازمی مانتے ہیں۔ وہ قانون کے اصول شریعتِ اسلامیہ ہی سے لینا چاہتے ہیں، مگر دوسری طرف پچھلے دور کی طے شدہ فقہی جزئیات کو ان اصولوں کے ساتھ دوامی شریعت کی حیثیت دینے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ دستور کے لیئے آئیڈیالوجی تو بلا آمیزش خدا اور رسول سے لیتے ہیں، لیکن اس کے کام کرنے کے لیے جدید حالات کے تقاضوں کے مطابق کوئی سا موزوں خارجی ڈھانچہ مرتب کر لینے

کے حق میں ہیں۔

ایک وسطی مقام سے مولینا نے اپنی دعوت دونوں عناصر کو یکساں پیش کی ہے اور دونوں سے کام کے آدمی حاصل کیئے ہیں، مگر ان کا عملی تجربہ یہ ہے کہ ان کی دعوت پر لبیک کہنے، اس کے سانچے میں کردار کو ڈھالنے اور اس کے لیئے جدوجہد کرنے کے لحاظ سے جدید طبقہ نے بہت زیادہ اور بہت کام کے آدمی فراہم کیئے ہیں۔ چنانچہ اب بھی نوجوان طلبہ کے حلقوں میں یہ دعوت جس طرح اپنے راستے تیزی سے بنا رہی ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یا تو اس دعوت میں جدید طبقے کے لیئے اپیل نسبتاً زیادہ ہے، یا جدید طبقے میں کام کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے۔ غالباً یہ دونوں ہی باتیں ہیں۔

مودودی دنیا کے اُن خوش نصیب مفکروں میں سے ہے جن کا فکر ان کی زندگی میں عملی تحریک کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس میں تاریخی احوال کے عمل کا بھی بڑا اثر ہے اور اس کاوش اور جدوجہد کا بھی بڑا حصّہ ہے جو مولینا مودودی نے سال ہا سال صبر اور بے لوث اخلاص کے ساتھ حالات پر اثر انداز ہونے کے لیئے صرف کی ہے۔ آج جبکہ مودودی کا فکر ایک کتابی دعوت کے درجے سے بلند ہو کر ایک وسیع تحریک کی شکل میں کام کر رہا ہے، مودودی کی اپنی اہم اور قیمتی شخصیت اس تحریک کے ہوتے ہوئے ثانوی مقام پر چلی گئی ہے۔ اب اصل چیز یہ تحریک ہے اور مودودی اس کا ایک کارکن ہے ــــ چاہے کسی بھی درجے کا کارکن ہو!

اس مودودی کے بارے میں جو لوگ کسی سیاسی اور جزئی معاملے میں اس کی رائے یا تقریر ــــ وہ بھی متعصب اخبار نویسوں کی مسخ کردہ ــــ پڑھ کر ایک مستقل رائے قائم فرمالیتے ہیں اور پھر اسی رائے کی عینک لگا کر آئندہ کی ہر چیز کو دیکھتے چلے جاتے ہیں، کاش کہ انہیں بتایا جاسکتا کہ ایسی شخصیتوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کا طریقہ

یہ نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے اختلاف کرنے والے بھی ان
کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے کام کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کو
ملک و قوم کے لیئے باعث عزت سمجھتے ہیں۔

# بلاکشِ وادیٔ شوق

گرفتاری —— اور اچانک گرفتاری سے جب سامنا ہوتا ہے تو ایک صاحبِ دعوت اور صاحبِ مقصد کی سیرت کے ایسے گوشے اپنی جھلک دکھاتے ہیں جن سے اس کے قریب ترین ساتھی بھی پہلے کبھی پوری طرح واقف نہیں ہو سکتے۔ ایک ادنیٰ درجے کے آدمی کی وہ کمزوریاں اس وقت بے نقاب ہوتی ہیں جن سے وہ خود بھی پوری طرح آگاہ نہیں ہوتا۔ اور اونچے درجے کے مردانِ کار کی شخصیتوں کی عظمت کے ایسے پہلو دکھائی دے جاتے ہیں، جو ان کی قدر و قیمت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔

## وہی شخصیت

مولانا اس نفسیاتی لمحے کی آزمائش سے جب پہلی مرتبہ ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں گزرے تھے، تو یہ واضح ہو گیا تھا کہ اس شخص کی سیرت عام حالات میں جتنی اونچی ہے آزمائش میں آکر وہ اس سے زیادہ اونچی ہو جانے والی ہے۔ اس زمانے میں حکومت کے براہِ راست اور بالواسطہ پروپیگنڈے سے، نیز بعض اخبارات کے مخالفانہ محاذ اور بعض مولویوں کے فتووں اور خطبوں نے رائے عامہ کی فضا کو اتنا مکدّر کر دیا تھا کہ دماغی سکون کو برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا، لیکن مولانا اس طوفانی ماحول میں جس شان سے عزیمت کی چٹان بنے رہے اس نے جماعت کے ایک ایک فرد میں سچائی پر قائم رہنے کا مضبوط جذبہ پیدا کر دیا۔ حال یہ تھا کہ مسجد کے منبروں سے مولانا کے قتل کیے جانے کی علانیہ ترغیب دلائی جا رہی تھی اور سڑکوں پر

چلتے پھرتے کارکن بسا اوقات یہ اندیشہ محسوس کرتے تھے کہ ہم پر کہیں بھی غنڈوں کی طرف سے حملہ ہو سکتا ہے اور ایک ایک چیز کی اطلاع لے کر ہم سب بار بار مرکز آتے تھے، لیکن مولانا سے بات کرتے ہی ساری تشویش رخصت ہو جاتی اور عزم و ہمت کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی۔ مولانا کارکنوں کی گھبراہٹ کا پرتو قبول کرنے کے بجائے ہمیشہ ان پر اپنی عزیمت کا پرتو ڈال دینے میں کامیاب رہے، جب کوئی آتا تو وہ دور ہی سے اس کے چہرے سے نفسیاتی مطالعہ کر لیتے اور سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ پوچھتے۔ "کہیے جناب! کیا حالات ہیں؟" ۔ اور آنے والے کی جذباتی کیفیت بات کرنے سے پہلے ہی بدل جاتی ۔ مجھے یاد ہے کہ اسی زمانے میں کسی مرزئی پرغالباً اخبار کا نام لینا غیر ضروری ہے، ایک توٹ کا میں نے مولانا سے تذکرہ کیا کہ اس نے ہمارے بارے میں یہ الزام تراشی کی ہے اور یوں یوں حکومت اور عوام کو اکسایا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں، اس اخبار کو اپنا کام کرنے دیجئے اور صاف صاف کہیے کہ "ہم لوگ اقراری مجرم" ہیں۔ میری تشویش ختم ہو گئی، اور یہی الفاظ ایک مصرعہ بن کر ذہن نشین ہو گئے۔ اسی رات میں نے اپنی نظم "ہم لوگ اقراری مجرم ہیں" مکمل کر لی۔ مجھے یاد تو نہیں، لیکن خیال ہے کہ ہمارے اس مستقل کرم فرما اخبار نے صاف صاف لفظوں میں ہمیں غدار قرار دیا تھا چنانچہ اسی وجہ سے ایک مصرعہ یوں ڈھلا!

یہ نگری اندھی نگری ہے تو اے راجا! غدار ہیں ہم

مولانا کی تلقین یہ تھی کہ مخالف سے مخالف ماحول کے خطرناک ترین گوشوں میں گھسیے اور پوری ہمت کے ساتھ اپنی صحیح پوزیشن پیش کر دیجئے، چنانچہ کارکنوں کا یہ حال تھا کہ انہوں نے حکومت، پولیس اور مولویوں کے وسیع مخالفانہ محاذ کے بالکل سامنے آ کر جھوٹ کے غبار سے

فضا کو صاف کرنے کی حوصلہ افزا مثالیں قائم کردیں، پھر جب مولانا نے تجویز کیا کہ شہر کے عین طوفانی مرکز میں جلسے کیئے جائیں اور عوام کو براہِ راست اپنے موقف سے آگاہ کیا جائے، تو پہلا آزمائشی موقع برکت علی محمڈن ہال مقرر کیا گیا جس میں باقر خان صاحب کو صدارت کے لیئے اور مجھے تقریر کے لیئے بھیجا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ حالات کی ناسازگاری میں جب ہم نکلے تو ہراس کا شائبہ تک نہ تھا، بلکہ ایک بڑی بازی کھیل جانے کی اسپرٹ دلوں میں کام کر رہی تھی۔ مولانا خود اس روز یہ اندیشہ رکھتے تھے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کا امکان ہے اور ہماری واپسی تک برابر دفتر کے صحن میں موجود رہے۔ اس کے بعد شہر کے تمام حصّوں میں پے در پے چھوٹے چھوٹے جلسے کیئے جانے لگے۔

اس دوران میں متعدد لوگوں نے مولانا کی گرفتاری کے امکان سے آگاہ کردیا تھا۔ دوسری طرف ایک خطرناک تر سازش کی افواہ بھی ملی اور ہم نے چاہا کہ مولانا کسی قدر احتیاط سے کام لیں، لیکن انہوں نے ہمیشہ کی طرح کہا کہ جب تک اللہ تعالیٰ مجھ سے اپنے دین کی خدمت لینا چاہتا ہے، میں اپنے لیئے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا، اور جب اس کی طرف سے یہ مہلت ختم ہوجانے والی ہوگی۔ تو پھر کوئی احتیاط حفاظت کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ —— ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں دفتر "کوثر" میں کام کر رہا تھا کہ اچانک اپنے ہی ایک نوجوان آئے اور انہوں نے علیحدگی میں مجھ سے کہا کہ مولانا کی گرفتاری کا قطعی فیصلہ ہوچکا ہے۔ میں نے یہ خبر سن کر فوراً کام بند کردیا اور معمول کے خلاف قبل از وقت مرکز آگیا۔ دوپہر کا وقت تھا، مولانا کا دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ آرام کر رہے ہیں۔ میں نے کسی بچے کے ذریعے کہلوایا کہ بہت ضروری پیغام دینا ہے اور مولانا جس حال میں ہوں مجھے ابھی ملنا ہے۔ اطلاع اندر گئی، دروازہ کھلا اور مولانا کو

ایمں سنے مطلع کردیا مولانا کے چہرے کی معمول کی جھلک میں کوئی فرق نہیں آیا جس پر مجھے کچھ یوں محسوس ہُوا کہ بڑی غیر ضروری اطلاع میں نے دی ہے۔ یہ تھی اس شخص کی عظمت!

## سیفٹی ایکٹ

۴ ۔اکتوبر ۵۲ء کو گلے کی شدید خرابی کی وجہ سے مجھے حرارت تھی۔ نہ میں دفتر گیا، نہ اور کہیں باہر نکلا۔ مغرب کے وقت عبدالوحید خان صاحب کے ایک عزیز آئے اور انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور مجھے بلا کر اچانک یہ خبر سنائی کہ:

"طفیل صاحب گرفتار ہو گئے اور وہ تھانے میں ہیں اور مجھے ان کا بستر لے جانے کے لیے بھیجا ہے"۔

جلدی ہی انہوں نے یہ بھی بتایا کہ:

"تلاشی ہوئی اور مطالبۂ حق (میرا لکھا ہوا ضبط شدہ پمفلٹ)
کی ایک کاپی برآمد کر کے پولیس ساتھ لے گئی ہے"۔

اب میں نکلا کہ جا کر مرکز میں اطلاع کر دوں، وہاں پہنچا تو درس آخری مرحلے پر تھا۔ وہ ختم ہوا تو ڈی ایس پی صاحب جو وہاں موجود تھے انہوں نے مولانا سے علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش کی اور بات ہو گئی بلکہ فوراً ہی بات کھُل گئی۔ مولانا کھانا کھانے اور تیار ہونے کے لیے اندر چلے گئے۔ ہم سب لوگوں پر اس بات کا گہرا اثر تھا کہ حکمران طاقت مسلمانوں اور ان کے ملک کے حقیقی خیر خواہ کے ساتھ بالآخر وہی ظالمانہ سلوک کرنے پر تل گئی ہے جس کے نمونوں سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے۔ کچھ دیر کے بعد مولانا کا بستر آ گیا، پھر کچھ وقفے کے بعد مولانا شیروانی پہنے ٹھیک اسی طرح ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ نمودار ہوئے جیسے وہ کسی سفر پر جاتے وقت دکھائی دیتے تھے ——— کوئی فرق نہ تھا! اور برآمدے کے کنارے پر

کھڑے کھڑے انہوں نے یہ کہہ کر پان طلب کیا۔
"ڈبیہ بٹوا کہاں ہے، آخری پان کھا لیا جائے"
پوچھا گیا کہ آخری کیوں؟ ہنستے ہوئے فرمانے لگے:
"بس اب طلاق دے رہا ہوں"

پان جیسے رفیق کے بارے میں مولانا کا یہ فیصلہ سن کر میں نے پوچھا کہ کیا جیل کے بعد بھی طلاق جاری رہے گی؟ تو فرمایا:
"نہیں! یہ طلاق رجعی ہے مغلظ نہیں"

اس پر سید نقی علی صاحب اور دوسرے لوگ خوب قہقہہ لگا کر ہنسے یوں یہ شخص ہنستے ہنساتے مصافحہ کر کے نامعلوم مدت کی قید کے لیے مسلح پہرے میں جیپ گاڑی کے اندر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

## مارشل لاء

یہ سماں ذہن میں رکھتے ہوئے، دوسری گرفتاری کا منظر معلوم کرنے کی جو خواہش دل میں تھی اُسے پورا کرنے کے لیے فقیر حسین صاحب سے دریافت کیا کہ مولانا کس طرح روانہ ہوئے۔ فقیر حسین صاحب سے خاص طور پر میں نے یہ بھی پوچھا کہ رات کو مولانا سے ملنے والا، یا ان کے بارے میں کچھ دریافت کرنیوالا آخری شخص کون تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک نوجوان طالب علم مولانا سے دیر تک ڈارون کے نظریئے پر گفتگو کرتے رہے، ان کے بعد اندر کوئی آدمی نہیں آیا۔ مولانا اندر چلے گئے اور یحییٰ صاحب اور فقیر حسین صاحب سو گئے۔ فقیر صاحب کو جب جگایا گیا تو ہر طرف روشنی ہو رہی تھی، اٹھتے ہی ان کی نگاہ یحییٰ صاحب پر پڑی، جو جلدی جلدی اپنی ٹانگوں سے سُتلی کھول رہے تھے، (ٹانگوں میں درد کی وجہ سے انھوں نے یہ انوکھی تدبیر اختیار کی تھی)۔ فقیر صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا کیا معاملہ ہے۔ جواب

میں یحییٰ صاحب نے دونوں ہاتھ کسی قدر اٹھا کر دبے لفظوں میں کہا:
''پو... لی... س! بہت جلد ان کو مطلع کر دیا گیا کہ ان کے گھر کی بھی تلاشی ہو گی
اور ان کو گھر چلنا ہے۔ فقیر حسین صاحب اٹھ کر مولانا کے دفتر کی طرف جانے
کے لئے نکلے، جہاں اس وقت کارروائی ہو رہی تھی تب باہر پولیس اور فوج
ہر طرف پھیلی نظر آئی۔ معاً دو آدمی ان کے گرد ہو گئے، فقیر صاحب مولانا
کے کمرے میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ چند اصحاب مولانا کی میز کے گرد
بیٹھے ہیں اور تلاشی ہو رہی ہے۔ مولانا اپنی تیاری کے سلسلے میں غسل خانے
سے نکلے، فقیر صاحب کہتے ہیں کہ مولانا اس سے بالکل بے نیاز تھے کہ ان
کے کاغذات کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے اور کون کس حرکت میں مصروف
ہے۔ فقیر صاحب کو جماعت کے خزانے کی فکر تھی، وہ چاہتے تھے کہ مولانا
سے سیف کی کنجیوں کے بارے میں کوئی ہدایت حاصل کریں کہ یہ کس کی تحویل
میں دی جائیں۔ لیکن غالباً ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ کنجیوں کے بارے
میں "اغیار" کو کچھ معلوم بھی نہ کرایا جائے اب وہ حیران تھے کہ مولانا سے کس طرح
بات کریں۔ آخر کنجیاں دکھا کر انھوں نے محض اشارے سے سوال کیا۔ مولانا
نے بغیر کسی اہتمام کے دور ہی سے کہا "اُن کو یحییٰ صاحب کے حوالے کر
دیجئے"۔ اور کنجیاں پولیس کے قبضے میں چلی گئیں بلکہ خود خزانہ بھی اور حساب کتاب
کے کاغذات بھی!!

مولانا کی کیفیت وہی تھی کہ جیسے سفر پر جا رہے ہوں!
دکیسے معلوم تھا کہ یہ سفر ایسا ہے کہ جس کی راہ میں پھانسی کی کوٹھڑی
بھی آئے گی!!)

## شاہی قلعے میں

قلعے سے تقریباً ہر روز کچھ لوگ نکال کر بورسٹل جیل لائے جاتے آنیوالے

اس تاریخی جہنم عقوبت کی روز افزوں آبادی کے بارے میں کچھ نہ کچھ خبریں لے آتے تھے، چنانچہ یہ اطلاع مل گئی کہ مولانا مودودی بھی قلعے میں ہیں۔

مولانا اصلاحی، چراغ دین، نذیر حسین، عبدالوحید خاں قلعے سے واپس پہنچے اور اپنی اپنی سرگزشت بیان کی یاد نہیں ان میں سے کس نے بتایا کہ کہیں آتے جاتے ان کی نگاہ بھی مولانا پر پڑی ہے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ وہ ان حضرات کی کوٹھڑیوں سے اوپر کسی کمرے میں رکھے گئے تھے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ گھر کے لوگوں کو ان سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ نیز ان کو کوئی سامان مطالعہ حتیٰ کہ قرآن بھی نہیں دیا گیا۔

## سنٹرل جیل

یہ تو محفوظ نہیں رہا کہ مولانا کس تاریخ کو سنٹرل جیل لائے گئے، وہ بہرحال ہمارے بورسٹل جیل سے . . . . . . . . سنٹرل جیل لے جائے جانے سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ اس کی اطلاع ہمیں بورسٹل جیل ہی میں مل چکی تھی، غالباً ۴ اپریل کے لگ بھگ مولانا قلعے سے باہر لائے گئے۔ گھنٹی گھر کے میدان میں اندراجات ہو جانے کے بعد ہمارے لیئے جب سیاسی[1] خانہ الاٹ ہوا تو اصلاحیؔ صاحب کو بتایا گیا کہ انھیں دیوانی[2] گھر جانا ہے جہاں مولانا مودودی پہلے سے ہیں، چنانچہ پہلے اصلاحیؔ صاحب نمبردار کی معیت میں ہم سے رخصت ہوئے اور اس وقت وہ ایک شدید تاثر میں تھے۔ "اچھا رفیقو! خدا تم سب کا نگہبان ہو" یہ کہا اور مصافحے کر کے چلے گئے۔

غالباً اسی رات کی تاریکی میں آتے جاتے وارڈروں نے مولانا کی خیر و عافیت سے آگاہ کیا۔ اور اگر کوئی واسطہ نہ بھی ہوتا تو خدا کے فرشتے تو تھے جو ہماری طرف سے سلامتی کی دعائیں اُدھر پہنچاتے تھے، اور اُدھر سے محبت کے پیام اِدھر لاتے تھے۔

---

[1] [2] سنٹرل جیل کے دو احاطوں کے نام

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا کو بالکل ہماری طرح "سی کلاس" دی گئی ہے ہمیں تو خیر "زیڈ" کلاس بھی دے دی جاتی تو ہمارے ملک کی حکومتِ عالیہ کو احساس نہ کرنا چاہیئے تھا، لیکن مولانا مودودی کو "سی کلاس" دے کر جس انتقامی پستی کا ثبوت دیا گیا وہ جمہوریت کے دامن پر شرمناک داغ ہے۔ مودودی ایک تحریک کا رہنما ہی نہ تھا' ایک نئے دورِ تاریخ کا افتتاح کرنے والا تاریخ ساز بھی ہے۔ وہ الجہاد فی الاسلام، تنقیحات، پردہ، اور تفہیم القرآن جیسی اونچی تصانیف کا مصنف ہی نہیں نئی نسل کے ذہن و کردار کا معمار بھی ہے وہ زندگی بخش نظریات و خیالات دینے والا ادیب ہی نہیں اپنے نظریات وخیالات کو عملاً غیر اسلام سے ٹکرا دینے والا بھی ہے۔ وہ صرف پاکستان ہی کے لیئے سرمایۂ فخر نہیں، ساری دنیا میں اس سے دلچسپی لینے والے پھیلے ہوئے ہیں۔

کیا اسے "سی کلاس" میں رکھ کر تم اس کا ایمان بدل سکتے ہو؟ تم اس کی عظمت کو اس سے چھین سکتے ہو؟ تم اس کی عزت میں کوئی کمی پیدا کر سکتے ہو؟ تم اس کے تاریخی مقام کو اس سے سلب کر سکتے ہو؟ تم اسکی قدر کرنے والوں کی تعداد گھٹا سکتے ہو؟

مارشل لا کے تمام حوالاتیوں کو گھنٹی گھر[1] طلب کیا گیا، ہم بھی بلائے گئے۔ اس مرتبہ ملٹری کے سامنے پیشی تھی۔ ہم جب موقع پر پہنچے تو کچھ ہماری وضع قطع دیکھ کر، اور کچھ نام پوچھنے کے بعد یہ جان کر کہ ہم جماعت اسلامی کے کارکن ہیں۔ ہمیں ان حضرات نے میز کے ساتھ رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھنے کی دعوت دی، پھر نام پتے پوچھے اور اندراجات کیئے۔ ایک ذرا اپنی اہمیت محسوس کرنے والے فوجی افسر نے (جو بعد میں مولانا مودودی کے مقدمے کی سماعت کرنے والے ججوں میں شامل تھا)، ہم سے کچھ باتیں

---

[1] جیل کے انتظام کا اندرونی مرکز

چھیڑ دیں۔ جماعت کے مقصد وغیرہ کے متعلق وہ معلومات لیتا رہا۔ اس کا انداز یہ تھا کہ جماعت کی کسی چیز کی تعریف کر کے پہلے اکساہٹ پیدا کرتا، پھر سوالات کرنے لگتا۔ ہمارے رفقا میں سے بعض مبلغانہ جوش میں آ کر اس کے سوالات کا جواب دیتے رہے خود ان افسر سے ہم نے اپنے معاملے کے متعلق دریافت کیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور آپ لوگوں کے سامنے کیا کیا کچھ ہے اس کے جواب میں وہ یہی کچھ کہہ سکے کہ ہماری طرف سے تو کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے، پولیس نے آپ کو گرفتار کیا ہے۔ اس پر سی، آئی ڈی کے ایک افسر جو اس گروپ کے ساتھ شامل تھے، کہنے لگے کہ آپ لوگوں کے خلاف جو چیز لائی گئی وہ بڑی سخت چیز تھی۔ خدا کا شکر کیجئے کہ آپ لوگ اس سے بچ نکلے ہیں۔ اب تو معمولی بات ہے۔ ہم نے پوچھا کہ وہ کیا چیز تھی، تو ان صاحب نے بات گول کر دی۔ اس گفتگو کے دوران میں نہ صرف چاروں طرف لوگ کھڑے ...... اس گفتگو کو توجہ سے سن رہے تھے بلکہ ایک نوعمر فوجی افسر بالکل خاموشی سے ٹکٹکی باندھے ہماری طرف دیکھ رہا تھا .... جیسے وہ ہمیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

بہر حال ہمیں معلوم ہو گیا کہ مولانا پر کوئی مقدمہ چلایا جانے والا ہے۔

## فوجی عدالت

۷، مئی کو طے شدہ پروگرام کے مطابق ناشتہ کرتے ہی فوجی عدالت جانے کی تیاری شروع ہو گئی جہاں مولانا مودودی کا تاریخی مقدمہ زیر سماعت تھا۔ عدالت سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی کے اس ملحقہ ہال میں منعقد ہو رہی تھی جس کی چھت کے نیچے اس سے قبل کئی سیاسی مقدمات فیصل ہو چکے تھے۔ اب یہاں مارشل لا کے خاص خاص مقدمات کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔ اسی تاریخی ہال میں اب پاکستان کی وہ شخصیت مجرموں کے کٹہرے میں آ رہی تھی

جس کا سب سے بڑا گناہ ملک بھر میں اسلامی نظام زندگی کی تڑپ پیدا کر دینا ہے، لیکن جسے اس کے اصل گناہ پر نہ پکڑ سکنے کی وجہ سے قوت ہمیشہ دانت پیستی رہی ہے اور سازشی ذہن کیساتھ برابر کسی زریں موقع کی تلاش میں رہی ہے۔ یہ زریں موقع ہاتھ آ گیا۔

سنٹرل جیل پہنچے تو مقدمے سے دلچسپی لینے والوں کا ایک ہجوم موجود پایا۔ اکثر رفقاء سے یہیں بغل گیر ہو کر ملاقات کرنے کا موقعہ ملا۔ معلوم یہ ہوا کہ اندر صرف پندرہ آدمیوں کے داخلے کی اجازت ہے مگر ایک ایک کرتے کرتے بہت بڑی تعداد ہال میں جا پہنچی، اور زائرین سے ہال کی گیلری اور اس کی سیڑھیاں پوری طرح بھر گئیں۔

ہم دبے پاؤں داخل ہوئے اور کارروائی کے دوران میں سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ فاضل ملزم بالکل ججوں کے سامنے ڈیسک کے متصل کھڑا اپنا تحریری بیان پڑھ رہا تھا جو اس رات ۲ بجے طفیل صاحب کو املا کرا کر تیار کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "ملزم" جواب دعویٰ نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ وہ کوئی جج ہے جو تاریخ کی عدالت میں کسی مقدمے کے ملزموں کو اپنا فیصلہ سنا رہا ہے۔ اس کا لب و لہجہ سنجیدگی، وقار اور حوصلہ مندی کا مظہر تھا۔

بیان ختم ہوا، تو مولانا اپنی کرسی پر بیٹھ گئے جو چودھری نذیر احمد خاں مولانا کے وکیل، اور غیاث صاحب کی کرسیوں سے ذرا پیچھے ہال کے ایک پائے کے ساتھ تھی۔ پیچھے کٹہرے میں سید نقی علی اور قادیانی مسئلہ چھاپنے والے دو مالکانِ مطابع، بہ حیثیت ملزمین بیٹھے تھے۔ مقابل میں حکومت پنجاب کے سرکاری وکیل اور ان کے معاون کی نشست تھی۔ ججوں میں سے صدر آئی آئی گیلانی کا چہرہ سنجیدگی اور کسی قدر ذہنی تعمق کے آثار رکھتا تھا۔ صدر کے دائیں ہاتھ جو صاحب بیٹھے تھے ان سے پہلے ایک موقع پر بات کرنے کا موقعہ جیل میں مل چکا تھا، یہ تیز طرار آدمی تھے اور چہرہ بھی اس کا شاہد

تھا۔ صدر وقتاً فوقتاً انہی سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ صدر کے بائیں ہاتھ ایک صاحب اور تھے جو کارروائی کے دوران میں بالکل بے حس و حرکت بالعموم آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے، ممکن ہے کہ سو بھی جاتے ہوں۔ ایک چوتھے صاحب کارروائی کے نوٹس لینے اور کاغذات وغیرہ کو محفوظ کرنے والے تھے۔ صدر کے متعلق بتایا گیا تھا کہ وہ فوجی قانون کے علاوہ سول قانون کے بھی واقف ہیں، یہ تھی مارشل لا کی وہ نمائندہ طاقت جو مولانا مودودی ...... اور تحریک اسلامی ...... کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھی تھی۔

کارروائی سے اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ ملزم کا پلہ بھاری ہے اور مدعی کا کیس بالکل کھوکھلا ہے۔ فریقین کے وکلا پر گہری نگاہِ تنقید جمی رہی، اندازہ بالعموم یہی تھا کہ چودھری نذیر احمد نے کیس پلیڈ کرنے میں بڑی ذہانت اور محنت کا ثبوت دیا ہے۔ دوسری طرف حکومت پنجاب کے سرکاری وکیل تھے جن کو ذہانت و محنت سے کام لینے کی نسبتاً کم ضرورت تھی۔ چودھری نذیر احمد خاں بہت دھیمی آواز میں متانت اور سنجیدگی سے بات کرتے تھے، لیکن انداز اتنی خود اعتمادی اور اتنا بڑا پن لیے ہوئے تھا کہ عدالت اس سے متاثر ہوتی تھی۔ جہاں کہیں دونوں میں بحث ہوئی ہے تو سرکاری وکیل پچھڑ گیا ہے۔ سرکاری وکیل کے چہرے پر اور خصوصاً سفید آنکھوں پر شاطرانہ انداز پوری طرح جھلکتا تھا۔ ان کا بحث کے لیے اٹھنا اور اُٹھنے سے بڑھ کر بیٹھنا، بڑا ڈرامائی ہوتا تھا۔ پھر گواہوں پر جرح کر کے یا جب کوئی نکتہ جیت کر یا برعکس صورت میں بازی ہار کر آپ بیٹھتے تھے تو دونوں صورتوں میں انداز اتنا مختلف ہوتا تھا کہ ان کی ذہنی کیفیت ان کی آنکھوں سے ٹپک پڑتی تھی۔ کامیابی کی صورت میں وہ ہم سامعین کو ایک اور ہی انداز سے دیکھتے تھے، اور ناکامی کی صورت میں نگاہوں کے زاویئے بالکل دوسرے ہی ہوتے تھے۔

عدالت میں نمایاں شخصیت ملک سعید کی تھی جو مولانا کی کرسی کے ساتھ زمین پر کاغذات کے انبار رکھے ان میں کھوئے ہوئے تھے، اخبارات کے فائلوں اور لٹریچر کی کتابوں کے اندر نشانات کی سلپس جابجا چسپاں تھیں اور جس جس چیز کی ضرورت پڑتی، نہایت پھرتی سے آپ پیش کر دیتے۔

کاررروائی کے بیچ میں وقفہ ہوا تو مولانا خود ہی ہماری طرف بڑھے، مصافحہ کرتے ہی پہلا فقرہ یہ کہا،

"آپ لوگوں نے سخت غداری کی۔"

میں نے فوراً جواب دیا:

"نہیں مولانا! فکر نہ کیجئے، ہم دوبارہ لائے جانے والے ہیں۔"

اور میری نگاہ اچانک رشید صاحب پر پڑی جو ہمارے گرفتار کنندہ تھے۔

مولانا سے اتنے دنوں بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ قلعہ کا حال پوچھا تو فرمانے لگے،

"ظالموں نے پورے ۲۱۶ گھنٹے کامل تنہائی میں رکھا ہے۔"

پھر یہ بھی پوچھا کہ آپ کو وہاں تنگ تو نہیں کیا گیا؟ فرمانے لگے: "نہیں، معاملہ شریفانہ رہا ہے، اور میرے ساتھ یہ اس طرح کی حرکت نہیں کر سکتے۔"

پنڈلیوں کی تکلیف کا حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ جو مرض مہینوں کے علاج سے نہیں جا رہا تھا، وہ ہر علاج سے محروم ہو جانے کی حالت میں شافیٔ مطلق کے فضل و کرم سے خود بخود ختم ہو گیا۔

میں نے باتوں باتوں میں مولانا سے ذکر کیا کہ سگریٹ چھوڑ دیا ہے، فرمانے لگے:

"ایسے نہیں! جیل آیئے تو اس طرح چھوڑ دیجئے کہ گویا کبھی پیا ہی نہ تھا، اور پھر موقع ملے تو پھر پیجئے اور خوب پیجئے! اس کے بعد پھر وقت آئے تو پھر چھوڑ دیجئے۔"

درحقیقت مولانا نے پان کے بارے میں اپنے مسلک کو سگریٹ کے ذکر میں بیان کر دیا۔ واضح رہے کہ مولانا کو ان دنوں پان ملتا ہے اور کھاتے ہیں، لیکن عادت پر کنٹرول اتنا ہے کہ جب چاہیں باگ کھینچ لیں اور جب چاہیں ڈھیل چھوڑ دیں۔

پھر میں نے اپنا ایک شعر سنایا ؎

یا تو پنجرے کی شامت آئی ہے
یا مرے بال و پر کی خیر نہیں !

بولے :-

"شامت تو بس پنجرے ہی کی آئی معلوم ہوتی ہے"!

فوجی عدالت کے مقدمے سے گزرنے والے اس شخص کو یوں اپنی اصلی حالت پر مستقل دیکھ کر خیال آیا کہ ایسے مضبوط آدمی کو پھانسنے کے لئے یہ تدبیریں؟ اور یاد پڑتا ہے کہ اسی لمحے یہ خیال شعر کے سانچے میں ڈھل گیا ؎

تارِ عنکبوت کے جال ہیں بچھے ہوئے
لومڑی ہے گھات میں، شیر کا شکار ہے
کیا عجب دیار ہے!

بعد میں اس شعر پر ایک مکمل نظم تیار ہو گئی۔

بقیہ کارروائی کے خاتمے پر دوپہر کو عدالت برخاست ہو گئی۔ مولانا عدالت سے نکلے تو لوگوں کا ہجوم ساتھ ہو گیا، یہاں تک کہ یہ جلوس سنٹرل جیل کے دروازے تک پہنچ گیا۔ آخر مولانا سلام کہہ کر اندر داخل ہو گئے اور کھڑکی بند ہو گئی۔

ہم گھروں کو واپس روانہ ہو گئے۔ ملک سعید صاحب نے دوپہر میرے ہاں گزارنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ دوستی کا تقاضا یہی تھا۔ ملک سعید صاحب پنجاب کے صوبائی نظم جماعت کے امیر اور مقدمے میں جماعت کی طرف سے

چودھری نذیر احمد صاحب کے معاون ہیں۔ ملک سعید صاحب مزاحاً کہنے لگے کہ میں اب ۱۲۴ د کے مقدمے کا اتنا ماہر ہو گیا ہوں کہ اگر ضرورت پڑے تو بطور خود مقدمہ لڑ سکتا ہوں۔ ملک صاحب ایک طرف مقدمے سے متعلق حوالے جمع کرنے میں مصروف رہتے، دوسری طرف ہر روز شام کو چودھری صاحب کے ہاں جا کر ان سے اگلے دن کی کارروائی کے بارے میں ہدایات حاصل کرتے اور جماعت کی پوزیشن بھی ان کو ذہن نشین کراتے۔

۸ مئی کو بحث مولانا کے ایک بیان پر تھی، جس میں حکومت کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ تھانیدار کے دماغ سے سوچتی ہے۔ چودھری نذیر احمد خاں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اگر مولانا پسند کریں تو وہ صرف اتنی بات کہہ دیں کہ تسنیم میں شائع ہونیوالے بیان کا حرف حرف درست ہونا اور میری تحریر کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے پھر میں خود بحث کر سکوں گا، لیکن مولانا نے مشورہ کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا، جب عدالت نے تسنیم کا پرچہ پیش کر کے اس بیان کے بارے میں پوچھا تو مولانا خود اٹھ کر سامنے آئے اور کہا،

”ہاں یہ بیان میرا ہے اور میں اس کے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں“

آج دونوں طرف سے شہادتیں مکمل ہو گئیں، کل سے وکلاء کی بحث ہو گی۔ جہاں تک مقدمے کی ظاہری کارروائی کا تعلق ہے، ہم مطمئن ہی نہیں، بہت خوش تھے، لیکن ایک ”واقف حال“ نے عدالت کے احاطے میں ایک ایسی اطلاع ہم تک پہنچائی کہ سارا سکون درہم برہم ہو گیا۔ وہ اطلاع خود مولانا مودودی کو بھی مل گئی۔ چنانچہ احاطہ عدالت سے سنٹرل جیل کے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے خاص طور پر مولانا نے مجمع عام سے الگ ہو کر شیکنڈ میں کوئی کلمہ مولانا اصلاحی کے کان میں کہا۔ ہم اس کلمے کو سنے بغیر جانتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت دھوپ اور بھوک کے ساتھ جب یہ اطلاع سنی گئی تو حالت ایسی ہو گئی جیسے بخار ہوتا

سے گھر پہنچ کر مقدمے کا حال بڑی احتیاط سے بیان کیا گیا، اور اپنے داخلی اثرات و کیفیات کو چھپانے کی کوشش کی گئی۔ بے دلی سے کچھ کھانا کھایا، اور پھر تھکا ماندہ جسم نیند کی لہروں میں ڈوب گیا، لیکن نیند بھی عجیب بے سکون نیند تھی جیسے بخار میں غنودگی ہوتی ہے۔ اُٹھ کر نماز پڑھی اور صورت حال پر غور کرنے کے لیے مرکز پہنچے۔

وہاں سے ہمیں دوبارہ گرفتاری کے لیے طلب کر لیا گیا۔

اب ہم پھر اسی سیاست خانے میں تھے جس سے نجات پائے کوئی زیادہ وقفہ نہ گزرا تھا۔ دن کو بھی اور رات کو بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ دوبارہ گرفتاری کا راز کیا ہے۔ اب یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ — ایک رائے یہ تھی کہ شاید اب پولیس نے کوئی نیا الزام لگا کر ہمارے خلاف مقدمہ تیار کر لیا ہو اور ہمیں عدالت میں پیش کر کے باقاعدہ سزا دلوائی جائے، دوسرا قیاس یہ تھا کہ شاید مولانا مودودی کے مقدمے کا کوئی ایسا فیصلہ سنایا جانے والا ہے جس کے ردعمل کو روکنے کے لیے ہم لوگوں کو مزید کچھ مدت کے لیے اندر رکھنا ضروری ہے۔ اور مولانا کو سزا ہو جانا ہمارے نزدیک قطعی تھا۔ اندازہ سات سال قید کا تھا۔

## شاہی مہمان

جیل میں ان دنوں عام چرچا ہے کہ دو قادیانی قیدیوں (مرزا ناصر احمد اور مرزا محمد شریف جو مرزا بشیرالدین محمود کے بیٹے اور بھائی ہیں) کے ساتھ نہایت درجہ امتیازی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ ان کو "شاہی وارڈ" میں جگہ دی گئی تھی اور جیل کے افسر بلکہ خود آئی جی صاحب (جو خود بھی قادیانی ہیں) صبح و شام ان کے پاس جاتے تھے۔ اور ان کی ضروریات اور شکایات معلوم کرتے تھے ..... ایک طرف یہ ناز برداری اور دوسری طرف مولانا مودودی سے وہ سلوک کہ "سی کلاس" دے کر کبھی یہاں ڈال دیا اور کبھی وہاں جا رکھا۔

# سزا

۱۲ مئی کو علی الصباح پھر بلاوا آیا کہ مارشل لا والے سب کے سب گھنٹی گھر چلیں ہم جانتے تھے کہ وہی فہرستیں بنانے اور ان کی جانچ پڑتال کرنے کا عمل ہو رہا ہوگا۔ نام پڑھے جائیں گے اور دو چار گھنٹے بٹھا کر رخصت کر دیا جائے گا، اس پھیکے پن کے باوجود ہمیں یہ جانا پسند آتا تھا۔ ایک تو احاطے سے نکلتے تو سیر ہو جاتی۔ دوسرے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہوتیں اور خوب دل کھول کر باتیں بھی ہوتیں، علاوہ بریں خبریں، خصوصاً جیل کے محکمۂ تسلیات عامۂ کی نشریات کے سننے کا موقع ملتا۔ پھر خیال یہ بھی تھا کہ مارشل لا جلد ہی اٹھنے والا ہے اس لیئے شاید معاملہ نمٹایا جانے والا ہو، اغلباً اِدھر کی، یا اُدھر کی صورت ہو جائے گی۔ نمبردار کی قیادت میں ہمارا گروپ نکلا، تو نسیم صبح پوری مہربانی فرما رہی تھی۔ اس کے جھونکوں سے دلوں کے کنول کھل رہے تھے۔ ان جھونکوں کی قدر و قیمت کو وہی جان سکتا ہے جس نے مئی کی رات لاہور میں ایک تنگ کوٹھڑی کے اندر گزاری ہو۔ آپس میں ہنسی دل لگی کی باتیں ہو رہی تھیں، میں نے کہا کہ یہ سماں ہو تو پھر یہ لوگ ہمیں بلاتے رہیں تو اچھا ہو، سیر و تفریح ہو جایا کرے۔ جس سرور و کیف میں یہ باتیں کہہ رہا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اپنے پیچھے کتنا بڑا کاروانِ آزمائش لا رہا ہے۔ بس دس قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ بڈھی خانے[1] سے لوگوں نے ہمیں پکارا اور اظہارِ افسوس کے لیئے کہا "مولانا کو سزا ہو گئی" اور ہم سب دھک سے رہ گئے، کتنی سزا ہوئی؟ کب ہوئی؟ جلدی بتاؤ؟ پھر ہمیں تفصیل بتائی گئی کہ رات کو مولانا کو پھانسی کا حکم ملا ہے۔ ایک مولوی صاحب کو ۹ سال اور دوسرے کو ۵ سال اور ۲ سال۔ ہمارے اوپر تو جیسے بجلی گر پڑی ہو اعصاب سُن سے ہو گئے اور مجسموں کی طرح ہم آگے کو حرکت کرنے لگے۔ رات رات میں تقریباً ساری جیل میں یہ خبر پھیل گئی تھی، مگر ہم اس سے بالکل بے خبر رہنے دیئے گئے۔

---

[1] یعنی پہلے یہ زنانہ وارڈ تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا آخری گھڑی آگئی ؟ کیا اب قوم اور اس ملک کا فیصلہ ہو جانے والا ہے ؟ کیا دین کے دیئے اب یہاں بالکل گل کر دیئے جائیں گے ؟ کیا واقعی ہمارے ملک کے دشمنانِ دین کی حقیر اقلیت کے نمائندے اتنی قوت رکھتے ہیں کہ مولانا مودودی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیں ۔؟

اور مجھے مولانا مودودی کے وہ تاریخی فقرے یاد آگئے، جو پندرہ سولہ برس قبل قلم بند کئے گئے تھے کہ نام نہاد قوم پرست مسلمان اسلامی تحریک کو کچلنے میں کفار سے زیادہ بے باک ہوں گے، کفار جس چیز پر قید اور جرمانے کی سزا دیتے ہیں وہ اس پر پھانسی کی سزا دیں گے، اور پھر بھی جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔

اور اپنی نظم کا یہ بند بھی ذہن میں گونجنے لگا کہ ؎

کرسی پہ عدالت کی ڈاکو پہلے بھی قابض پائے گئے
بیٹھی میں ان کی اہلِ حق الزام لگا کر لائے گئے
جو خونی تھے "سرکار" بنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
تاریخ کے یہ اعجوبے ہیں
۔ ۔ ۔ ۔ جو محسن تھے غدار بنے
کچھ ہم پہ نرالا ظلم نہیں پہلے بھی کرم فرمائے گئے

دل میں نئے جذبے نے کروٹ لی، خیال آیا کہ یہ لوگ مولانا مودودی کو پھانسی دے بھی ڈالیں تو کیا یہ مودودی کے پیغام اور اس کے فکر کو بھی پھانسی دے سکتے ہیں جو گھر گھر پہنچ چکا ہے، اور جس نے نوجوان نسل کو مغرب کی مرعوبیت سے نکال کر اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا ہے ! اب مودودی کا پیغام موجودہ دور کی تاریخ کی رگوں کے اندر اتر چکا ہے، اس کے خیالات اس کے مخالفین تک کے ذہنوں میں بولتے ہیں، اس کی اصطلاحات اس کے حاسدوں تک کا جزو دماغ ہو چکی ہیں، اس کی بولی کی گونج اب دور دور تک سنائی دیتی ہے ! جس تحریک

کو اس نے اپنے پسینے سے پرورش دی ہے اگر اس کی جڑوں کو اس کے خون کے قطروں سے سیراب کر دو گے تو وہ آناً فاناً ایک تناور درخت میں بدل جائے گی، اب تو اس کی موت اس کے پیغام کو زندہ تر کر دے گی!

یہ سوچتے سوچتے ہم دیوانی گھر کے پاس آ پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا، مولانا اصلاحی، چودھری محمد اکبر، میاں طفیل محمد سبھی دروازے پر آ گئے۔ تاثرات کا دو طرفہ یہ عالم تھا کہ نہ ہم بات میں پہل کرنا چاہتے تھے اور نہ وہی حضرات اس ذکر کو چھیڑنا چاہتے تھے۔ ہماری نگاہوں ہی نگاہوں نے استفسار کیا اور ان کی نگاہوں ہی نگاہوں نے خبر کی تصدیق کر دی۔ اصلاحی صاحب نے تفصیل بتائی کہ جیل کے ایک افسر کی معیت میں فوجی افسر حکم لے کر پہنچا، نماز مغرب کے بعد مولانا کو حکم سنایا گیا اور ان کو اسی وقت وہاں سے پھانسی کی کوٹھڑی کی طرف لے جایا گیا۔ یہ بات سنتے سناتے ہوئے اس طرح محسوس نہیں ہوتی جیسے کسی دیکھنے والے کو محسوس ہو سکتی ہے۔ ہمارے جن رفقاء نے یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مولانا کے علاوہ، ملک نصر اللہ خان عزیز اور سید نقی علی کی جدائی کا بھی...... وہی جانتے ہیں کہ ان پر کیا گزری! اصلاحی صاحب جیسا خوگرِ ضبط آدمی بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ پھر وہ سماں کہ مولانا کو جیل کا لباس پہنا کر ان کے ذاتی کپڑے راتوں رات دیوانی گھر واپس کئے گئے تو ایک مرتبہ پھر دلوں پر قیامت گزر گئی۔

## مولانا اصلاحی

اصلاحی صاحب کو نمبردار نے بتایا کہ آپ کی رہائی کے کاغذات آ گئے ہیں۔ مولانا نے خاموشی سے سنا بعد میں جذبات امڈ آئے تو کہنے لگے:

"جب وہی شخص دنیا میں نہ رہا کہ جس کی رفاقت میں رہتے سے زندگی تھی، تو پھر میں رہا ہو کر کیا کروں گا؟ میرے لیئے اب رہائی

میں کونسی خوشی باقی رہ گئی؟ جیل سے باہر اب میرے لیئے کیا
دلچسپی ہوگی؟"

مجھے اصلاحی صاحب کے طرزِ عمل سے یہ تو معلوم تھا کہ وہ مولانا کے اقرب ترین رفیق ہیں، لیکن مجھے اس والہانہ محبت کا اندازہ نہ تھا، اور شاید کسی کو بھی نہ ہو گا جو اس جملے سے ظاہر ہوئی۔ خاص اللہ کے لیئے سچی اور گہری محبت کی مزید ایک مثال اصلاحی صاحب نے تاریخ انسانیت کو فراہم کر دی۔ اصلاحی صاحب کی آنکھوں میں یہ الفاظ کہتے ہوئے آنسو تیر گئے، لیکن ضبط نے انہیں پلکوں کے اندر خشک کر کے رکھ دیا، کچھ دیر پھر خاموش رہے، اس کے بعد پھر بولے تو کہا:

"میں مودودی صاحب کو ایک بڑا اور بہت بلند آدمی سمجھتا تھا، ایسے آدمی کم پیدا ہوتے ہیں۔ مگر آج تک میں ان کو اتنا بڑا نہیں سمجھتا تھا جتنا وہ آج بڑے ہو گئے ہیں۔ مجھے اس کا کبھی اندازہ نہیں تھا کہ خدا نے ان کے لیئے ایک ایسی سعادت مخصوص کر رکھی ہے کہ وہ اس کے دین کی راہ میں ایک دن پھانسی کی سزا پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہزارہا ہستیوں میں سے چن کر ایک اونچے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔"

## کوٹھی ٹوٹ گئی

۱۲ مئی کو بعد دوپہر، ہماری پشت کی بیرونی کوٹھریوں سے یہ خبر روشندان کے راستے منتقل ہو کر آئی کہ مولانا عبدالستار نیازی کی "کوٹھی ٹوٹ گئی" (یعنی سزائے موت منسوخ ہو گئی)۔ ہم نے دلچسپی سے خبر کو سنا، کیونکہ اگر مولانا نیازی کو پھانسی کی سزا نہیں دی جا رہی تھی، تو پھر مولانا مودودی کو تو بالکل نہیں دی جا سکتی تھی۔ اگرچہ ساتھ ہی یہ برعکس خیال بھی آیا کہ مولانا نیازی سے بہرحال وہ خطرہ حکومت کو نہیں جو مولانا مودودی سے ہے۔ نیز مولانا نیازی کی طرف سے شاید رحم کی اپیل

کی گئی ہو۔ لیکن مولانا مودودی تو اس پر تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم نے روشندان ہی کے ذریعے جب تفصیل مانگی تو جواب ملا کہ مولانا نیازی کی کوٹھی ٹوٹنے کی خبر عام ہے، اخبار میں آگئی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ مولانا مودودی کی کوٹھی بھی ٹوٹ گئی ہے۔ شبہ ہوا کہ مولانا مودودی کا نام یونہی شامل کیا جا رہا ہے۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ خبر کا اصل ذریعہ باہر کی کوٹھری نمبر ۱ میں ہے تو ہم اس کے بالمقابل کی اندرونی کوٹھڑی میں پہنچے۔ پکار کر خبر کی تفصیل پوچھی تو بالا پور کے تعلیم یافتہ حوالاتیوں نے جواب دیا کہ خبر صحیح ہے اور اخبار میں بھی ہے لیکن ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ اخبار میں خود ہم نے نہیں پڑھی۔ یہ بھی ان سے معلوم ہوا کہ مولانا مودودی کی سزا کے خلاف کراچی اور سندھ اور بعض دوسری جگہوں میں سخت احتجاج ہوا ہے۔ تسلی نہیں ہوئی مگر امیدوں کے لیے میدان کھل گیا۔ اس کے بعد ہم کو کوٹھری میں حسب معمول مقفل کر دیا گیا، اور بیرونی دنیا سے ہم کٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد گنتی کرنے ہمارا عیسائی منشی آیا، اس نے جنگلے پر آکر یہی خبر سنائی۔ میں نے کہا دیکھئے ہم ٹھیک اطلاع چاہتے ہیں۔ اس پر وہ بگڑ کر چپ چاپ چلا گیا، گویا اس نے محسوس کیا کہ ہم اس پر جھوٹ کا الزام لگا رہے ہیں۔ یاد پڑتا ہے کہ ڈاکٹر منظور صاحب بھی اسی دوران میں گشت پر آئے تھے اور انہوں نے بھی تصدیق کر دی۔ اب خبر یقینی ہو گئی تھی۔ بالآخر وہ خاص نمبردار اس خبر کو پہنچانے کے لیے آگیا جو ہمارے لیے واحد معتمد ذریعہ معلومات تھا۔ بس اس وقت گویا ہم سو فیصدی یقین کی حالت کو پہنچ گئے۔ اب تو یہ بھی بتا دیا گیا کہ ہم مولانا کو خود دیکھ کر آئے ہیں۔ وہ کوٹھری سے نکال کر ہسپتال میں لائے جا چکے ہیں۔ سجدہ شکر ادا کیا!

یہ جان کر کہ پھانسی کی سزا چودہ سال قید بامشقت میں بدل گئی ہے، ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے مولانا بالکل آزاد ہو چکے ہیں، اور چودہ سال قید بامشقت کوئی چیز نہیں ہے۔ اندازہ یہ بھی تو تھا کہ اگر رائے عام اسی طرح حساس رہی تو مولانا کو قید میں رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔

# سہرا ہے

اتفاق کی بات کہ ۸ مئی کو میری ہفتہ وار ملاقات تھی۔ ہماری ملاقات حوالاتی ہونے کی وجہ سے "سی" کلاس کے عام قیدیوں کے کمرے میں اس طرح ہوتی تھی کہ جنگلے کے باہر دوست احباب، بیوی بچے آجاتے اور جنگلے کے اندر سے ان سے مصافحہ کرلیا جاتا، باتیں ہوتیں، اور کھانے پینے کی چیزیں لی جاتیں۔ زیادہ سے زیادہ ملاقات پندرہ منٹ کی ہوتی تھی۔ ملاقات سے فارغ ہو کر ڈیوڑھی کے گیٹ کے ساتھ بغلی دروازے سے نکلا ہی تھا کہ کسی نے یہ اطلاع دی کہ مولانا مودودی بھی ملاقات کو آئے ہوئے تھے، اور اب واپس نکلنے والے ہیں۔ گیٹ کے سوراخ میں سے ان کا چہرہ بھی دکھائی دیا۔ انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ اس مسافرِ حق کے چہرے کو دیکھ لوں جو پھانسی کی کوٹھری تک کی منزل سے ہو کے لوٹا ہے۔ وہ چہرہ کیسا ہو گا؟ وہ پیشانی کیسی ہو گی؟ وہ آنکھیں کیسی ہوں گی؟ اور اس مسافر نے یہ سفر طے بھی کیا تو بڑی سرعت رفتاری سے کیا۔ وہی بات کہ ع

طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

ڈیوڑھی کے گیٹ کی کھڑکی کھٹ کھٹاک کے شور سے کھلی، اور اب وہ چہرہ بالکل سامنے تھا۔ آگے بڑھ کر ملاقات کی، مولانا بغل گیر ہو کر ملے، یہ موقع پھر ایسا موقع تھا کہ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر گئے۔ زبان پر تحمید کے کلمات تھے۔ مولانا نے اس موقع پر جیل کا لباس پہن رکھا تھا، بڑے بڑے خانوں والے کھدر کا کرتا پاجامہ۔ چلتے چلتے "منزل جاناں" کے احوال پوچھے مولانا نے بتایا "بڑے اطمینان سے تین راتیں گزریں اور کل انہیں باہر نکالنا پڑا۔ مجھ سے یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں رحم کی اپیل ان کے سامنے کروں، اس کے لیئے تو میری جوتی کی نوک بھی تیار نہیں ہے" (روایت بالمعنی)۔ مولانا باہر کے تازہ حالات سے بھی باخبر تھے کہ احتجاج کس پیمانے پر ہوا، خود مجھے بھی ملاقات میں کچھ معلومات مل گئی تھیں۔

اس مختصر سی سرِراہے ملاقات نے صبر و ہمت کی تاب میں مزید اضافہ کر دیا اور میں اس ملاقات کی عجیب بے پایاں سی مسرت سینے میں لیے جلدی جلدی واپس پہنچا تاکہ اپنے ساتھیوں کو بھی اس میں شریک کر سکوں۔ سب نے پورے اشتیاق سے روداد سنی۔

## چرخہ

۱۹ رمئی وہ تاریخی دن تھا جب کہ ہمیں رہائی کے پرچے دے کر ڈیوڑھی بھیجا گیا، لیکن گھنٹی گھڑی میں معلوم ہو گیا کہ آگے سیفٹی ایکٹ کا دام بچھائے شکاری موجود ہیں۔ چھ مہینے کی نظربندی قبول کر کے ہم لوٹے تو اتفاقاً راستے میں مولانا مودودی سے ملاقات ہو گئی۔ طفیل صاحب اور اصلاحی صاحب تو ان کے پاس ہی سے آئے تھے۔ ہمیں واپس آتے دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ہم پر کیا گزری، تاہم دریافت کیا "کہیے! جناب! کیا ہوا؟" ہم نے بتایا کہ چھ چھ مہینے مل گئے ہیں۔ فرمایا "اطمینان سے ڈٹ جائیے" اور یہ الفاظ نہایت مطمئن اور مسکراتے چہرے کے ساتھ کہے گئے۔ جیسے سیفٹی ایکٹ کا یہ وار سہنا ایک کھیل ہو، جیسے چھ مہینے کی نظربندی ایک تفریح ہو، جیسے حکمران طبقے کی یہ زیادتی محض ایک مذاق ہو! اور معاً محسوس ہوا کہ چھ مہینوں کا بوجھ ہلکا ہو کر چھ دنوں کے برابر رہ گیا ہے۔

عجلت تھی، لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ مولانا کے لیے سوت کاتنے کی مشقت تجویز ہوئی ہے۔ ابتدائی چند دن ٹریننگ کے ہیں۔ یہ شخص جس کے سپرد تاریخ کے چرخے پر قوم کی قسمت کا تار کاتنے کا فریضہ ہے وہ اب سوت کاتے گا اور اس سے جیل کے قیدیوں کے کپڑے بنے جائیں گے۔ وہ ہاتھ جو "تفہیم القرآن" لکھنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اب یہاں چرخہ چلائیں گے۔ مشقت ضروری سہی، مگر ایک تعلیم یافتہ شخصیت بلکہ ایک عظیم مفکر کی شخصیت — کے لیے کیا چرخہ کاتنے سے بہتر وقت کا کوئی اور مصرف باقی نہیں رہا تھا، وہ چند گز سوت کات کر ملک کی دولت میں جو اضافہ کرے

گا کیا وہ اس سے زیادہ گراں بہا ہے جتنا وہ اپنی دماغی محنت کے نتائج پیش کر کے اضافہ کر سکتا ہے؟ ۔ پھر قوم کو ایک معمار فکر و سیرت کی اصل خدمت سے محروم کرنے کے لیے اسے غیر مفید کاموں میں لگانا خود قوم پر ہی ایک ظلم نہیں ہے؟ اور کیا یہ حرکت خود ایسے قیمتی شخص کے لیے تاراج کرنے کے مترادف نہیں ہے؟

احاطے پہنچے، اطمینان سے تھک گئے۔ تو پھر طفیل صاحب نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا کہ مولانا کو "بی کلاس" وارڈ میں خالص اخلاقی قیدیوں کی سوسائٹی میں جا ڈالا گیا ہے۔

## کھری کھری

"لاہور سنٹرل جیل نیوز سروس" کی نشر کردہ یہ تازہ خبر موصول ہوئی اور مجمع عام میں سنائی گئی کہ مولانا مودودی نے چودھری علی اکبر صاحب وزیر جیل خانہ جات کو جیل کی فضا اور اس کے نظم و نسق کی اصلاح کے لیے مفید مشورے دیئے مثلاً ان کی توجہ اس امر پر مبذول کرائی کہ یہاں قیدیوں سے "پوچا" جیسی مشقتیں لی جاتی ہیں جن پر وقت و قوت کا صرف زیادہ ہوتا ہے، لیکن مقابلتہً نتیجہ بالکل ہیچ ہوتا ہے۔ خود قیدیوں کو ان سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، نہ مالی فائدہ نہ تربیتی، نہ ذہنی؛ کیوں نہ قیدیوں کو اچھی اچھی صنعتیں سکھا کر باہر بھیجا جائے کہ وہ باعزت طریق سے روزی کما سکیں۔ ان کی مشقت کے ان کو اسی شرح سے معاوضے بھی دیئے جائیں جو ملک میں رائج ہے۔ ایسی ہی اصلاحات کی طرف توجہ دلانے کے بعد مولانا نے کچھ کھری کھری باتیں سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کے بارے میں بھی کہیں۔ حالات و واقعات کے افسوسناک پہلو بیان کرنے کے بعد مولانا نے کہا: "کیا آپ لوگ اس اصول پر چل رہے ہیں کہ جو پارٹی برسر اقتدار آ جائے وہ دوسری پارٹیوں کے ساتھ بدترین توہین آمیز اور انتقامی سلوک کرے! اگر ایسا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کے نتائج آپ کے حق میں کبھی اچھے نہیں ہو سکتے۔"

جیل میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ قیدیوں کو حیرت تھی کہ ایک وزیر کے سامنے یہ صاف گوئی!

## مجلس مشاورت

راؤ مہروز اختر صاحب نے مژدہ سنایا کہ مولانا اصلاحی، چودھری محمد اکبر، میاں طفیل محمد اور مجھ کو ڈیوڑھی بلایا گیا ہے، مولانا سے ملاقات کے لیے! سات بجے احاطے سے چلے جانا ہے۔ نہانے سے فراغت پا کر کپڑے بدلے، جلدی جلدی ناشتہ کیا اور نمبردار کی نگرانی میں روانہ ہو گئے۔ دوسرا پڑاؤ گھنٹی گھر تھا، یہاں آکر معلوم ہوا کہ ڈیوڑھی میں ملاقات کا وقت ۸½ بجے ہے، سوا آدھ گھنٹا یہاں گزارنا پڑا۔ یکایک درختوں کی جھکی جھکی ٹہنیوں کے خلا میں سے مولانا کی صورت دکھائی دی "آ گئے" کی آواز بلند ہوئی اور سب جلدی سے لپکے۔ خود مولانا ہم سے زیادہ تشنۂ ملاقات معلوم ہوتے، مصافحہ کے بجائے معانقہ ہوا۔ واضح رہے کہ جیل میں آکر مولانا نے معانقہ کی تربیت ہی نہیں پائی بلکہ اب ان کے اندر اس کا پورا پورا ذوق ابھر آیا ہے۔ پہلے اگر مولانا سے کوئی صاحب آکر زبردستی معانقہ کرتے تھے تو مولانا ہمہ تن صبر ہونے کی وجہ سے اسے بس سہہ جاتے تھے، لیکن اب تو مولانا خود پیش دستی فرما لیتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے درحقیقت احباب و رفقا سے جدا رکھے جانے کا!

مولانا نے راستہ چلتے چلتے خود ہی بیان کیا کہ میانوالی میں لے جا کر ان کو بالکل قید تنہائی میں ڈال دیا گیا تھا۔ سوائے ایک وارڈر کے اور ایک مشقتی کے کسی ابن آدم کا گزر نہیں ہوتا تھا، بلکہ یوں کہیے کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ اور تو اور اسسٹنٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بھی مولانا کے احاطے میں نہیں جاتا تھا۔ ڈاکٹر کو اگر کبھی جانا پڑتا تو اس کے ساتھ بھی نگران ہوتے۔

مولانا کے ساتھ ملک عزیز بھی تھے، با ہم دگر خیر و عافیت پوچھتے ڈیوڑھی پہنچے بورسٹل جیل سے ہمارے ملتانی رفقا کو بھی بلوایا گیا تھا۔ ان سے ملاقات تو بالکل ہی نعمت غیر مترقبہ

تھی۔ ۶، ۷، مارچ کو ان سے آخری ملاقات مرکز میں ہوئی تھی، بعد میں وہ اپنی جگہ گرفتار ہو گئے اور ہم اپنی جگہ مارشل لا کے تحت جکڑے گئے۔ پھر یہ اطلاع تو مل گئی کہ ان کو بورسٹل جیل میں لایا گیا ہے۔ مگر تفصیل سے کچھ نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ بورسٹل کے ساتھ جب ہم طور صاحب کا تصور کرتے، تو اپنے ان رفقا کے بارے میں تشویش میں پڑ جاتے تھے۔ الحمد للہ کہ آج باقر خان، چودھری نذیر احمد، خان محمد ربانی صاحبان سے بالمشافہ حالات معلوم ہوئے اور اطمینان ہوا کہ وہ ہم سے بھی کچھ بہتر حالات میں ہیں۔ کیونکہ "ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا"..... یعنی موصوف تشریف لے جا چکے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد چودھری غلام محمد، ملک سعید اور صفدر صاحب تینوں ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ معانقے کے بعد "معاملے" کی بات چیت شروع ہو گئی۔ یہ دراصل ایک مجلس مشاورت تھی جو خاص اجازت سے سنٹرل جیل میں منعقد ہو رہی تھی۔ سب سے آخر میں جماعت اسلامی کے وکیل چودھری نذیر احمد اور غیاث الدین تشریف لائے۔

## دلیل کی بجائے کورٹ مارشل

چودھری نذیر احمد صاحب مقدمے کے سلسلے میں مختلف نکات پر مولانا سے مفصل گفتگو کرتے رہے، جس میں ضرورتاً دوسرے بھی حصہ لیتے رہے۔ چودھری نذیر احمد صاحب نے فرنگیت مآب طبقے۔ جس میں ہماری حکمران طاقت ابھری ہے۔ کے رجحانات کو بھی ضمناً بیان کیا کہ ان رجحانات کو ذہن میں رکھ کر عدالتی کارروائی میں حصہ لینا چاہیئے۔ انہوں نے بتایا کہ جماعتِ اسلامی کے بارے میں اوپر والوں کا تصور یہ ہے کہ یہ لوگ نہ تو خریدے جا سکتے ہیں، نہ ڈرائے جا سکتے ہیں اور نہ بوقت ضرورت استعمال کیئے جا سکتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اس قوت کے ذریعے مولانا مودودی برسر اقتدار آ کر ایک بدترین ڈکٹیٹرشپ جمانا چاہتے ہیں، اور اسی لیئے مولانا مودودی نے انتخابات میں حصہ لینے کا اقدام بھی کیا ہے اور دستور کا مسئلہ بھی چھیڑا ہے۔ یہ مذہبی ڈکٹیٹرشپ اگر ایک مرتبہ قائم ہو گئی تو پھر کسی کی خیر نہیں، لہذا

پوری سختی سے اس طاقت کو کچل دینا چاہیئے۔ ضمناً اس نقطے پر تھوڑی سی گفتگو ہو گئی۔ مولانا فرمانے لگے کہ اس معاملے میں ہمارا لٹریچر اور دستور اور ہمارا نظامِ جماعت یہ بتا سکتا ہے کہ ہم لوگ سب سے زیادہ جمہوریت پسند ہیں اور ہمارے ہاں ڈکٹیٹرانہ ذہنیت کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں۔ جو شخص ڈکٹیٹر بننا چاہتا ہے وہ کسی ایسے نظامِ جماعت کو کب گوارا کرتا ہے جس میں عہدوں کے لیئے انتخابِ افراد کا پورا پورا حق عام ارکان کو حاصل ہو، اور انتخاب کرنے کے ساتھ ساتھ وہ معزول کرنے کا اختیار بھی رکھتے ہوں، اور جس میں امیر اور ارکانِ شوریٰ اور عام ارکان پر ہر رکن کو تنقید کا پورا پورا حق دیا گیا ہو، اور جس میں امیر اپنی شوریٰ کے مشورے کا پابند بنا دیا گیا ہو۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ یہ طبقہ اپنی مطلب براری کے لیئے مغرب کے تھیوکریسی کا تصور اٹھا کر ہمارے نظامِ فکر پر چسپاں کر دیتا ہے حالانکہ دونوں میں کوئی بعید ترین نسبت بھی نہیں۔

مولانا مودودی نے فرمایا کہ ہم نے تو بڑی محنت کر کے اس خلیج کو پاٹا ہے جو ہمارے ہاں کے مذہبی طبقے اور جدید طبقے میں حائل تھی۔ یہ دونوں بالکل جداگانہ طور پر پروان چڑھے تھے کہ نہ یہ اس کو جانتا تھا اور نہ وہ اس کو سمجھتا تھا۔ ہم نے ایک صحیح کی راہ نکالی ہے اور کام کرنے کی صحیح تدبیر اختیار کی ہے لیکن اقتدار پر آیا ہوا مغرب پرست طبقہ ہماری مخالفت "ملّازم" کا نام دھر کر کرتا ہے، یعنی اصل اسلام کو براہِ راست گالیاں دینا چونکہ ممکن نہیں، اس لیئے اسے ملّازم کا نام دے کر پھر دل کا بخار نکالا جاتا ہے۔

چودھری نذیر احمد صاحب نے اس پر "جرح" کرتے ہوئے پوچھا کہ حکمران طبقہ کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اصل اسلام کے مخالف نہیں ہیں بلکہ اسلام کی اُس شکل کے مخالف ہیں جو ملاؤں نے بطور خود بنا دی ہے اور اسی کو ہم "ملّازم" کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ اپنے تصوّر کے مطابق ملّازم جیسی غلط اور خطرناک چیز کو کیوں نہ کچلیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ان کو اختلاف اگر صرف تصوّرِ اسلام پر ہو

تو سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ ہمارے "ملّازم" کے مقابلے میں اپنا خالص اسلام پبلک کے سامنے اپنے استدلال کے ساتھ رکھ دیں، اور پھر لوگوں کو حق دیں کہ وہ جس تصور کو چاہیں اختیار کریں اور جس کو چاہیں رد کر دیں، لیکن یہ کیا طریقہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خالص اسلام کو منوانے کے لیئے مجھے پھانسی دیتے ہیں۔ میں نے ہر چیز دلیل کے ساتھ پبلک کے سامنے رکھی ہے اور دلیل ہی کے ذریعے رائے عام کو مطمئن کیا ہے لیکن یہ لوگ دلیل کے بجائے کورٹ مارشل کے ذریعے اپنی بات منوانا چاہتے ہیں!

یہاں بیچ میں مقالہ نگار یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا مودودی کی خدمات میں سے ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے عوام کو اندھے جوش سے ہٹا کر ہوش کا درس دیا ہے۔ انہوں نے مسائل کو سنجیدگی سے سوچنا اور سمجھنا سکھایا ہے، انہوں نے دلیل کا وقار مضبوط کرنے کی ہر تدبیر اختیار کی ہے، انہوں نے اختلاف کے حق کو تسلیم کیا ہے اور تسلیم کرانے کی سعی کی ہے، انہوں نے تبدیلی کے لیئے رائے عام کی تیاری کو ایک لازمی عامل قرار دیا ہے، انہوں نے ہوائی تقریروں کے بجائے ٹھوس علمی لٹریچر کو خیالات پیش کرنے کا بنیادی ذریعہ بنایا ہے۔ پھر انہوں نے انتخابات کے لیئے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ جس سے زیادہ جمہوری طریقہ اب تک دنیا میں زیر استعمال نہیں ہے۔ یہ شخص ایک طرف عوام کو تلقین کرتا ہے کہ ہلڑ اور ہنگامہ آرائیوں اور نعرہ بازیوں کے بجائے پرامن جمہوری طریقوں سے کام کریں، اور دوسری طرف کئی کئی بار حکمران طبقے کو نصیحت کر چکا ہے کہ دیکھیئے لوگوں کے مطالبات اور ان کی شکایات کو محض معقول دلائل اور رائے عام کی تائید کی بنا پر قبول کرنے کی عادت ڈالیئے، ورنہ لوگوں کو آپ مشتعل کر کے ہنگامہ آرائی کی راہ پر ڈال دیں گے، اور وہ اپنے آپ کو سر پھرے لوگوں کے حوالے کر دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

## اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا

آئی جی جیل خانہ جات کی آمد کا انتظار رہا، لیکن ان کا وقت دوسرے

احاطوں میں اتنا صرف ہو گیا کہ ہمارے احاطے میں نہ آسکے۔ ایک راوی کے ذریعے معلوم ہوا کہ موصوف اپنے ساتھیوں سمیت مولانا مودودی کے ہاں بھی گئے تھے، وہاں خاصی گفتگو رہی۔ باری کمیٹی رپورٹ والے مسعود صاحب ساتھ تھے۔ وہ بولنے اور بحث و گفتگو کرنے اور خاص طور سے مذہبی مسائل سے تفریح کرنے کا دیرینہ ذوق، بلکہ "بحث خولیا"، رکھتے ہیں۔ انہوں نے مولانا سے قادیانی مسئلے کے بارے میں اظہارِ اختلاف کیا۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ پہلے مسئلے کو سمجھئیے پھر رائے قائم کیجئے۔

ایک لطیفہ خوب رہا!

مسعود صاحب نے مولانا سے آغاز کلام یوں کیا "فرمائیے مولانا اونٹ (مراد: ڈائرکٹ ایکشن کی تحریک) کس کروٹ بیٹھے گا؟" مولانا نے برجستہ جواب دیا "اونٹ رہا ہی کب، وہ تو گدھا بن گیا ہے، اب کروٹ کا کیا سوال!" ہمارے حلقے میں جب اسے بیان کیا گیا تو اس لطیفے کی تکمیل یوں کی گئی ——— اور گدھا بھی وہی روایتی گدھا جس پر نونؔ[1] لدا ہوا ہے۔

## لطیفہ گوئی

مولانا مودودی کی لطیفہ گوئی کا ایک خاص اسٹائل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر بڑا مواد جمع کیا جا سکتا ہے، اور ادبی حیثیت سے اسے مرتب کر کے مولانا کے اسٹائل کی خصوصیات کی تحقیق کی جا سکتی ہے۔ اولین چیز تو یہ ہے کہ مولانا کی لطیفہ گوئی انتہائی حاضر دماغی کا جوہر اپنے پیچھے رکھتی ہے یعنی مولانا لطیفہ کہتے ہیں تو ہمیشہ برجستہ کہتے ہیں، اور تیر بہ ہدف بنا دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ مولانا لطیفہ گوئی یا مزاح یا نکتہ آفرینی کے مریض بہر حال نہیں ہیں۔ وہ جا و بیجا فقرے گھڑتے نہیں رہتے۔ بس آسمانِ مجلس پر ان کی گفتگو کے اڑتے ہوئے ٹکڑہائے ابر کے درمیان مناسب موقعوں پر مزاح کے ستارے کبھی کبھی چمک جاتے ہیں، رنگ ہمیشہ پیازی یا زیادہ سے زیادہ گلابی رہتا ہے، اتنا تیز نہیں ہوتا کہ ذوقِ سلیم کے لیے بار ہو سکے۔ مولانا کی

---

[1] یہ ایک خاص اشاریت تھی۔

لطیفہ گوئی اپنے دوستوں اور ملنے والوں کی دلآزاری یا توہین پر کبھی مبنی نہیں ہوتی۔
ذکر چھڑا تو جی چاہتا ہے کہ دو تین نمونے مولانا کی لطیفہ گوئی کے پیش کر دوں۔
۱۹۵۳ء میں پہلی گرفتاری سے کچھ ہی قبل مولانا نے لائل پور اور جھنگ کا سفر کیا تھا۔
بہت سے لوگ ساتھ تھے، میں بھی تھا۔ ایک مقام پر کار کسی ضرورت سے روکی گئی۔
چودھری صاحب فطرت کے بلاوے پر لبیک کہہ کر لوٹے تو مولانا نے پوچھا "کیا پانی
کہیں سے مل گیا ہے؟" چودھری صاحب نے کہا "نہیں دوسری طرح کام چلانا پڑا ہے"
مولانا نے فوراً کہا "اچھا تو یوں کہیے کہ ڈرائی کلینگ کی ہے"

مرکز کی گلی فیروز پور روڈ سے جہاں ملتی ہے پہلے وہاں نشیب تھا، بعد میں مٹی
ڈلوا کر راستہ اونچا کیا گیا جس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ ایک دن کہیں سے گاڑی پر آ رہے
تھے تو ڈرائیور نے جب گاڑی کو گھمایا، مولانا نے کہا "دیکھنا بھئی! احتیاط سے !
کہیں قامہ ھادیہ ہی نہ ہو جائے۔

# حکیم جہاد آرا

ہمارے حکیم الامتؒ نے پہلی بار بھٹکے ہوئے سورج کا ذکر کر کے ہمیں نئی روشنی دی تھی۔ میرا بھی ایک مجذوبانہ نکتۂ حکمت ہے۔ کبھی کبھی تاریخ بھٹک جایا کرتی ہے۔ ۲۴-۱۹۲۳ء یا ۲۸-۱۹۲۶ء کی بات ہے۔ یا کئی مختلف سالوں سے مل کر بنے ہوئے ایک لمحے کی، کہ میں نے بھٹکی ہوئی تاریخ کو دیکھا۔

تاریخ کا راستہ انسانی ذہن کے اندر سے ہو کر گزرتا ہے اور جب کبھی ذہنی دنیا میں نصب العین کا سورج بجھ جاتا ہے، تاریخ بچاری راستہ گم کر کے اُلجھے ہوئے سوالوں اور ٹکراتے ہوئے خیالوں کے درمیان ٹامک ٹوئیے مارتی رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی اسی حالت میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ ایسے میں انسانی شخصیتیں بہت سے ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہیں۔ کردار غولِ بیابانی کی طرح نت نئی شکلیں بدلتے ہیں۔ ایام کی تکلی پر حکمت و سیاست کی بڑھیا مسائل کا جتنا سوت کاتتی ہے وہ اُلجھ کر گرہ در گرہ گچھوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تہذیب کے آئینہ خانے میں ہزاروں کروڑے بھیانک چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ معاشرے کے سمندر کی سطح قنوطیت کی برودت سے یخ بستہ ہو جاتی ہے مگر نیچے گہرائی میں اضطراب کا لاوا کھولتا رہتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کوئی گناہ ہے یا کسی گناہ کی مہیب سزا۔

میں نے بھٹکی ہوئی تاریخ کو جب دیکھا تو یہ وہ زمانہ تھا جب میں چوری چھپے شعر کے نام سے تک بندیاں کر کے دو چار بار اپنے آپ ہی کو سنا کر پھاڑ دیا کرتا تھا، جب شطرنج کی بازیاں ہوتی تھیں، اور جب میں اقبال کی "زبورِ عجم" افلاطون کی "ریاست"، رضی الدین صدیقی کی "نظریۂ اضافیت"، ایف کے دُرّانی کی "محمدی پراڈکٹ" اور قادیانیوں کی "احمدیہ پاکٹ بک" کا مطالعہ کرتا تھا۔ ۔ ۔ اور جب بڑی بے باکی سے ملحدانہ بحثیں اٹھاتا تھا۔

اُس روز میں نے اپنی بھٹکی ہوئی تاریخ کو دیکھا کہ وہ خودکشی کرنے جارہی ہے
وہ تیزی سے بھاگم بھاگ جارہی تھی کہ اچانک اُسے ایک آواز سنائی دی،

"ہندوستان میں تیزی کے ساتھ ایک انقلاب آرہا ہے ۔۔۔ پھر اِس سے بہت بڑے پیمانے پر ایک دوسرے انقلاب کا سامان تمام دنیا میں ہو رہا ہے"

وہ ذرا چونکی مگر رُکی نہیں۔ پھر یہ الفاظ فضا میں پھڑ پھڑائے،

"جس سیلاب میں تم گھر گئے ہو، اس کے ساتھ بہنے میں تمہارا وجود نمک کی طرح تحلیل ہوا جارہا ہے اور اس کے مقابلے میں جامد چٹان بن کر تم اپنی جگہ جم بھی نہیں سکتے، لہٰذا آؤ، اب بہادروں کی طرح اس سیلاب کا رُخ پھیر دو اور اسے اس رُخ پر بہنے کے لیے مجبور کر دو جو تمہاری فطرتِ مسلمہ کے مقتضا سے مطابقت رکھتا ہو"

اب تاریخ نے اُس طرف چہرہ موڑ کر کان لگا دیے جدھر سے آواز آرہی تھی
اور اس کی چال قدرے دھیمی پڑ گئی۔ نامعلوم نقیب پکار رہا تھا کہ،

"قوت ڈھل جانے کا نام نہیں، ڈھال دینے کا نام ہے۔ دُنیا میں کبھی نامردوں اور بزدلوں نے کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا جو لوگ اپنا کوئی اصول اور کوئی نصب العین نہ رکھتے ہوں، جن کو دُنیا میں محض آسائش اور سہولت ہی مطلوب ہو، ایسے لوگوں کا کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انسانی تاریخ میں نہیں پایا جاتا"

اَب تاریخ رُک کر کھڑی ہوگئی اور اس نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے اپنے
آپ کو پوری طرح آواز کی طرف متوجہ کر لیا۔ اب یہ جملہ سنائی دیا،

"کوئی تہذیبی و تمدنی حرکت جمود کی چٹانوں سے نہیں روکی جاسکتی۔ اس کو اگر روک سکتی ہے تو ایک مقابل کی تہذیبی و تمدنی حرکت ہی روک سکتی ہے"

سوال اُبھرا کہ مقابل کی کون سی تہذیبی و تمدنی حرکت ؟ ۔ ۔ ۔ اور جواب یہ تھا کہ :۔

"مسلمان ایک بین الاقوامی جماعت (International Party)

کا نام ہے۔ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظامِ تہذیب و تمدن بنانے کیلئے اُٹھی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر ایک بڑی جہانی قومیت (World Nationality) بنانا چاہتی ہے"

تاریخ پہ تو نجانے کیا گزری۔ میرا حال یہ ہُوا کہ جیسے کسی جوہری دھماکے سے ایک دُنیا کی دنیا ٹوٹ پھوٹ جائے اور اس کے کھنڈروں سے عالمِ نو کا طلوع ہو رہا ہو۔ یہ دراصل ایک عظیم، زندگی افروز خیال کا دھماکہ تھا۔ عظیم زندگی افروز خیال، جس کا ظہور علم سے ہوتا ہے اور جس میں ایمان کی روح کارفرما ہو جاتی ہے۔ زمانے کو زیر و زبر کر دیتا ہے۔ اس سے تحریک ظہور میں آتی ہے۔ سلطنتیں ٹوٹتی اور بنتی ہیں۔ سرحدوں کی لکیریں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ معاشرے کے رابطے متغیر ہو جاتے ہیں۔ افراد کی شخصیتوں کا نقشہ بدل جاتا ہے اور تاریخ کو کھویا ہوا راستہ مل جاتا ہے۔ میں نے خیال کے اس دھماکے کے بعد یہ دیکھا کہ کچھ دیر کے لیے نگاہوں سے انگریزی حکومت، کانگریس، مسلم لیگ، خاکسار تحریک، جمیعت العلماء، شطرنج کی بساط، شعروں کی بیاض، احمدیہ پاکٹ بُک سبھی کچھ غائب ہو گیا ہے اور وسیع خلا میں صرف میں باقی ہوں۔ ساری تاریخ میرے اندر جذب ہو گئی ہے۔ پہلی بار محسوس کر رہا ہوں کہ میں مسلمان ہوں اور میرے سپرد تو ایک عظیم الشان نصب العین ہے۔

یہ نقیب تھا کون؟ یہ کس کی آواز تھی؟ وہ کہاں ملے گا؟ تو چلیے، آپ کو اس کے پاس لے چلوں۔

عجائباتِ عالم کے سلسلے میں نیاگرا آبشار کا ذکر تو آپ نے سُنا ہوگا۔ یہ کینیڈا اور امریکہ کی سرحد پہ واقع ہے۔ ۳ء۴۲ درجے بجانب شمال اور ۱ء۷۹ درجے بجانب مغرب۔ یہاں سے بہ خطِ مستقیم فاصلہ اندازاً دس ہزار میل ہوگا۔

لیجیے، ذرا اُدھر دیکھیے، آبشار سے ذرا فاصلے پر ایک پارک کے پاس جو گاڑی ابھی ابھی رُکی ہے، اس میں سے ایک سفید ریش بزرگ باہر آئے۔ بہت آہستہ آہستہ وہ چل رہے ہیں۔ یہ کئی روز سے ہر شام کو یہاں آکر ٹہلتے ہیں۔ وضع قطع دیکھنے والوں کو چونکا دیتی ہے۔ کیوں کہ یہ نہ امریکی ہیں، نہ کینیڈین، بلکہ پوری مغربی دنیا سے انداز جُدا ہے۔ یہی ہے وہ نقیب جس کی زلزلہ افگن آواز ۴۴ سال پہلے میں نے سُنی تھی۔ آج کل یہ شخصیت اپنے فرزند کی دعوت پر علاج اور آرام کے لیے " بفیلو" (Buffalo) میں مقیم ہے جو نیاگرا آبشار سے ۲۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس بزرگانہ پیکر کے اندر وہ جوانِ معرکہ پسند موجود ہے جو کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ اس کا یہ پُرانا فقرہ تھوڑی دیر بعد بار بار گونجتا ہے اور ہر بار اپنی موجِ نفس تلوار بن جاتی ہے۔

"میرے لیے تو یہ تحریک عین مقصدِ زندگی ہے۔ ۔ ۔ کوئی ساتھ نہ چلے گا تو میں اکیلا چلوں گا۔ ساری دُنیا متحد ہو کر مخالفت کرے گی تو مجھے تن تنہا اس سے لڑنے میں بھی باک نہیں ہو گا۔"

تو یہ ہیں حکیم جہاد آرا ۔ ۔ ۔ مولانا مودودی!

مولانا مودودی جن کی محیر العقول قوتِ ارادی نے بڑے سنگین امراض، پیچیدہ حالات اور تحریکی مراحلِ عشق کی آزمائشوں پر مسلسل فتح پائی ہے۔ ان کے بارے میں توقع یہی ہو سکتی تھی کہ وہ کم سے کم ۸۵ برس تک اپنی بھاری بھرکم ذمہ داریوں کی گاڑی بخوبی کھینچنے کے بعد شاید کسی مرحلے میں یہ ضرورت محسوس کریں کہ اب انھیں ہلکا پھلکا دورِ فراغت گزارنا چاہیے۔ پھر ایسا کیوں ہوا کہ وہ ستر برس پورے کرنے سے پہلے ہی اپنے قافلے کی عملی سربراہی سے مستعفی ہو کر صحت و قوت کی تلاش میں لگ گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس شخص کے دماغ سے مختلف موضوعات پر ۷۰، ۸۰ چھوٹی بڑی تصانیف کی بیش بہا فصل انسانیت نے حاصل کی ہے اور جس کے نخلِ قلم سے سرسری اندازے کے مطابق ڈھائی تین کروڑ الفاظ کے شگوفے

چھوٹے ہیں۔ تقریروں، گفتگوؤں، انٹرویوز اور مجالس کی بحثوں کا حساب الگ۔۔۔
اور جس شخص کے اعصاب کی پٹڑیوں پر سے اذیت ناک حوادث اور ناخوشگوار واقعات
کی گاڑیاں آدھی صدی کے دور میں مسلسل گزرتی رہی ہیں اور وہ ان کے کرب کو تبسم
چہرے کے ساتھ اپنے اندر ہی جذب کرتا رہا ہے اور جس نے اپنا سارا سفر الزامات
کے خارزاروں کو روندتے ہوئے اور گالیوں کی بوچھاڑوں کا مقابلہ کرتے ہوئے
طے کیا ہے، اسے اگر وقت کی چکی کے بھاری اور کھردرے پاٹ اب تک پیس
ڈالنے میں ناکام رہے ہیں تو یہ ایک کرامت ہے کرامت!

بہرحال وہ "جوان بزرگ" اب بھی کام کر رہا ہے۔ اس کا جنون امریکہ میں بھی
فارغ نہیں بیٹھا، وہ نیاگرا آبشار کے قریب انسانی کردار کے سرافگندہ آبشاروں کو
سربلند فواروں میں بدل رہا ہے۔

ہمارے ایک دوست وہاں سے لکھتے ہیں:

"بالآخر حلقۂ احبابِ اسلامی (حلقہ میں ایسے افراد شامل ہیں جو امریکہ میں مسلم طلبہ کی
تنظیم M-S-A اور پاکستانی طلبہ کی تنظیم .P.S.A کے تحت امریکہ کے اسلامی مراکز
اور مساجد میں اہم ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں) نے یہ طے کیا کہ مولانا محترم سے
ملنے کی سب سے بہتر صورت یہ ہوگی کہ حلقہ کی شوریٰ کا اجلاس۔۔ شہر "بفیلو" میں
رکھا جائے۔ پہلی ملاقات یکم جون کو ہوئی (بعد نمازِ عصر) ارکانِ شوریٰ، پھر علاقائی
ناظمین کا اور اس کے بعد دیگر ارکان کا جو خاص دعوت پر آئے تھے، تعارف کرایا۔
سب سے زیادہ تعداد نیویارک اور نیوجرسی (اور ان کے متعلقہ علاقوں) کے ارکان
کی تھی۔ ان کے علاوہ بالٹی مور، شمالی کیرولینا، فلاڈلفیا، شکاگو، ڈیٹرائٹ، برج پورٹ،
کینیڈا کے شہر ٹورنٹو اور مشرقی صوبے نوواسکوشیا کے ارکان تھے۔ اس قسم کی ایک
نشست ۲ جون کو بھی ہوئی اور ۳ جون کو احباب اس عظیم انسان کو خدا حافظ کہہ کر اپنے
اپنے مقامات کو رخصت ہو گئے جس نے دینِ حق کے وہ بیج امریکہ میں بو دیے ہیں جو۔ ایک
ایسے شجرِ کریم کی صورت میں نمودار ہوں گے جس کی موجودگی میں مادہ پرستی اور زرپرستی

کے جھاڑ جھنکار کے لیے کوئی جگہ نہ رہے گی۔ امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے لیے مولانا مودودی محض ایک شخصیت نہیں ہیں بلکہ موجودہ صدی میں اسلام کا Symbol ہیں۔ سید مودودی سے بہت سے سوالات اسلامی انقلاب اور جہاد کے بارے میں کیے گئے، مولانا نے جو جواب دیے ان میں دو الفاظ باربار سامنے آئے صبر اور حکمت بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ یہ دو الفاظ مولانا کی فکر کا نچوڑ ہیں۔"

جی ہاں! حکمت جہل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اور صبر ظلم کے خلاف محاذ آرا ہونے کے لیے!

مولانا سے متذکرہ مجلس میں جن مختلف موضوعات پر سوال ہوئے وہ یہ تھے، امریکہ میں مستقل قیام کے مسائل، امریکہ میں اشاعتِ اسلام کے لیے طریق کار، وہاں کے حالات میں ابھرنے والے فقہی مسائل، تفہیم القرآن کے انگریزی ترجمے اور اس کی تمام جلدوں کے انڈکسوں کو یکجا کرنے کی ضرورت، جہاد اور قتال، اسلامی انقلاب کا صحیح نہج اور اس میں اخلاق کی اہمیت، انتخاباتِ پاکستان ۱۹۷۰ء، جماعت اسلامی کا اصل نصب العین، مورخ فلسفی ٹوائن بی کا پیش کردہ عالمگیر دین کا تصور، یہودیت اور عیسائیت، برتھ کنٹرول، تبدیلیٔ قلب کے آپریشن، بھارت کا ایٹمی دھماکہ، امریکی معاشرے میں اسلامی قانونِ حجاب پر عملدرآمد کرنے میں مشکلات، مسئلہ سود، قربانی اور قربانی کے گوشت کی تقسیم کا مسئلہ، زکوٰۃ کا استعمال برائے تالیف قلوب اور قرآن کے حروفِ مقطعات! مولانا سے اسی طرح گوناگوں سوال ہوتے ہیں اور اُن کا انسائیکلوپیڈیائی ذہن اطمینان بخش جواب دیتا جاتا ہے۔ لوگ انھیں کمپیوٹر کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ جو چاہا سوال سامنے رکھ دیا اور چند سیکنڈ میں جواب وصول!

اندازہ کیجیے کہ زرپرستی اور حرام کاری کے جہنم میں کام کرنے والوں کو ایک شخص نے کس طرح تھام رکھا ہے کہ وہ وہاں کی تہذیب کی صیادی کا شکار بننے کے بجائے اُلٹا صیادین کر حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ میں آدمیوں کو دینِ حق کا شکار بنانے میں لگے ہیں۔

مولانا کے خطوط سے معلوم ہوا کہ ملاقاتیوں کی ایک تعداد وہاں کے حبشی النسل

مسلمانوں کی ہوتی ہے جو وقت کے عظیم نقیبِ اسلام کا ذکر سنتے ہیں تو حاضر ہو کر رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

دُنیا میں مروجہ اصطلاح کے لحاظ سے بڑے آدمی اتنے ہیں کہ بڑا آدمی ہونا کوئی خاص بات نہیں رہی۔ سائنس دان، جج، جرنیل، بینک کار، کروڑپتی، صناع، سربراہانِ مملکت اور وزراء، فلمی ڈائریکٹر اور ایکٹر، موسیقار، مصوّر، ناول نگار، شاعر، صحافی، کرکٹ اور ہاکی کے چیمپئن، گھونسہ بازی اور کشتی کے ماہرین، حُسن کی ملکائیں، چھاپہ مار، اور نجانے کون کون!

اصل بڑے آدمی ان بڑے آدمیوں سے ذرا اُوپر کی سطح پر ملتے ہیں۔ اُن کی بڑائی یہ ہوتی ہے کہ معاشرے کا اچھا عنصر اُن کی طرف کھنچتا ہے اور جو کوئی بھی ان کے قریب جاکر اثر لیتا ہے اس میں ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بڑا آدمی اسے کہیے جو انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں بڑائی پیدا کر دے۔

مولانا مودودی کو جس کا جی چاہے، دل کھول کر بُرا بھلا کہے اور سخت خطرناک آدمی قرار دے، مگر اُن کے اس کارنامے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے ہزار ہا انسانوں کو راست فکری، بیداریٔ دل، صبر و عزیمت، نظم، شائستگی، ذوقِ مطالعہ، اظہارِ حق اور ایثار کی صفات سے آراستہ کر دیا ہے۔ بہت سے افراد کو ان کی دعوت نے معمولی زندگی کے دائرے سے اُٹھا کر جگمگاتی شخصیت سے مالامال کر دیا ہے۔

پھلور کے فنگر پرنٹ بیورو کا ایک سب انسپکٹر مولانا مودودی کے مشن کو قبول کرتے ہی اپنی غیرت ایمانی کے سبب انگریز کی ملازمت کا جوا اُتار کر دیتا ہے۔ بیورو کے ملازم ہم چشموں کے لیے تنور لگا لیتا ہے۔ وہ دال روٹی بھی بیچتا ہے، لٹریچر بھی پڑھاتا ہے اور وضاحتِ مدعا کے لیے بحثیں بھی کرتا ہے۔ یہ تھے چودھری علی احمد خاں (مرحوم) جنھوں نے مشرقی پاکستان جاکر سب سے پہلے ان حالات

کی تفصیلی رپورٹ ۱۹۵۵ء میں پیش کی، جن کا تلخ نتیجہ ۱۹۷۱ء میں ملک ٹوٹنے کی صورت میں سامنے آیا[1]

کپورتھلہ کے ایک نوجوان وکیل وکالت چھوڑ کر طرح طرح کے ناکام تجربے کرتے ہیں اور ان کی خوش حال زندگی درویشی میں بدل جاتی ہے۔ آج وہ تحریک احیائے اسلام کے محاذ پر مولانا مودودی کے بعد نمبر ۲ کے آدمی ہیں اور عملی ذمہ داریوں کے لحاظ سے نمبر ایک[2] پر۔ یہ ہیں میاں طفیل محمد۔

ایک نوجوان ایئر فورس سے نوکری چھوڑ کر آتا ہے اور کراچی سے اخبار اس شان سے نکالتا ہے کہ وہ ایڈیٹر، کلرک اور چپڑاسی ہے اور اس کے اہل خانہ ڈسپیچ کا کام کرتے ہیں۔ یہ متعدد کتابوں کا مصنف ہے۔ اوّل درجے کا مقرر ہے اور تنظیمی دائرہ میں قائدانہ ذمہ داریاں انجام دے چکا ہے اور لوگ اُسے اسعد گیلانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

دل میں اب اُس شخص کا تصوّر بھی اُبھر آیا جس کا استقبال میں اس مصرعے سے کرتا ہوں کہ "آمد آں یارے کہ ما می خواستیم" وہ جب تحریک کے روزنامے کا ایڈیٹر تھا تو بقول علی سفیان آفاقی، جس دماغ سے اداریے لکھتا تھا، اس کی پرورش کے لیے چنے کھا کر وقت گزار لیتا تھا۔ یہ چند سال پہلے ترقی کی راہ پہ بڑھتا ہوا ایک فوجی افسر تھا۔ یہ وہی مصباح الاسلام فاروقی ہیں جنھوں نے یہودی سازش (JEWISH CONSPIRACY) نامی کتاب (جو ضبط ہو گئی تھی) لکھ کر پہلی بار اہل پاکستان کو بہت بڑے مسلم دشمن فتنے کے اژدہا سے آشنا کیا۔ آج کل یہ صاحب جنوں، قلم ایک طرف رکھ کے مرغیاں پالنے کا تجربہ کر رہا ہے۔ اسرائیلی انٹیلی جنس کو سب پتہ ہو گا کہ اُن کے ایک حریف پر کیا گزری[3]

---

[1] چودھری صاحب، وفات ۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء [2] اس کتاب کی اشاعت کے وقت قائد تحریک اسلامی ہیں۔ [3] فاروقی صاحب، وفات نومبر ۱۹۷۶ء

ذرا عام کارکنوں کے دائرے میں چلیے۔ صرف ایک مثال،

کراچی کے ایک ممتاز قانون دان کے دفتر میں رات گئے کام ہو رہا ہے۔ ایک نوجوان بلا معاوضہ کاغذات ٹائپ کر رہا ہے۔ اسے گھر کے ٹیلی فون پر اطلاع ملتی ہے کہ بیمار بچّے کی حالت خراب ہے۔ نوجوان جواب دیتا ہے کہ میں اپنی ڈیوٹی ختم ہونے سے پہلے یہاں سے نہیں اٹھ سکتا۔ خود غرضی اور نفس پرستی کا جو موسم بہار معاشرے پر طاری ہے اس کے پیش نظر فاضل قانون دان کے لیے یہ تجربہ بڑا حیرتناک تھا۔ وہ لاہور کے پارک لگژری ہوٹل میں ایک مجمع شرفا کے سامنے اپنے تاثر کا اظہار یہ کہہ کر کرتا ہے کہ مولانا مودودی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پاکستان میں بے لوث کارکنوں کی ایک ٹیم پیدا کر دی ہے۔

یہ مجمع شرفار مولانا مودودی ہی کو ۱۹۶۴ء کی قید سے رہائی پانے پر استقبالیہ دینے کے لیے جمع ہوا تھا۔ متذکرہ قانون دان اسے کے بعد ہی تھے اور نوجوان ٹائپسٹ کے ذمّے مولانا مودودی ہی کے کاغذات ٹائپ کرنا تھا۔

بس ایک مثال مجھے اور پیش کرنا ہے۔ میری اقامت گاہ کے قریب ہی نوجوانوں کا ایک گروہ رہتا ہے۔ عمریں ۹، ۱۰ برس سے ۱۶، ۱۸ برس تک۔ سبھی بے حد ذہین اور زیرک ہیں۔ انھوں نے اپنے مسکن کا نام "مشرقی پاکستان ہاؤس" رکھا ہے۔ یہ وہ نوجوان ہیں جن میں سے کچھ تو بھارت کی قید سے نکل کر یہاں پہنچے ہیں اور کچھ نیپال، برما کے راستے سے۔ ان میں سے کچھ بہاری خاندانوں کے ہیں اور کچھ بنگالی الاصل۔ جب مشرقی پاکستان پر "مکتی باہنی" کے پردے میں مُلحد اشتراکیوں کے ساتھ مل کر بھارت کے ہندو ایجنٹ ٹوٹ پڑے اور دہشت گردی اور قتل و غارت کا بازار گرم کر کے انھوں نے بھارتی جارحیت کا راستہ ہموار کرنے کیلئے بدتر سے بدتر حربے اختیار کیے، انھوں نے فدایان اسلام اور محبان وطن کو چن چن کر قتل کیا اور جہاں کھلا موقع ملا بڑے بڑے مقتل قائم کر کے ان میں گردنیں کاٹنے کے لیے بانس کے خاص اڈّے بنا کر صدہا مرد و زن اور طفل و پیر کو زندگیوں سے محروم کیا،

اور ان کی اجتماعی قبریں بنائیں۔ یہ لوگ پاکستانی فوج پر بھی حملے کرنے لگے اور ان کے ہر آپریشن کو ناکام بنانے کے لیے چھاپہ مار سرگرمیاں اختیار کیں۔ پاکستانی فوج کو اس بے بسی کے عالم میں مدد دینے کے لیے بے لوث رضاکاروں کی ٹیمیں جگہ جگہ نمودار ہونے لگیں۔ بڑی عمر کے جن لوگوں نے خدمات پیش کیں انھیں "الشمس" کے نام سے اور کم عمر نوجوانوں اور لڑکوں کو "البدر" کے نام سے منظم کر کے تربیت دی گئی۔ نوجوانوں اور لڑکوں کا کردار تڑپتی بجلیوں جیسا تھا۔ ابھی کسی مرکز سے ہدایات لیں اور جھٹ سے دشمن کی کسی کمین گاہ پر موجود! کسی جگہ سے مشتبہ لوگوں کی نقل و حرکت دیکھی، فوری طور پر اس کی رپورٹ فوج کے ذمہ داروں کے سامنے حاضر۔ معوذ و معاذؓ کی یاد تازہ کرنے والے نونہال جن کی عمریں گیند بلّے سے کھیلنے کی تھیں، اب رائفلوں اور گرینیڈوں کا نیا کھیل کھیل رہے تھے۔

یہ نوجوان جن کے ساتھیوں کی ایک بڑی تعداد شہادت پا چکی، بہت سے اپنے اعضاء سے محروم ہوئے۔ اکثر کے ماں باپ، بہن بھائی پردۂ عدم کے پیچھے چلے گئے اور جن کے لیے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارتی جارحیت نے اپنے ہی وطن کی سرزمین تنگ کر دی، مصیبتوں کی دہکتی بھٹی سے گزرنے کے بعد آج ہنستے مسکراتے تعلیم و مطالعہ میں مصروف ہیں۔ مختلف زبانیں سیکھ رہے ہیں، اسلامی انقلاب میں اپنا حصہ ادا کرنے کی تیاری کر رہے ہیں اور بے تاب ہیں کہ موقع ملے تو "بنگلہ دیش" میں جا کر اپنے چھوڑے ہوئے ادھورے کام کو مکمل کریں۔ ان نوجوانوں اور بچّوں کو کون جانبازی و قربانی کے محاذ پر لایا؟ اس سوال سے جسے دلچسپی ہو وہ ان نوجوانوں سے خود مل کر معلوم کر لے۔

بڑا کام روپیہ جمع کرنا، فصلیں اگانا، فیکٹریوں سے مصنوعات کے انبار منڈیوں میں لانا، زرِمبادلہ کمانا، عمارات اٹھانا، مینار کھڑے کرنا، مویشیوں کے میلے لگانا، اور ثقافتی شو دکھانا نہیں۔ ۔ ۔ بڑا کام انسان گری ہے۔ ٹوٹتے ہوئے آدمیوں کی تعمیرِ نو! تم چاہو تو مودودی کی انسان گری کے نمونے پاکستان کے ہر کونے میں دیکھ سکتے ہو۔ وہ ایک خاص طرح کا کردار ہے جو وقت کے سٹیج پر جابجا جلوہ گر ہے۔

پاکستان ہی میں نہیں، تم اسے بھارت میں بھی دیکھو گے۔ سیلون میں اسے متحرک پاؤ گے۔ مقبوضہ کشمیر میں بھی وہ ملے گا۔ نیپال، بھوٹان اور برما میں بھی دکھائی دے گا۔ ۔ ۔ اور وقت کی چند گردشوں کے بعد یہ منظر بھی دیکھو گے کہ "بنگلہ دیش" کے پٹ سن کے کھیتوں اور چائے کے باغوں میں بھی یہ کردار باقاعدہ منظم اسلامی تحریک اُٹھا چکا ہوگا۔ برصغیر تو کیا، یوکے میں، امریکہ میں، کینیڈا میں، جرمنی میں، کوریا میں، جاپان میں وہ آہستہ آہستہ سر اُٹھا رہا ہے، اور عالمِ اسلام کے ہر خطے میں تم اسے موجود فعال پاؤ گے۔ اس کے نام، اس کے لباس اور اس کی بولیاں کئی کئی ہیں، مگر اس کی حقیقت ہر جگہ ایک ہے۔

مودودی کی دعوت کے جوہری بم کا زنجیری ردِ عمل بجانے کہاں کہاں تک تابکاری پیدا کرتا جا رہا ہے۔ ایسے کام کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

اُب میں چاہتا ہوں کہ تصور کے پَر لگا کر اُس وقت کی دِلّی میں چلیں، جب دِلّی، دِلّی تھی۔ وہاں ذرا مولانا کے خاندانی پس منظر کی ایک جھلک دیکھ لی جائے۔ خود مودودی ہی ہمیں اپنے خاندان کی سیر ان الفاظ کراتے ہیں:

"سادات اہلِ بیت کی ایک شاخ تیسری صدی ہجری میں ہرات کے قریب ایک مقام پر آکر آباد ہوئی جو چشت کے نام سے تمام دُنیا میں مشہور ہوا۔ اس خاندان کے نامور بزرگ حضرت ابو احمد ابدال چشتیؒ (متوفی ۳۵۵ھ) حضرت حسن مثنیٰ بن حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے نواسے اور جانشین حضرت ناصر الدّین ابو یوسف چشتیؒ (متوفی ۴۵۹ھ) سادات کی دوسری شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کا سلسلہ نسب امام علی نقی علیہ السّلام کے واسطے سے امام حسینؓ تک پہنچتا ہے۔ حضرت ناصر الدّین ابو یوسف کے فرزند اکبر حضرت خواجہ قطب الدّین مودود چشتی (متوفی ۵۲۷ھ) جو تمام سلاسلِ چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ اور خاندانِ مودودیہ کے مورث ہیں۔ (خواجہ معین الدّین کے شیخ حضرت عثمان ہروَنیؒ، ان کے شیخ حضرت حاجی شریف زندنیؒ،

اور ان کے شیخ حضرت خواجہ قطب الدین مودود رحمتہ اللہ علیہم)۔
"خاندانِ مودودیہ کی جس شاخ سے میرا تعلق ہے وہ نویں صدی ہجری کے اواخر سے ہندوستان میں آیا ہے۔ ہمارا خاندان پہلے براس ضلع کرنال میں تھا۔ پھر وہاں سے منتقل ہو کر شیخ پورہ ضلع میرٹھ میں آباد ہوا، اور اس کے بعد دہلی منتقل ہو گیا"۔ (مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی حصہ دوم خط نمبر ۱۰) اس شاخ کے پہلے بزرگ حضرت ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۹۳۵ھ) تھے۔

"ننھیال کی طرف سے میں ترکی الاصل ہوں۔ میرے نانا میرزا قربان علی بیگ خاں سالک، گو خود شاعر اور صاحبِ قلم تھے مگر پشت ہا پشت سے ان کا پیشۂ آبا سپہ گری تھا۔ شاہ عالم کے زمانے تک اس خاندان کے لوگ کسی نہ کسی طرح شاہی خدمت بجا لاتے رہے۔ حضرت سالک مرحوم کے والد نواب عالم بیگ خاں اور چچا نواب نیاز بہادر نواب میر نظام علی خاں کے آخری عہد میں حیدر آباد آئے۔ عالم بیگ خاں کی شادی عبد الرحیم خاں قلعہ دار گولکنڈہ کے خاندان میں ہوئی اور انہی کے بطن سے حضرت سالک مرحوم پیدا ہوئے"۔ (مولانا نے لکھا ہے کہ جناب سالک، مرزا غالب کے شاگردوں میں سے تھے اور یہ بھی کہ مرزا غالب کا مکان مولانا کے ننھیال کے مکان سے متصل واقع تھا۔ (مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، حصہ اوّل خط نمبر ۱۵۹) ۱۸۷۴ء میں حضرت سالک نے انتقال فرمایا۔ میرے والد سید احمد حسن صاحب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے دو سال بعد دلی میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بالکل ابتدائی دور کے طالب علموں میں سے تھے۔ مرزا قربان علی سالک کے دو بیٹے اور چار لڑکیاں تھیں۔ ۔ ۔ سب سے چھوٹی صاحب زادی رقیہ بیگم صاحبہ مرحومہ میری والدہ تھیں۔

"میں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء (عجیب اتفاق ہے کہ حضرت

شاہ ولی اللہؒ کا سال پیدائش ۱۷۰۳ء ہے) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔ پیدائش سے تین سال قبل ایک بزرگ والد صاحب کے پاس آئے تھے۔ انھوں نے میری پیدائش کی پیش گوئی کی تھی اور والد صاحب سے فرمایا تھا کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔ والد نے اُن کے ارشاد کو قبول کیا اور یاد رکھا، چنانچہ جب میں پیدا ہوا تو اس نام سے مجھے موسوم کیا گیا۔

"سرسید احمد خاں ایک قریبی رشتے سے میری دادی صاحبہ کے بھائی ہوتے ہیں اور میرے والد اُن کے بھانجے تھے"

اب ہمارے سفرِ مطالعہ کی منزل حیدرآباد ہے:

مولانا کے ننھیالی خاندان کا تعلق پہلے سے حیدرآباد دکن سے تھا حضرت قربان علی بیگ خاں سالک کے والد اور چچا پہلے سے حیدرآباد میں تھے۔ مولانا کے والد گرامی مولوی سید احمد حسن صاحب نے جنھوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور الہ آباد سے وکالت کا امتحان پاس کیا، ۱۸۹۶ء میں مولوی محی الدین صاحب میر عدل کی دعوت پر اورنگ آباد دکن میں جاکر وکالت شروع کردی۔ ۱۹۰۴ء میں جب کہ مولانا مودودی کی عمر ایک سال تھی انکے والد نے ترکِ دنیا کر کے سارا اثاث البیت لٹایا اور واپس دہلی آگئے۔ اور درگاہ حضرت نظام الدینؒ کے پاس مقیم ہوگئے۔ مولوی محی الدین خاں صاحب نے سمجھا بجھا کر پھر بلوایا۔ ۱۹۱۵ء تک اورنگ آباد میں شدید پابندیوں کے ساتھ وکالت کی، پھر حیدرآباد آگئے جہاں فالج کا حملہ ہوا اور چار سال بیمار رہ کر ۱۹۲۰ء میں انتقال فرمایا۔

آیئے حیدرآباد میں مولانا مودودی کی دو ایک جھلکیاں دیکھیے۔ ماہر القادری لکھتے ہیں:

"تقریباً دو سال کے بعد خود میرا حیدرآباد دکن جانا ہوگیا۔ مولانا مودودی

وہاں پہلے سے پہنچ چکے تھے اور اپنے بڑے بھائی سید ابوالخیر مودودی
کے ہاں مقیم تھے۔ ابوالخیر صاحب دارالترجمہ عثمانیہ کے رکن تھے۔
بنگلے نما مکان تھا۔ سواری کے لیے موٹر تھی، نوکر چاکر تھے۔ اسی خوشحال
ماحول میں مودودی صاحب اپنے بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔ مجھے
یاد نہیں مودودی صاحب نے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی ادارت
کب سنبھالی، مگر اتنا یاد ہے کہ اب وہ معظم جاہی مارکیٹ سے ڈیڑھ
دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک دو منزلہ عمارت کے اوپر کے فلیٹ
میں رہتے تھے۔ ہمارے شدید اصرار پر مولانا مودودی نے دو یا تین
بار سینما بھی دیکھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مجھ پر تو فلم کا
نشہ سا سوار تھا اور مولانا مودودی پر ذرہ برابر اثر نہ تھا۔ سینما کی بلا
چلتے وقت وہیں سینما ہال میں دامنِ فکر و خیال سے جھٹک کر چلے
آئے۔ پھر ہمیں بھی اس کا احساس ہو گیا کہ یہ شخص ان چٹخاروں میں
ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس زمانے میں مولانا مودودی ڈاڑھی
بھی منڈواتے تھے۔ مولانا مودودی تنہا رہتے تھے۔ ایک ملازم تھا
جو ڈاک خانے ڈاک وغیرہ لے جانے کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ چائے
کا وقت ہوتا تو ہم مولانا کے ہاں چائے بھی پیتے، کئی بار ان کے ہاتھ
کے تلے ہوئے انڈے بھی کھائے۔ ریاست حیدر آباد دکن کا محکمہ
امورِ مذہبی بھی رسالہ "ترجمان القرآن" کے کئی سو پرچے خریدتا تھا۔
ایک سال یہ خریداری روک دی گئی۔ نواب صاحب (ذوالقدر جنگ
بہادر) یہ چاہتے تھے کہ مودودی صاحب ان سے خود آکر کہیں تو وہ
منظوری دیں۔۔۔ مولانا مودودی صاحب کو جب یہ اطلاع ملی تو
بولے کہ میں قیامت تک اس کام کے لیے ان کے پاس نہیں جاؤں
گا۔ یہ میرا نہیں دین کا کام ہے (مولانا مودودی ہی کے مختصر سے

دورِ شاعری کا ایک مصرعہ یہاں یاد آگیا ؏

طالب تو ہوں ضرور پہ سائل نہیں ہوں میں۔

(ادبیاتِ مودودی از پروفیسر خورشید احمد ص ۲)

غالباً محقق طوسی کی کوئی کتاب تھی (نہیں یہ تھی ملا صدرا شیرازی کی الحکمۃ المتعالیہ[1] فی الاسفار العقلیہ، معروف بہ اسفارِ اربعہ) اُردو میں منتقل کرنے کے لیے دارالترجمہ کی طرف سے مولانا مودودی کو معاوضہ پہ دی گئی تھی۔ مولانا مودودی نے پوری کتاب یا اس کے چند اجزا کا (دو اسفار کا ترجمہ کیا تھا جو طبع ہوتا تو ۲، ۲½ ہزار صفحات لیتا) ترجمہ صرف آٹھ مہینے میں کر کے دے دیا۔ جو معاوضہ ملا اس سے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تمام جلدیں (اور تفسیر و حدیث کی بعض کتب)

---

[1] علوم عقلیہ میں ان کی (یعنی ملا صدرا کی) کتاب "الاسفار الاربعۃ" [الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار العقلیہ] کو سب سے زیادہ مشہور کتاب کہا جا سکتا ہے جو بلا شک و شبہ حکمتِ اسلامی کی وقیع ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں منقسم ہے (۱) روح در سیر (۲) روح در سلوک (۳) روح در وصالِ نہائی با حق چار ابواب میں (۴) روح در طی مراتبِ کمال۔

کتاب کے دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے: "...... عارفین اور اولیاء کی راہ پر جو چلتے ہیں ان کے چار سفر ہیں۔ پہلا سفر وہ ہے جو مخلوقات سے شروع ہوتا ہے، دوسرا سفر وہ ہے جو حق کے ساتھ حق میں ہوتا ہے۔ تیسرا سفر پہلے سفر کے مدِمقابل ہوتا ہے کیونکہ اس میں حق سے خلق کی طرف حق کے ساتھ سفر کیا جاتا ہے اور چوتھا سفر دوسرے سفر کا ایک طریقے سے مدِمقابل ہے کیونکہ یہ سفر حق کے ساتھ خلق میں پایا جاتا ہے۔"

[اردو ترجمہ از مناظر احسن گیلانی، سلسلہ جامعہ عثمانیہ، ج ۱، ص ۲۳] اس کتاب کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں، بہت سے حواشی بھی رقم ہوئے ہیں۔

(اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ - ج ۱۲ - ص ۱۸ (اشاعت ۱۹۷۳ء)

خرید لیں۔"

حیدرآباد کے متعلق مولانا کا ایک مختصر قول بڑا اہم ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اس کا ریلا جب یہاں پہنچے گا تو نظام کی حکومت کا یہ قصر۔۔۔ ایک ٹینس میں زمین پر آرہے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ نظام کی حکومت گویا افیون ہے جسے کھا کر مسلمان غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔"

بیچ میں "ترجمان القرآن" کا (۱۹۳۳ء) کا ذکر آگیا۔ یہ صورِ حشر آفریں جس نے غارِ جمود کے کتنے ہی اصحابِ کہف کو اٹھا کر کھڑا کیا، جس نے اقبالؒ کے دل میں گھر کیا، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ایک مرحوم بزرگ کے چند الفاظ سے کیجیے جو ڈاکٹر محمد عطا الرحمٰن ندوی کے ذریعے ہم تک پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۳۶ء کی چھٹیوں میں گھر گئے اور "ترجمان القرآن" کے جمع شدہ پرچے والد گرامی کی خدمت میں پیش کیے، انھوں نے مطالعہ کر کے فرمایا:۔

"مجھے اس شخص کے متعلق سخت غلط فہمی تھی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔ یہ تو علامہ ابنِ تیمیہؒ کا رنگ ہے۔ تعجب ہے کہ اس قحط الرجال کے زمانے میں اور وہ بھی ہندوستان میں ایسا شخص کیوں کر پیدا ہوا۔ یہ شخص عملاً جب اس کام کو کرنے گا تو اس کی مخالفت بھی بڑے تشدد سے کی جائے گی۔"

بعد میں "ایک صالح جماعت" کا مضمون پڑھ کر فرمایا: "اگر یہ جماعت وجود میں آگئی تو میں اس کا پہلا ممبر بنوں گا۔" لیکن تشکیلِ جماعت سے صرف دس دن قبل وفات ہو گئی۔ یقیناً مرحوم کو پابندِ شریعت زندگی کے اجر کے ساتھ اس نیتِ جہاد کا اجر بھی ملے گا۔

اچھا تو ہمارا سفر طویل تر ہوتا جا رہا ہے۔ اب اگلی جست میں ہم پٹھان کوٹ کی بستی دارالاسلام (سرنا ریلوے سٹیشن) چلتے ہیں جہاں چودھری نیاز علی خاں کی وقف کردہ مختصر

سی عمارات میں اقبالؒ کا تجویز کردہ ایک اسلامی کلچر سنٹر قائم ہونا تھا اور جس کے لیے اقبالؒ ہی نے مولانا مودودی کا نام تجویز کیا۔ مگر ادھر مولانا مودودی حیدر آباد سے دارالاسلام منتقل ہوئے۔ اُدھر علامہ اقبالؒ نے دارِ بقا کی طرف انتقال فرمایا۔ آئیے، اب میرے ہی ایک سابق مضمون کی عبارت کے آئینے میں آپ جنگل اور کھیتوں کے درمیان بسی ہوئی انوکھی بستی کے مکینِ اعلیٰ کا عکس دیکھیے:

"غالباً مغرب کی نماز کا وقت قریب ہوا تو بستی کی مختصر سی آبادی... تین چار افراد -- مسجد کی طرف سمٹنے لگے۔ اذان ہوئی اور اس کی آواز پر قریب کے ایک کوارٹر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ وائل کا کرتہ، لٹھے کا غرارہ نما پاجامہ، سر پر وائل ہی کی ٹوپی، پاؤں میں غالباً بادامی رنگ کے سلیپر -- پورا لباس نہایت اُجلا جو سبز پس منظر میں عجب شان سے نمایاں تھا۔ اس سادہ لباس کے ساتھ ایک روشن چہرہ (جلد کی سپیدی کے ساتھ جوہرِ سیرت کی مخفی سی دمک لیے ہوئے) جس پر سکّہ بند مذہبی معیار سے چھوٹی شوخ سیاہ رنگ داڑھی کسی تعارف کے بغیر میں پہچان گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے خیالات سے میں نے تھوڑا سا استفادہ کیا ہے۔"

جمعہ کی متعدد نمازیں میں نے مولانا مودودی کے پیچھے دارالاسلام کی مسجد میں پڑھیں۔ مولانا نے جمعوں کے مواقع پر جو خطبے پڑھے وہ اب "خطبات" ہی کے نام سے یکجا ملتے ہیں۔ (رسالہ دینیات کے بعد مولانا کی سب سے عام فہم کتاب یہی ہے) ان خطبوں میں دین، عقائد، عبادات کی پوری حقیقت اس طرح بیان ہوئی ہے کہ اسلام کے جامع نظام ہونے کا تصور بھی ملتا ہے اور اسلام کو غالب کرنے کا اسلامی جذبہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ صرف ایک خطبے کی چند سطریں حاضر ہیں:

"اس دین کی تعلیم یہ ہے کہ زمین کا مالک اور انسانوں کا بادشاہ صرف

اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا اسی کی اطاعت اور بندگی ہونی چاہیے۔ زمین میں صرف اللہ کا حکم چلے۔ عدالت میں فیصلہ اس کی شریعت پر ہو، پولیس اسی کے حکم جاری کرے، لین دین اسی کے ضابطے کی پیروی میں ہو، ٹیکس اسی کی مرضی کے مطابق لگائے جائیں اور انہیں مصارف میں صرف ہوں جو اس نے مقرر کیے ہیں۔ سول سروس اور فوج اسی کے زیر حکم ہو۔۔۔ اور فی الجملہ انسان اس کے سوا کسی کے بندے بن کر نہ رہیں۔ کسی دین کے ساتھ یہ دین شرکت کہاں قبول کر سکتا ہے۔ ہر دین کی طرح یہ دین بھی کہتا ہے کہ اقتدار خالصتاً و مخلصاً میرا ہونا چاہیے اور ہر دوسرا دین میرے مقابلہ میں مغلوب ہونا چاہیے، ورنہ میری پیروی نہیں ہو سکتی۔ میں ہوں گا تو دین جمہوری نہ ہوگا۔ (مراد لادین مغربی جمہوریت) دین بادشاہی نہ ہوگا، دین اشتراکی نہ ہوگا، کوئی بھی دوسرا دین نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی دوسرا دین ہوگا تو میں نہ ہوں گا۔"

اب ہمیں ملتان جیل چلنا ہے۔ (زمانہ، اکتوبر ۱۹۴۸ء تا اپریل ۱۹۵۰ء) وہاں پہنچنے تک باتوں باتوں میں ہم آگے آنے والی گفتگو سے متعلق مولانا مودودی کے ماضی میں جھانک لیں۔ تحریک ترک موالات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں کہ "میں اس وقت سولہ سترہ سال کی عمر کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔" یہ لڑکا اس طوفانی دور کی سیاست میں تحریکِ خلافت سے وابستہ ہوا۔ افتادِ طبع کے تحت تحریکِ خلافت کے سرچشمہ۔۔۔ ترکیہ۔۔۔ کے حالات کا مطالعہ کیا۔ مطالعہ سے یہ کھلا کہ ترکوں کی قیادت قوم پرستی کی بنیاد پر کھڑی تھی اور اس کے مزاج میں مغرب سے آمدہ لادینیت بھی شامل تھی۔ دوسری طرف فتنہ گرانِ مغرب نے ترکی قوم پرستی کے مقابلے میں عربی قوم پرستی کو کھڑا کر دیا۔ ۱۷ سالہ نوجوان کی طبیعت میں کھٹک پیدا ہوئی۔ پھر ہندو مسلم اتحاد کا تماشا دیکھا اور اس کے سامنے یہ سوال اُبھرا کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کیسے ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں ترکوں نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا۔

اور اسی سال ہندو مسلم اتحاد کا ڈرامہ بھی ختم ہو گیا۔ ۱۹۲۵ء میں سوامی شردھانند نے شُدھی (مسلمانوں کو ہندو بنانے) کی تحریک شروع کی۔ ۱۷ سالہ نوجوان حیران تھا کہ یہ وہی شردھانند ہے جسے ہندو مسلم اتحاد کے زمانے میں مسلمان دلی کی جامع مسجد میں خود لے کر گئے تھے اور اس کو منبر پر کھڑا کر کے تقریر کرائی تھی اور اس وقت نوجوان کہتا ہے کہ "میں نے پھر سارے مسئلے کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمان حقیقت میں ایک مشنری قوم کا نام ہے، محض ایک قوم کا نام نہیں۔۔۔ محض ایک قوم کی حیثیت سے یہاں ان کی خیر نہیں ہے۔"

بات لمبی ہو رہی ہے، مگر افکار کی یہ ضروری کڑیاں جوڑنے کے بعد ہی ملتان والی زنجیر مکمل ہو گی، ایک پرانی تحریر سے اقتباس جو کانگریس کی تحریک آزادی پر روشنی ڈالتا ہے:

"میرا رفیقِ زنداں (یعنی کانگریسی ہندو) اس تدبیر میں ہے کہ جیلر کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لے اور اپنے ہاتھ پاؤں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی میرے ہاتھ پاؤں میں ڈال کر مجھے اپنا قیدی بنالے غضب یہ ہے کہ جیلر صاحب تو نرے جیلر تھے۔ مگر یہ ہمارے رفیق صاحب جو اب برقند ازبنتے ہیں ان کو مردم خوری کا چسکا بھی ہے۔ میں ہمت کر کے اٹھوں گا اور جیل کی دیواریں اپنے ہاتھ سے توڑنے کی کوشش کروں گا۔"

مولانا نے درپیش حالات کے سارے نقشے کو سامنے رکھ کر یہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ آزادی کیا ہے اور وہ کیوں مطلوب ہے؟ پھر جواب میں بتاتے ہیں:

"آزادی سے مُراد پہاڑوں اور دریاؤں کی آزادی نہیں۔ بلکہ باشندگانِ ملک کی آزادی ہے اور باشندگانِ ملک کی آزادی کی یہ صورت بھی مطلوب نہیں کہ ایک حلقۂ آبادی دوسرے کو محکوم بنالے جیسے اسی سرزمین پر آریہ

آزادانہ نشوو نما پائیں۔ اگر کسی قوم کے باشندے اپنی تہذیب سے بیگانہ ہو کر آزادانہ نشوونما کر رہے ہیں تو وہ درحقیقت غلام رہ چکے ہیں۔ اور آزادی صرف معاشی خوشحالی (جسے غالب گروہ چھین لے جا سکتا ہے) ہی کا نام نہیں کہ اسے باشندوں کے عقائد، طرزِ زندگی، زبان اور تہذیب و تمدن سے کوئی تعلق ہی نہ ہو (جن سے قوموں کا نیشنل ٹائپ بنتا ہے) حالانکہ ایک قوم کی زندگی دراصل اس کے نیشنل ٹائپ کی زندگی ہے اور اس کے نیشنل ٹائپ کا مر جانا خود اس قوم کا مر جانا ہے۔ ہر قوم اپنی ضروریات کو اپنے ہی نیشنل ٹائپ کے مطابق پورا کرنا چاہتی ہے۔ اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور اس کے نشوونما کی خواہش ہی دراصل آزادی کی طلب کا مبدا ہے۔"

یہ تو غیروں سے رزم گاہ میں بات ہو رہی تھی۔ جلد ہی وہ وقت آیا کہ اپنوں کی بزم میں مقدمہ اٹھانا پڑا کہ خدارا اپنے وعدوں کا پاس کیجیے اور قوم کے نیشنل ٹائپ (ایمانی و تہذیبی تشخص) پر رحم کھائیے؛ چنانچہ مولانا مودودی نے ملک کے تمام شہروں میں جا کر قوم میں بیداری کی لہر پیدا کی۔

ان کی تقریر کے محض چند جملے:

"پچھلے دس سال سے بحیثیت قوم ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ ہمیں ایک خطۂ زمین ایسا ملنا چاہیے جس میں ہم اپنے تہذیب و تمدن کو از سرِ نو قائم کر سکیں۔

"اب اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاکستان دے کر آزمائش میں ڈال دیا ہے اور وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ سچے تھے یا جھوٹے۔"

"اسلام کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے ذہن و فکر کا دوسروں کی غلامی سے آزاد ہونا اولین مقصد کی اہمیت رکھتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اغیار کی سیاسی محکومی سے تو آزاد کر دیا، لیکن ان کی ذہنی غلامی اور ان کی غیر اسلامی اقدار کے تسلط اور ان کی فکری محکومی میں

جس طرح ہم مبتلا تھے اس سے رستگاری نصیب نہیں ہو سکی۔"

(مکاتیب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی حصہ اوّل خط نمبر ۱۶۴)

"اگر یہ انقلاب فطری طور پر رُونما ہوا ہوتا تو اس مطالبے کی ضرورت پیش نہ آتی، بلکہ انقلاب کے بعد فوراً آپ سے آپ اس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی، لیکن بحالاتِ موجودہ ایک مصنوعی انقلاب کے بعد اسلامی نظام اب ایک منظم اور پُرزور مطالبے ہی کے ذریعے قائم کیا جا سکتا ہے۔"

"ہم تو وہ حکومت چاہتے ہیں جس کی ساری اسمبلیاں اور وزارتیں، نظامِ تعلیم اور نظامِ عدالت اور پورے کا پورا مالیاتی نظام اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔"

ان تصورات کے ساتھ مولانا مودودی نے قوم کے ہاتھ میں ایک چار نکاتی مطالبہ تھما کر تحریک اٹھائی جس میں خدا کی حاکمیت، قانونِ شریعت کی بالاتری، خلافِ شریعت قوانین کی منسوخی اور حاکمانہ اختیارات کو حدود اللہ کے اندر استعمال کرنے کے دستوری اعلان کو شدید ضروری قرار دیا گیا تھا۔

اس سلسلے میں فروری ۴۸ء میں لا کالج لاہور میں پہلی تقریر ہوئی۔ مئی میں دستوری مطالبے کے لیے دورہ کیا گیا اور اکتوبر میں مولانا مودودی ملتان جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے۔ اب ذرا جیل میں مولانا کے ذہن کی بلندی اور ادبی اسلوبِ بیان کا اندازہ کرنے کے لیے ان کی تحریروں کے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

"جس راستہ پر میں برسوں سے چل رہا تھا اُس میں یہ منزل تو بہرحال آنی ہی تھی حیرت اس کے آنے پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ اتنی دیر سے کیوں آئی۔ شیطان اور اس کی برادری نے اتنے دنوں تک مجھے برداشت کیسے کیا۔ یہ اُمید نہ رکھیے کہ کشمکش جلد ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا میری ماں اور بھائی اور بیوی اور بچوں اور مجھ سے تعلق رکھنے والے سب

لوگوں کو اپنا دل کڑا کر لینا چاہیے۔ جو کچھ سامنے آتا ہے میرے ارادے پر اس کا اثر اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا کسی چٹان پر مچھر کے حملے کا ہوتا ہے۔[۱]

"میں نے اپنی ۴۷ سالہ عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ مطالعہ و تحقیق اور غور و فکر میں صرف کیا ہے۔ میرے ذہن کا ایک خاص سانچا بن چکا ہے۔ میری زندگی کا ایک نصب العین قرار پا چکا ہے۔ اب اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ میرے ذہن اور خیالات اور مقصدِ زندگی، ہر چیز کو محض طاقت کی دھونس اور جیل کی ڈیل سے بدلا جا سکے گا تو میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا صحیح مقام ایوانِ حکومت نہیں، شفاخانۂ امراضِ دماغی ہے"

"میں جس اصلاح کے لیے کام کر رہا تھا اس کے راستے میں پتھر کے پہاڑ حائل نہیں تھے بلکہ گندگی و غلاظت کے فلک بوس انبار حائل تھے۔ میں نے تو خدا کی رضا کی خاطر اس گندگی کو صاف کرنے کے لیے قدم اٹھا دیا تھا اور جو غلاظت کے چھینٹے مجھ پر پڑنے شروع ہو گئے تھے ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر رہا تھا مگر میرے خدا نے مجھ سے چوہڑوں اور بھنگیوں کا کام لینا پسند نہیں کیا۔ اس لیے اس نے مجھے ایک گوشۂ عافیت میں لا کر بٹھا دیا اور اب وہ گندگی کے انبار انہی لوگوں کے سروں پر اٹھوا کر پھنکوا رہا ہے جن کی وہ گندگی ہے۔ یہ کام ابھی ادھورا ہے ابھی ایک ہی انبار صاف ہوا ہے چند انبار ابھی باقی ہیں، بلکہ غلاظت کا اصلی اور سب سے بڑا ڈھیر تو ابھی جوں کا توں رکھا ہے اس لیے میرے باہر آنے کا ابھی کوئی موقع نہیں ہے۔ جس روز یہ کام تکمیل کے قریب ہو گا، آپ لوگ ان شاء اللہ مجھے اپنے درمیان پائیں گے" (مکاتیبِ زنداں ص ۶۲)

"میرا عمر بھر کا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا میں کبھی وہ طاقتیں زندہ نہیں رہ سکی ہیں۔ جنھوں نے قلعوں میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ میدان کے مقابلے سے جی چرانا اور قلعوں کے پیچھے چھپنا بزدلی

---

[۱] اس عبارت کا حوالہ سامنے نہیں رہا۔

کی مکمل علامت ہے اور خدا نے اپنی یہ زمین بندوں کی فرماں روائی کیلئے نہیں بنائی ہے ...... جن لوگوں کا کاروبار جھوٹ اور فریب اور مکر کے بل چلتا ہے"... اور جن کو اپنی حکمرانی کی حفاظت کے لیے مخفی قسم کے قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے" ایسے اخلاقی بندوں کی چوبی ہنڈیا زیادہ دیر تک چڑھتے پہ نہ کبھی چڑھی رہ سکی ہے اور نہ رہ سکتی ہے... اگر یہ دنیا کی ہزاروں مرتبہ آزمائی ہوئی حماقتوں کا تجربہ کرنے پہ مصر ہی ہیں تو انھیں تجربہ کر لینے دو" مکاتیب زنداں ص ۲۰،

اب ہم ایک بڑے تاریخی لمحے کو واپس بلاتے ہیں جو ہمیں اپنے ساتھ ایک پھانسی کی کوٹھڑی میں لے چلے گا۔ چل کر دیکھتے ہیں کہ موت کو سامنے دیکھ کر ایک نازک ترین لمحے کی میزان میں تُلنے پر اس شخص کا وزن کیا نکلتا ہے۔ بات اتنی سی تھی کہ مولانا نے قادیانی جماعت کے لیے بہت سوچ سمجھ کر "سرطان کا پھوڑا" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس پر انھیں گرفتار کیا گیا۔ قلعے لے جایا گیا پھر مولانا جعفر تھانیسری والے سنٹرل جیل لاہور میں رکھا گیا۔ پھر فوجی عدالت کے سامنے مقدمے کا ڈرامہ ہوا۔ وہاں سے موت کی سزا سنائی گئی۔ ۔ ۔ اور مولانا پھانسی کی کوٹھڑی میں اس حال میں پہنچا دیے گئے کہ کھدر کے پاجامے کے ساتھ ازار بند اس لیے نہ دیا گیا کہ قیدی خودکشی نہ کر لے۔ پھانسی کی کوٹھڑی کے جنگلے پر رحم کی اپیل پر دستخط کرانے کے لیے آپ کے صاحب زادے عمر فاروق مودودی اپنے چچا کے ساتھ پہنچتے ہیں۔ مولانا ان کو جواب دیتے ہیں،

"بیٹا! ذرا نہ گھبرانا۔ اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانا منظور کر لیا ہے تو بندہ بخوشی اپنے رب سے جا ملے گا اور اگر اس کا حکم ابھی نہیں تو پھر چاہے یہ اُلٹے لٹک جائیں مجھ کو پھانسی پر نہیں لٹکا سکتے۔"

سزائے موت ختم ہونے کے بعد مجھ سے پہلی سرراہے (جیل ہی میں) ملاقات کے دوران یہ الفاظ کہے۔

"بڑے اطمینان سے تین راتیں گزریں اور کل انہیں باہر نکالنا پڑا مجھ
سے یہ لوگ چاہتے ہیں (ہنستے) کہ میں رحم کی اپیل ان کے سامنے کروں۔
اس کے لیے تو میری جوتی کی نوک بھی تیار نہیں ہے۔"

اب سیدھے ہم ایک ہی جست میں ۱۹۶۲ء میں آپہنچے ہیں۔

۲۲ ستمبر ۱۹۶۲ء کا واقعہ ہے کہ ٹھیک ایک بجے دوپہر فون پر ایک صاحب نے اپنے آپ کو بڑا سرکاری افسر ظاہر کرتے ہوئے مولانا کو اُن کے تازہ بیان کے اس فقرے پر متوجہ کر کے اس کی وضاحت چاہی کہ "اگر کنونشن لیگ کسی فرشتے کو بھی کھڑا کر دے تو اس کا ساتھ نہیں دیں گے۔" اور پھر کہا کہ آپ ایک معذرت لکھ دیں ورنہ حکومت کارروائی کرے گی۔ مولانا نے جواب دیا:

"میں اس طرح کا آدمی نہیں ہوں جو معذرت نامے لکھ لکھ کر دیا کرتا
ہو۔ میرے خلاف کسی کو جو کارروائی کرنا ہو کرتا رہے۔"

کارروائی یہ ہوئی کہ سالانہ اجتماع کے انعقاد میں جمہوریت کش طریقوں سے رکاوٹیں ڈالی گئیں اور پھر بھی جب اجتماع راوی روڈ کے ساتھ پون میل لمبی اجتماع گاہ میں منعقد ہو گیا تو غنڈوں سے حملہ کرا کے طنابیں کاٹ کر قناتیں گرائی گئیں قرآن مجید اُچھالے گئے۔ گولی چلا کر اللہ بخش نامی ایک کارکن کو شہید کر دیا گیا۔ جب یہ ہنگامہ گرم تھا۔ چودھری غلام محمد مرحوم اُٹھے اور مولانا سے کہا "مولانا بیٹھ جائیے۔"
جواب ملا:

"میں ہی اگر بیٹھ گیا تو کھڑا کون رہے گا۔"

پریس کانفرنس میں کسی نے احتجاج کی بات چھیڑی تو کہا:

"میں احتجاج کروں تو کس سے کروں؟"

تقریر میں رفقاء کے سامنے اللہ بخش شہید کی قربانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"یہ مقدمہ کہیں اور درج ہو چکا ہے اور ایسا فیصلہ ہو گا جس کا تصور
بھی یہ لوگ نہیں کر سکتے جو اللہ کی صفت انتقام کو بھول چکے ہیں۔"

اس موقع پر حریف قوت نے مولانا کے خلاف جھوٹے الزامات لگا کر گورخانہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا۔ اس سارے سحرِ سامری کو قولِ حق کی ایک ہی ضرب سے باطل کر دیا۔ فرمایا:

"میں کہیں خلا سے یکایک نہیں آگیا ہوں۔ اس سرزمین پر سالہا سال سے کام کر رہا ہوں۔ میرے کام سے لاکھوں آدمی براہِ راست واقف ہیں۔ میری تحریریں صرف اسی ملک میں نہیں، دُنیا کے ایک اچھے خاصے حصے میں پھیلی ہوئی ہیں اور میرے رب کی مجھ پر یہ عنایت ہے کہ اس نے میرے دامن کو داغوں سے محفوظ رکھا ہے۔ میرا منہ کالا کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اُٹھ کر دس بیس الزامات لگا دے اور مجھے روسیاہ بنا کر رکھ دے۔ خصوصاً وہ لوگ جن کا نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل، جنہیں اتفاقاتِ زمانہ چند روز کے لیے اُبھار لائے ہیں، یہ کھیل کھیل کر انشاء اللہ میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔"

اب دو چار متفرق باتیں:

۱۹۵۸ء میں مارشل لاء لگا تو سیاسی لحاظ سے سناٹا چھا گیا۔ ایک بڑے سرکاری افسران دنوں جاپان میں تھے۔ جاپان سے واپس آئے تو اُن سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے کہ مارشل لاء کے بعد مجھے جاپان میں صرف تین آدمیوں کی آواز سنائی دی۔ ایک جسٹس کیانی، دوسرے حمید نظامی، تیسرے مولانا مودودی۔

ستمبر ۶۵ء کے معرکے کا خاتمہ جنگ بندی کے اعلان پر ہوا تو قوم کے ولولوں پر اوس پڑ گئی۔ عوام کی روحِ جہاد کو متحرک رکھنے اور حکام کو سوچنے کی نئی راہ سجھانے کے لیے مولانا مودودی نے جنگ بندی کو نیا مفہوم ان الفاظ سے دیا کہ:

"قتال بند ہوا ہے، جہاد جاری ہے۔" یہ جملہ تو باقاعدہ شعری بحر میں ہے۔

پھر معاہدۂ تاشقند نے جب بچے کھچے کے دل کو مجروح کر دیا تو سمجھوتے کی میز پر معرکہ ہارنے والوں کو مولانا نے انتباہ دیا کہ:

"دبانے والوں کی اس دُنیا میں اگر آپ ایک بار دبتے ہیں تو یہ ایک دفعہ کا دبنا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد آپ اپنا وجود تک قائم نہیں رکھ سکتے"

اور یہ حکیمانہ تلقین:۔

"دنیا میں جنگ کوئی نہیں چاہتا ہے، لیکن جنگ سے زیادہ بُری چیز ایک اور ہے۔ ۔ اور وہ ہے ذلت کی زندگی"

جی چاہتا ہے کہ اُردو زبان وادب کی جو خدمت مولانا مودودی نے کی ہے اس کا کچھ ذکر ہو جاتا۔ مولانا نے بُنیادی طور پہ دلّی کی زبان کے فریم میں توحید سے لے کر نظریۂ ارتقا تک، احیائے دین کی تاریخ سے لے کر ہیگل، مارکس کے فلسفے تک، خلافتِ راشدہ کے تذکرے سے لے کر D.N.A (بنیادی حیاتی عناصر) کی بحثوں تک اور الجہاد فی الاسلام سے لے کر ضبطِ ولادت تک طرح طرح کے موضوعات پر جدید ترین اسالیب میں جو علمی و تحقیقی نگارشات قوم کو دی ہیں وہ ہماری کتابِ علم و فکر کے مستقل ابواب بن گئی ہیں۔ یہ نگارشات اپنے اندر اصطلاحات، تشبیہات اور تمثیلات کا نیا سرمایہ لیے ہوئے ہیں۔

مگر جب حال یہ ہو کہ کاغذ کے قحط نے علم وادب کے چمن اُجاڑ دیے ہوں اور اچھے اچھے جرائد کو جان کے لالے پڑے ہوں اور قلم کو وقت کے دربار میں فریادی بن کے پیش ہونے کے لیے پورا پیرہن بھی میسر نہ ہو تو پھر علم وادب کے تذکرے چھیڑ دینا بے تکی بات ہے جانے دیجیے۔

فی الوقت تو میری ساری توجہ اس خوش کُن اطلاع کی طرف پھر گئی ہے کہ مولانا مودودی دس ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے جلد ہی پاکستان آنے والے ہیں۔

اور میں تصوّر ہی تصوّر میں دیکھتا ہوں کہ جیسے مولانا کے سرزمین پاکستان پہ قدم رکھتے ہی ہماری تاریخ پوری ممنونیت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہہ رہی ہے کہ اے ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے نقیب! تجھ سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا جس نے جیتے جی یہ منظر دیکھ لیا کہ تیرے پیغام کے بیج چاروں طرف پھل پھول

کر ماحول کو خیابان خیاباں بنا رہے ہیں۔ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے ہوئے انسان اپنے ریزے سمیٹ سمیٹ کر از سرِ نو اُٹھ رہے ہیں۔ "تفہیم القرآن" مستقبل کے جہانِ افکار کو روشن کرنے والا سُورج بن چکی ہے۔ آج تیرے مخالفین بھی تیری ہی اصطلاحوں کی مدد سے مسائل کو سوچتے اور تیرے ہی فکری سانچوں کو استعمال کرتے ہیں۔ مغرب کی ملحدانہ تہذیب کے خلاف ملک کے لاکھوں شریف اور باشعور شہری تیرے برپا کردہ جہاد میں کسی نہ کسی حیثیت سے شریک ہیں، اور نئی نسلوں کے حلقے سے سرشار نوجوانوں کی ٹولیاں موج در موج اسلام کے محاذ پر آ رہی ہیں۔ ۔ ۔ اور تو حکمرانوں کے اس دَور میں سارے ملک کے لیے ایک سرچشمۂ اُمید ہے اور ایک علامتِ یقین افروز!

اس لمحے مولانا مودودی کے وہ الفاظ جو برسوں میرے ذہن میں رقصاں رہے ہیں حالات کے تاریک اُفق پر روشنی کی ایک لکیر بن کر اُبھر آئے ہیں:

"میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہو گا، لیکن جتنا مجھے کل سُورج کے طلوع ہونے کا یقین ہے، اتنا ہی اس بات کا یقین بھی ہے کہ یہ انقلاب بہرحال رونما ہو کر رہے گا۔"

# تعلیمی انقلاب

# کی

# منفرد آواز

کسی قوم کی حقیقی آزادی کا نقطۂ آغاز دراصل باہر کے مسلط کردہ نظریات و تصورات کے سلاسل و اغلال سے اس کے ایمان و فکر کا آزاد ہونا ہے۔ بیرونی سیاسی استیلا کے خاتمے اور کسی سامراج سے نجات پا لینے سے تو محض اس امر کا موقع پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کی سمت میں گامزن ہونے والی قوم خارجی مداخلت کے اندیشے سے فارغ ہو کر اپنے جہانِ افکار کو تعمیر کر سکے، اپنے قومی تشخص کو مخصوص تہذیبی خدوخال کے ساتھ تاریخی حوادث کے اس ملبے سے نکال کر اور گرد و غبار سے پاک کر کے از سرِ نو استوار کر سکے جس کے تودے کے تودے سامراجی یلغار کے نتیجے میں معاشرے کے ہر گوشے میں نمودار ہو جایا کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کو اللہ کے فضل و کرم سے برطانوی شہنشاہیت اور اس کے سائے میں پل پوس کر ہمیں دبوچ لینے کی تیاری کرنے والے برہمنی مہاجنی سامراج سے نجات پائے آج ۲۹ سال پورے ہو گئے ہیں لیکن افسوس کہ اب تک ہمارے معاشرے کے اُفق سے ایمان و فکر کا خورشیدِ زندگی افروز طلوع نہیں ہوا۔ ابھی ہم حقیقی آزادی کے اس نقطۂ آغاز تک پہنچنے کے لیے نت نئے راہزنوں کا دامن تھام کر خوف اور محرومیوں کی وادی میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔ ہماری ۲۹ سالہ داستانِ آزادی کتنی دکھ بھری ہے! اس مدت میں ہمارے سروں سے کبھی خون کی موجیں گزر گئیں اور کبھی آگ کی لہریں۔ یہاں تک کہ ہمارا نوتشکیل یافتہ وطن دولخت ہو کر رہ گیا۔

دراصل ایمان و فکر کو کسی بھی نقشے پر نشو و نما دینے میں کسی قوم کے نظامِ تعلیم کو بہت ہی مؤثر دخل حاصل ہوتا ہے۔ نظامِ تعلیم ہی نئی نسلوں کو کسی بلند نصب العین کی طرف پرواز کرنے کے لیے فکر و حکمت کے بال و پر دیتا ہے، مگر ہماری مصیبت

یہ ہوئی کہ ہم آزادی کے ۲۹ سال گزار کر بھی رخصت ہو جانے والی سامراجی قوت کے بنائے ہوئے اسی تعلیمی قفس میں گرفتار ہیں جس کی شان ہی یہی رہی ہے کہ وہ نہ بال و پَر اُگنے دیتا ہے اور نہ ذوقِ پرواز ہی سے اپنے پروردگان کو بہرہ مند ہونے دیتا ہے۔ یہ قفسِ تعلیم نہ جانے کیوں ایسی مقدس میراث قرار پاگیا ہے کہ اس میں اب تک معمولی قسم کے ردوبدل سے آگے بڑھ کر کسی حکمران قوت نے یہ سوچنے تک کی جرأت نہیں کی کہ اس قفس کو توڑ کر ملت کا ایک آزاد نشیمن وجود میں لایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم تعلیمی غلامی سے نجات پانے کے قابل نہیں ہو سکے۔

قومی زندگی میں نظامِ تعلیم کی وہی حیثیت ہے جو فرد کے لیے اس کے دماغ کی ہوتی ہے۔ اگر دماغ کسی ساحر کی ساحری اور کسی سامری کے طلسم کا شکار ہو جائے تو فرد کی ساری حرکات و سکنات اسی کی منشاء کے مطابق نمودار ہوں گی، خواہ وہ اپنی جگہ یہ سمجھتا رہے کہ وہ اپنی آزاد سوچ بچار سے ہر اقدام کر رہا ہے۔ اگر اس کے اپنے دینی، ملی اور خاندانی رجحانات کے خلاف متضاد قسم کے تہذیبی افکار و تصورات اس کے دماغ میں فاتحانہ شان سے گھس کر مستقل محاذ آرائی کی کیفیت پیدا کر دیں تو اس کے عقیدے اور اقدار ہر لمحہ ایک ایسی جنگ مسلسل سے دوچار رہیں گے جس میں روز اس کے اصول و روایات میں سے کچھ موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں اور کچھ زخمی اور اپاہج ہو کے رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پراگندگیٔ افکار اور ذہنی انتشار کے روگ سے کوئی بچاؤ نہیں۔ ایسے ہی تضادات کے غیر مختتم تصادم کی وجہ سے بسا اوقات دماغ بالکل ہی چل جاتا ہے اور پھر جسم و اعضا کی تمام حرکات لایعنی بلکہ تخریبی ہو کے رہ جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر ایک قوم کا نظامِ تعلیم فساد و اختلال کی کسی بھی خاص صورت کا شکار ہو جائے تو اس قوم کی تمام سیاسی معاشی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بگاڑ اور ضرر پیدا ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم جس نظامِ تعلیم سے دوچار ہیں وہ ہمارے قومی وجود اور تہذیبی

تشخص سے غیر ہم آہنگ اور ہر لحظہ برسر تصادم ہے۔ نتیجہ یہ کہ معاشرے کے کسی بھی شعبے کی کل سیدھی نہیں اور جو پہلے کچھ سیدھی تھی بھی، وہ بھی روز بروز ٹیڑھی ہوتی جا رہی ہے لیکن کارفرماؤں نے کبھی تعلیم کے بنیادی مسئلے پر صحیح طور پر توجہ ہی نہیں دی۔

ہماری متذکرہ بنیادی قومی کوتاہی کے نتائج بد کی فصل ہمارے چاروں طرف لہلہا رہی ہے۔ ذہنی بانجھ پن، لامقصدیت، جعل سازی، خیانت، ضمیر فروشی، ناشائستگی، قانون شکنی، بے ضابطگی، ہوس پرستی اور عیش پسندی کے روگ کتنے عام ہیں۔ اخلاقی کوڑھ میں اضافے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہر شخص کام کے بغیر یا قلیل وقت میں کم کام کر کے جلد سے جلد بہت کچھ حاصل کر لینے کے درپے ہے۔ انفرادی اور قومی آمدنیوں کی افزائش سے پہلے معیارِ زندگی کو اونچا کرتے چلے جانے کا ماحصل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ جائے۔ حد یہ ہے کہ لوگ قوم کو بے وقوف بنا کر اور قومی مفاد کو بیچ کر ذاتی زندگی کی جنتیں آراستہ کرتے ہیں۔ یہ خرابیٔ احوال تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس وجہ سے اس کی زیادہ تر ذمہ داری نظامِ تعلیم کے سر جاتی ہے۔ الغرض مدعا یہ ہے کہ مسئلۂ تعلیم کسی قوم کا بے حد اہم اور بالکل اوّلیں مسئلہ ہے اور اس پر توجہ نہ دی جائے تو سارا معاشرہ چوپٹ ہو کے رہ جاتا ہے۔

## مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے تعلیمی افکار پر تحقیقی کام

ہماری تاریخ میں اپنے وقت کے حالات کو ملحوظ رکھ کر سرسید ایک تعلیمی اسکیم لے کر اٹھے تھے، لیکن اس اسکیم کا جو وقتی مقصد تھا وہ اپنے اچھے اور برے پہلوؤں کے ساتھ حاصل ہو چکا اور اب دورِ آزادی میں ایک آزاد مسلم ریاست کے لیے وہ اسکیم ذرہ بھر کارآمد نہیں رہی۔

اس برصغیر میں آزادی ملنے سے کچھ عرصہ پہلے صحیح مسلم زاویۂ نگاہ سے پہلی بار

ایک مکمل تعلیمی انقلاب کی آواز اُٹھی۔ یہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی آواز تھی جو صرف آواز ہی نہیں اُٹھی، بلکہ آہستہ آہستہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ایک جامع حکمتِ تعلیم، اس پر عمل پیرا ہونے کی اسکیم اور اس کے لیے خاکۂ نصاب وغیرہ مسائل پر اتنا مواد ہمارے سامنے رکھ دیا کہ اگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور کوئی کام نہ کرتے تو یہی ایک کارنامہ اُنھیں ہماری تاریخ کی ایک عظیم شخصیت بنانے کے لیے کافی تھا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ماضی سے لے کر حال تک پھیلی ہوئی اس صفِ رجال میں سے ہیں جس کے ہر فرد کا سانحہ یہ ہے کہ اس کے سرچشمۂ علم سے استفادہ کرنے والے مخلصین کے مقابلے میں اس میں کیچڑ پھینکنے والوں کا انبوہ ہمیشہ کثیر التعداد رہا ہے۔ دراصل زمانہ ہر اس شخص سے انتقام لیتا ہے جو اس کے دھارے کا رخ بدلنے کی سعی کرے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے انقلابی سعی نہ صرف تعلیم کے دائرے میں کی بلکہ دینی شعور و حکمت کے دائرے میں اور دستور و قانون کے دائرے میں بھی پر زور طریق سے جاری رکھی۔ اتنے بڑے جرم کی کچھ تو پاداش ہونی چاہیے! مگر معاندین و حسود کے اُٹھائے ہوئے طوفانوں کے درمیان قوم کے ذہین عناصر آہستہ آہستہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے پیغام کے حسین خدوخال کو پہچاننے لگے اور ان کے افکار سے استفادہ کرنے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

## ہر نظامِ تعلیم کسی تہذیب کا خادم ہوتا ہے

سب سے پہلے ہمیں گذشتہ پچاس سال سے نشوونما پائی ہوئی تاریخ کی وسعتوں میں تعلیمی انقلاب کے داعی کی حیثیت کو متشخص کر لینا چاہیے۔ اس طرح ان کے افکار و اصطلاحات کو سمجھنا سہل تر ہو جائے گا۔

اصل میں مولانا مودودی مسلمانوں کے خلاف مغرب کی ملحدانہ و نفس پرستانہ تہذیب کی بڑھتی ہوئی فتوحات کے دور میں اُٹھے اور اُنھوں نے اس انسانیت کش

اور اسلام دشمن تہذیب کی مزاحمت کا مجاہدانہ عزم باندھا اور کچلی پسی ہوئی مسلمان قوم کے اندر سے بیدار دل، زندہ ضمیر اور محکم ایمان افراد کی بچی کھچی تعداد کو اپنی دردمندانہ پکار سے اٹھا کر ایک محاذ پر لا کھڑا کیا۔

کوئی شخص جو اپنی تہذیب کے احیا اور بیرونی تہذیب کی مزاحمت کے لیے اُٹھا ہو، وہ اگر نظام تعلیم کے مسئلے سے تعرض نہ کرے تو اس کا شعور کیسے قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا نے جہاں اعتقادی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی موضوعات کو نئے انداز سے چھیڑا، وہاں اُنھوں نے مروجہ نظامِ تعلیم کو اپنی شدید تنقید کا ہدف بنایا اور اسلامی حکمتِ تعلیم کے خطوط اچھی طرح اجاگر کیے۔ اس سلسلے میں بنیادی کام تو حصولِ آزادی اور تشکیلِ پاکستان سے پہلے ہی ہو چکا تھا، مگر پاکستان چونکہ ہماری مسلم اکثریت کی مملکت بنا اور اس کو اسلام کے نام پر استوار کیا گیا، اس وجہ سے تعلیم کی بحث کو مولانا مودودی نے اور بھی زور سے آگے بڑھایا، یہاں تک کہ اب اسلامی نظامِ تعلیم کا مکمل تصوّر ان کے آئینۂ افکار میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

متذکرہ سطور کی تائید میں میں مولانا مودودی کے چند الفاظ یہاں درج کر رہا ہوں جن سے صاف عیاں ہے کہ مسئلہ تعلیم کو مولانا تہذیبی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں:

> "ہر یونیورسٹی کسی کلچر کی خادم ہوتی ہے۔ ایسی مجرد تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت سے خالی ہو، نہ آج تک دنیا کی کسی درس گاہ میں دی گئی ہے نہ آج دی جا رہی ہے۔ ہر درس گاہ کی تعلیم ایک خاص رنگ اور ایک خاص صورت میں ہوتی ہے اور اس رنگ و صورت کا انتخاب پورے غور و فکر کے بعد اس مخصوص کلچر کی مناسبت سے کیا جاتا ہے جس کی خدمت وہ کرنا چاہتی ہے۔"

اس موضوع پر میرا موجودہ مطالعہ اتنا وسیع تو نہیں کہ میں حتمی طور پر دعویٰ کر سکوں کہ تعلیم کو ہمارے یہاں مولانا سے پہلے کسی شخص نے اس واضح سائنٹفک نظر سے نہیں دیکھا اور تعلیم اور تہذیب (یا کلچر) کے ربطِ باہم کو یوں نمایاں نہیں کیا۔ مگر

پھر بھی مولانا کا نقطۂ نظر بڑا مبہم سا ہے۔ کچھ اقتباس اور:

"ترقی، علم و تمدن کے موجبِ فلاح یا موجبِ ہلاکت ہونے کا تمام تر انحصار اس تہذیب پر ہے جس کے زیرِ اثر علوم و فنون اور تمدن و حضارت کا ارتقاء ہوتا ہے۔ ارتقاء کا راستہ انسانی مساعی کا مقصد اور حاصل شدہ قوتوں کا مصرف متعین کرنے والی چیز دراصل تہذیب ہے۔"

(تنقیحات۔ ص ۹۲)

"حقیقت میں تعلیم کا مسئلہ ایک مملکت کے بنیادی مسائل میں سے ہے ۔ ۔ ۔ اس کے سربراہ کاروں کو سب سے پہلے اس کی فکر ہونی چاہیے..." (تعلیمات۔ ص ۲۴)

"اب اگر ہم اپنی ایک کلچر رکھتے ہیں، ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کے اپنے کچھ عقائد ہیں، جس کا اپنا نظریۂ زندگی ہے، جس کا اپنا ایک نصب العین ہے، جو اپنی زندگی کے کچھ اصول رکھتی ہے تو لازماً ہمیں اپنی نئی نسلوں کو اس غرض کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ وہ ہماری اس کلچر کو نہ صرف یہ کہ زندہ رکھیں بلکہ آگے انہی بنیادوں پر اسے ترقی دیں جس پر ہماری یہ کلچر قائم ہے ۔ ۔ ۔ مجھے کوئی قوم ایسی معلوم نہیں جس نے اپنا نظامِ تعلیم خالص معروضی بنیادوں پر قائم کیا ہو اور اپنی نسلوں کو بے رنگ تعلیم دینے کی کوشش کی ہو۔ اسی طرح مجھے ایسی بھی کوئی قوم معلوم نہیں ہے جو دوسروں سے ان کا نظامِ تعلیم جوں کا توں لے لیتی ہو اور اپنی تہذیب کا کوئی رنگ اس میں شامل کیے بغیر اسی سانچے میں اپنی نئی نسلوں کو ڈھالتی چلی جاتی ہو۔" (تعلیمات۔ ص ۴۲، ۴۳)

مولانا مودودی نے "تعلیمات" میں وہ چار وجوہ بیان کیے ہیں جن کی بنا پر وہ "انقلابِ تعلیم" کو لازم گردانتے ہیں۔ یہاں ہم وجوہ درج نہیں کر رہے، بس واضح یہ کرنا مقصود ہے کہ انقلابِ تعلیم کی اصطلاح بھی خود موصوف کی وضع کردہ ہے اور ان کے تعلیمی افکار

میں اس اصطلاح کا مفہوم مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔

نہایت اہم گفتگو وہ ہے جو مولانا نے نظام تعلیم کی بحث میں اسلام اور سائنس کے باہمی تعلق کے بارے میں کی ہے۔ اس سے تعلیمی انقلاب کا وہ تصور اُدر اجاگر ہو جاتا ہے جس کے علمبردار مولانا مودودی ہیں۔ ملاحظہ ہو،

"بہت سے لوگ اس خیال کو سُن کر بڑے پریشان ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سائنس کا آخر اسلام سے کیا تعلق، حالانکہ ان کے سامنے روس کی مثال موجود ہے جو سوویٹ سائنس کا قائل ہے ۔۔۔۔ کوئی کمیونسٹ اپنے اشتراکی معاشرے کے افراد کو بورژوا سائنس اور بورژوا فلسفہ و تاریخ اور سیاسیات وغیرہ پڑھانا پسند نہیں کرتا۔ یہاں سب علوم کو مارکسزم کے رنگ میں رنگ کر پڑھاتا ہے، تاکہ اشتراکی سائنس دان اور اشتراکی ماہرین علوم پیدا ہوں۔ بورژوا نقطۂ نظر سے مرتب کیے ہوئے علوم کو پڑھا کر کوئی اشتراکی معاشرہ نہیں بن سکتا۔

یہ کہنا کہ سائنس تو ایک عالمگیر چیز ہے اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں، فی الواقع بڑی ناسمجھی کی بات ہے۔ سائنس میں ایک چیز تو ہے وہ حقائق (Facts) اور قوانینِ فطرت (Natural Laws) جو تجربے اور مشاہدے سے انسان کے علم میں آتے ہیں، یہ بلاشبہ عالمگیر ہیں۔ دوسری چیز ہے وہ ذہن جو ان حقائق اور معلومات کو مرتب کر کے ان پر نظریات قائم کرتا ہے اور وہ زبان جس میں وہ ان کو بیان کرتا ہے یہ چیز عالمگیر نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر تہذیب کے پیروؤں کا اسلوب الگ الگ ہے اور فطرتاً الگ ہونا چاہیے۔ ہم اس دوسری چیز کو بدلنا چاہتے ہیں نہ کہ پہلی چیز کو۔"

(تعلیمات۔ ص ۲۲۸، ۲۲۹)

سائنس کے دائرے میں تجربات و مشاہداتِ حواس کے ساتھ مفروضاتِ قیاس مل کر کام کرتے ہیں۔ سائنس کے ایک ایک ذرۂ حقیقت کے گرد بالعموم پورا ایک جہانِ مفروضات تعمیر ہو جاتا ہے اور اصطلاحِ عام میں یہ سب کچھ سائنس کہلاتا ہے۔ مولانا نے ایک مثال دے کر مدعا کو واضح تر کر دیا ہے۔

"مثال کے طور پر دیکھیے یہ ایک سائنٹفک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام دوسری چیزیں تو سرد ہو کر سکڑتی چلی جاتی ہیں مگر اس کے برعکس پانی جب سرد ہوتے ہوئے جمنے کے قریب پہنچتا ہے تو پھیل جاتا ہے اور برف بن کر ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے برف سطحِ آب پر تیرنے لگتی ہے۔ یہ ایک امرِ واقعہ ہے۔ اب ایک شخص اس چیز کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پانی کی یہ خاصیت ہے اور واقعتاً ایسا ہوا کرتا ہے۔ دوسرا شخص اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ خدا نے اپنی حکمت و ربوبیت سے پانی میں یہ خصوصیت اس لیے رکھی ہے کہ دریاؤں اور تالابوں اور سمندروں میں جاندار مخلوق باقی رہ سکے! ـــــ دیکھیے ایک ہی امرِ واقعہ کو دو شخص اپنے اپنے طرزِ فکر کے مطابق دو مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور ہر ایک کا بیان پڑھنے سے آدمی کے ذہن پر دو مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں ـــــ ایک طریقے سے اگر سائنس کو پڑھا جائے تو اس سے ایک مادہ پرست سائنس دان تیار ہو گا اور دوسرے طریقے سے وہی سائنس پڑھائی جائے تو ایک مسلمان سائنس دان تیار ہو جائے گا۔" (تعلیمات۔ ص ۲۲۹-۲۴۱)

مروجہ سائنس جن بنیادی تصورات پر کھڑی ہے ان سے زیادہ غیر عقلی تصور شاید ہی کوئی ہو کہ سائنس جہانِ مادی کے ایک ایک ذرے پر "قانون" کی کارفرمائی کا دعویٰ کرتی ہے، لیکن اتنے وسیع و بے پایاں عقلی قانونی نظام کے بارے میں وہ یہ رائے رکھتی ہے کہ اس سارے عقلی نظامِ قانون نے غیر عقلی "اتفاق" سے جنم لیا

ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جہاں قانون ہے وہاں تمہیں کسی حکیم و علیم قانون ساز کے وجود کو ماننا ہوگا اور قانون کے صحیح طور پر مسلسل چلتے رہنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قانون ساز قانون کو چلانے کیلئے قوت و اقتدار بھی رکھتا ہے، لیکن مادہ پرستوں کی مرتب کردہ سائنس کی اتنی بڑی عقلی حماقت کو نظام تعلیم کے واسطے سے ہم مسلمانوں نے بلاکسی رد وکد کے قبول کر لیا ہے۔

تعلیمی انقلاب کے داعی نے سائنس کی تعلیم کے بارے میں کلمۂ تکمیل کے طور پر کہا ہے کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو انسانوں کے دل میں ایمان کو گہری جڑوں سے راسخ کر دینے والا نہ ہو۔ فزکس، بیالوجی، فزیالوجی، اناٹومی، اسٹرانومی، غرض جس علم کو بھی آپ دیکھیں اس میں ایسے ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جو انسان کو پکا اور سچا مومن بنا دینے کے لیے کافی ہیں —— یہی وہ آیات ہیں جن کی طرف قرآن بار بار توجہ دلاتا ہے، مگر صرف اس وجہ سے کہ کافر سائنس دان نے ان حقائق کو اپنے نقطۂ نظر سے مرتب اور بیان کیا ہے، ان کو پڑھ کر آدمی اُلٹا مادہ پرست اور ملحد بنتا ہے اور خدا کے تصور پر ہنستا اور اس کا مذاق اڑاتا ہے —— ہم بے خدا سائنس اور بے خدا فلسفہ اور اجتماعی علوم پڑھا کر خدا پرست انسان تیار نہیں کر سکتے۔" (تعلیمات ص ۲۴۱)

زیر تحقیق انقلابی نظریۂ تعلیم اسلامی فکر کو پورے مضامین و نصابات پر جس طرح غالب و مسلط کر دینا چاہتا ہے اس کا اندازہ سائنس کے متعلق مذکورہ اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

## نظام تعلیم اور مسئلہ قیادت و امامت

مولانا مودودی نے ستمبر ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا کہ "دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے

جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے۔" (تنقیحات۔ص ۲۳)

جنوری ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں انجمن اتحادِ طلبہ کے سامنے جو خطبہ مولانا نے پڑھا، اس میں فرمایا کہ "امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا" (تعلیمات۔ص ۱۶۸)

دنیائے انسانیت کی امامت یا قیادت (Leadership) کے اسی تصور کی بنا پر اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ مرتب کرتے ہوئے مولانا نے مقصدِ تعلیم یہ قرار دیا کہ "وہ ایسے صالح علماء تیار کرے جو اس دورِ جدید میں ٹھیک ٹھیک دینِ حق کے مطابق دنیا کی رہنمائی کرنے کے قابل ہوں" (تعلیمات ص ۱۶۸)

اگر میں یہ کہوں تو شاید بات غلط نہ ہو گی کہ تعلیم و امامت کے اسی تعلق کی بنا پر ۱۹۴۴ء میں دارالاسلام پٹھان کوٹ کی مجلس تعلیمی کے سامنے مولانا نے صراحت سے کہا تھا کہ،

"اس وقت ہمارے ملک میں جتنے نظام ہائے تعلیم رائج ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس مقصد کے لیے آدمی تیار نہیں کرتا جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ..... ہمیں صرف یہی نہیں کرنا ہے کہ نوخیز نسلوں کی علمی اور ذہنی تربیت کا انتظام اپنے نصب العین کے مطابق کریں بلکہ اس کے ساتھ ان کی اخلاقی اور عملی تربیت کا بندوبست بھی کرنا ہے۔" (تعلیمات۔ص ۱۰۴)

یہاں بات اصل تصور سے کسی قدر محدود شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس کی وجہ بھی سن لیجیے۔

"اس وقت ہم کسی ملک کے انتظام کا چارج نہیں لے رہے ہیں کہ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں ان ضرورتوں کے لیے آدمی تیار کرنے ہوں جو ایک ملک کے تمدن کی پوری مشینری کو چلانے میں پیش آتی ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف ایک کام ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اخلاقی، فکری اور عمرانی انقلاب برپا کرنے کے لیے موزوں لیڈر اور

کارکن تیار کریں۔"

(تعلیمات - ص ۵-۱)

بہرحال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جس انقلابی دعوتِ تعلیم کو لے کر اٹھے ہیں، اس کی رو سے علم و تعلیم اور امامت و قیادت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو قوم تعلیم اور علم و تحقیق میں آگے بڑھتی ہے، وہی دوسروں کے لیے پیش رو بنتی ہے اور اسی کی تقلید کی جانے لگتی ہے۔ علم اسے اس فکری و ذہنی استیلا اور سیاسی و اقتصادی فوقیت کا راستہ بنا کے دیتا ہے۔

اس خاص بحث کے لیے تنقیحات (از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی) کے بیشتر مضامین خصوصاً اس کے پہلے مقالے "ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب" سے بہت مفید مواد اخذ کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم اور امامت کے تعلق کو سامنے رکھ کر نظامِ تعلیم پر سوچنے کے لحاظ سے بھی مولانا بڑی حد تک منفرد مقام رکھتے ہیں اور پھر اس تعلق کی وضاحت بھی انھوں نے اپنی تحریروں میں بڑے زورِ بیان سے کی ہے۔

"علم برائے امامتِ عالم" کے اس نظریے کے فریم میں تعلیم کے متعلق ان کا انقلابی فکر نصب ہوا ہے اور اس کلیے کی روشنی میں ان کے مختصر سے اس فقرے کا مدعا سمجھ میں آ سکتا ہے کہ:

"اسلام میں ایک نشأۃ جدید (Rennaissance) کی ضرورت ہے۔"

کیوں کہ:

"پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا . . . علم و عمل کے میدان میں وہی رہنمائی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے، نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و انکشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جس پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہے۔" (تنقیحات۔ ص ۲۲، ۲۳)

اتنا بڑا معرکہ ہے مولانا کے سامنے وہ عالمگیر تسلط رکھنے والی مغربی تہذیب کی عمارت کی بنیادیں ڈھادینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے علم و تحقیق اور نظامِ تعلیم کی قوت کو بروئے عمل لانا چاہتے ہیں۔

## مسلم تعلیم گاہوں کا ناقدانہ جائزہ

مولانا مودودی کے انقلابی فکر کو سمجھنے میں ہمیں وہ تنقیدی تحریریں بہت مدد دیتی ہیں جو جدید اور قدیم ہر دو قسم کی قائم شدہ مسلم تعلیم گاہوں کی اسکیموں کے اساسی تصورات کا احتساب کرتی ہیں۔ کسی ڈھانچے کے اندر جامد ذہن کے لوگ تو سکون سے چلتی رو میں بہتے رہتے ہیں اور کسی ڈھانچے کے اندر بعض پسندیدہ اجزاء دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ مصلحین ہوتے ہیں جو اساسیات کو چھیڑے بغیر تفصیل مظاہر میں دو چار تبدیلیوں کے لیے کوشش کرتے ہیں، لیکن انقلابی ذہن کا آدمی اساسیات اور ڈھانچے کی مجموعی حیثیت کی غلط ساخت پر گرفت کرتا ہے اور اس میں تبدیلی کی دعوت دیتا ہے۔ جدید و قدیم دونوں قسم کی مسلم تعلیم گاہوں اور ان کی تعلیمی اسکیموں پر مولانا مودودی نے اسی حیثیت سے ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام جن امنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ کیا گیا تھا، ان کے لحاظ سے دیکھیں تو یہ تعلیمی مرکز بڑی تاریخی اہمیت کا حامل تھا اور اس کے داعیٔ اوّل سرسید احمد خاں کے حصے میں یہ کریڈٹ ضرور جاتا ہے کہ وہ مسلم قوم کے ایک خوفناک دورِ شکست میں فکری لیڈر بن کر ابھرے اور ڈوبتی قوم کو بچانے کے لیے جو کچھ بھی ان کی سمجھ میں آیا اس کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ان کی مساعی کی قیمت وقتی اور فوری بلکہ اضطراری تدبیر کے لحاظ سے جو ہے سو ہے مگر ان کی اسکیم نے آگے چل کر کچھ اچھے نتائج کے ساتھ جو بہت سے برے نتائج پیدا کیے ان کا احساس خود سرسید احمد خاں کو بھی ہو گیا تھا۔ مگر اب جو دریا بہہ نکلا تھا اس کا رخ بدلنا ان کے بس میں نہ تھا اور نہ ان کے بعد مضطرب ہو کر اصلاحات کرنے والے کوئی مؤثر اقدام

کر سکے۔ خرابی خود اسکیم کے اندر ایسی تھی کہ اس کے سانچے میں ڈھل کر مسلم تہذیب کی علمبرداری کرنے والے اور مغربی تہذیب کے مقاصد کا مقابلہ کرنے والے دل و دماغ پیدا نہ ہو سکتے تھے۔ وہ صرف ابتدائی دور تھا جس کے جذباتی ماحول میں چند قابلِ قدر نمایاں شخصیتیں اُبھریں۔ اس کے بعد مسلم قوم پرستوں سے لے کر ملحدوں اور کمیونسٹوں تک کی کھیپیں تیار ہونے لگیں "مسلم بلا اسلام" یا "افرنگ پرست مسلم" کا نیا کردار بھی اس "اسلامی" ادارے نے ڈھالنا شروع کر دیا۔ اور یہ کردار مسلمانوں کے پیشرو طبقوں میں آج بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے اور اس کے کارناموں کے برگ و بار زندگی کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ مولانا کا مطالعۂ احوال یہ تھا کہ یہ سب کچھ اتفاقی حادثے کے طور پر نہیں ہو رہا بلکہ علی گڑھ کی تعلیمی اسکیم سے اسی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

## علی گڑھ کا نظامِ تعلیم

آیئے خود مولانا کے الفاظ کے آئینے میں حقیقت کا انعکاس دیکھیں:

"۔۔۔ علی گڑھ سے جو تعلیمی تحریک اُٹھی تھی اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دَور کی ضرورت کے لحاظ سے اپنی دنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں۔۔۔ اس وقت اس سے زیادہ کچھ کرنے کا شاید موقع نہ تھا۔ اس وقت اتنی مہلت نہ تھی کہ غور و تفکر کے بعد کوئی ایسی محکم تعلیمی پالیسی متعین کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی۔

۔۔۔ مسلمانوں کو اس طرزِ تعلیم کی طرف دھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا اور خطرات سے بچنے کے لیے کچھ تھوڑا سا عنصر اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ کوئی مناسبت نہ تھی۔۔۔ اس تحریک نے ہماری دنیا تو ضرور بنا دی مگر جتنی دنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا۔۔۔ اس نے ہم میں کالے

فرنگی پیدا کیے ...... اس نے ہماری قوم کے طبقہ علیا اور طبقہ متوسط کو جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں، باطنی اور ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ صرف اتنے معاوضے پر کہ چند عہدے، چند خطاب، چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں۔ ۔ ۔ سوال یہ ہے کہ کیا اب دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی ہونی چاہیے۔ اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہے تو اس کے لیے علی گڑھ کی کوئی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ ہندوستان کے ہر بڑے مقام پر ایک علی گڑھ موجود ہے۔" (تعلیمات۔ ص ۱۸، ۱۹)

اس تعلیمی پالیسی میں خرابی کی وجہ کیا ہے اس پر مولانا کی رائے سنیے :

" ۔ ۔ ۔ آپ ان کو (یعنی نئی نسلوں کو) وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصولِ عمران سے یکسر مختلف ہے ۔ ۔ ۔ اس کے بعد کس بنا پر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی، ان کی سیرت اسلامی سیرت ہوگی، ان کی زندگی اسلامی زندگی ہوگی؟ قدیم طرز پر قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے ۔ ۔ ۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے فرنگی سٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لیے لگا دیے جائیں، مگر ان بادبانوں سے فرنگی سٹیمر قیامت تک اسلامی سٹیمر نہ بنے گا۔" (تعلیمات۔ ص ۱۹، ۲۰)

مزید چند سطور :۔

"اس وقت مسلم یونیورسٹی میں جو طریقِ تعلیم رائج ہے، وہ تعلیمِ جدید اور

اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں۔ ۔ ۔ یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلبہ کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔" (تعلیمات۔ ص ۲۵)

"میری نظر میں مسلم یونیورسٹی کی دینی و دنیاوی تعلیم بہ حیثیت مجموعی بالکل وہی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سرتاپا غیر مسلم بناتے ہیں پھر اس کی بغل میں دینیات کی چند کتابوں کا ایک بستہ دے دیتے ہیں۔ ۔ ۔ اگر آپ ان حالات اور اس طرز تعلیم کو بعینہٖ جاری رکھیں۔ ۔ ۔ تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ فرنگیت اور اسلامیات کی کشمکش زیادہ شدید ہو جائے گی اور ہر طالب علم کا دماغ ایک رزم گاہ بن جائے گا۔" (تعلیمات۔ ص ۲۷، ۲۸)

## ندوہ کا نظام تعلیم

۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے اس تعلیمی ادارے کی اسکیم پر بھی ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ فرمایا:

"لوگ اس گمان میں ہیں کہ پرانی تعلیم میں خرابی صرف اتنی ہے کہ نصاب بہت پرانا ہو گیا ہے اور اس میں بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے اور جدید زمانہ کے بعض علوم اس میں شامل نہیں۔ اس لیے اصلاح کی ساری بحث اس حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے دوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے۔ ۔ ۔ اور بہت زیادہ روشن خیالی پر جو لوگ اتر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کو میٹرک تک انگریزی پڑھا کر نکالو تاکہ کم از کم تار پڑھنے اور لکھنے کے قابل تو ہو جائے۔ ۔ ۔ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ کامیاب قسم کے مولوی پیدا ہو

جائیں جو کچھ جرمنی اور امریکہ کی باتیں بھی کرنے لگیں۔ اس ذرا سی اصلاح کا نتیجہ یہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ دنیا کی امامت و قیادت کی باگیں علماء اسلام کے ہاتھ میں آجائیں۔" (تعلیمات۔ ص ۶۶، ۶۷)

مولانا کے نزدیک اس تعلیم کا متوقع ماحصل بس یہ ہے کہ:

"آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی، بڑھیا قسم کے مقتدی بن جائیں، امامت بہر حال آپ کو نہیں مل سکتی۔ اس وقت تک جتنی اصلاحی تجاویز میری نظر سے گزری ہیں وہ سب کی سب بہتر مقتدی بنانے والی ہیں، امام بنانے والی کوئی تجویز ابھی تک سوچی نہیں گئی۔" (تعلیمات۔ ص ۷۲)

## عام قسم کے اسلامی کالج

انگریزی نظام تعلیم پر کام کرنے کے لیے جو اسلامی کالج قائم ہوتے رہے ان پر مولانا کی تنقید نسبتاً زیادہ سخت انداز میں سامنے آتی ہے اور اس تنقید میں ان کا ذوقِ انقلابیت خوب نمایاں ہے۔ ایک ایسے ہی کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد کا جو زلزلہ افگن خطبہ مولانا نے دیا اس کے چند جملے پیش ہیں:

"دراصل میں آپ کی اس مادرِ علمی کو اور مخصوص طور پر اسی کو نہیں بلکہ ایسی تمام مادرانِ تعلیم کو درس گاہ کے بجائے قتل گاہ سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک آپ فی الواقع یہاں قتل کیے جاتے رہے ہیں اور یہ ڈگریاں جو آپ کو ملنے والی ہیں یہ دراصل موت کے صداقت نامے (Death Certificate) ہیں جو قاتل کی طرف سے آپ کو اس وقت دیے جا رہے ہیں جب کہ وہ اپنی حد تک اس بات کا اطمینان کر چکا ہے کہ اس نے آپ کی گردن کا تسمہ تک لگا رہنے نہیں دیا ہے۔ ۔ ۔ میری مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے بھائی بندوں کا قتلِ عام ہو چکنے کے بعد لاشوں کے ڈھیر میں یہ ڈھونڈتا پھرتا ہو کہ کہاں کوئی سخت جان بسمل

ابھی سانس لے رہا ہے۔"  (تعلیمات ـ ص ۵۲، ۵۴)

"ہر قوم کے بچے دراصل اس کے مستقبل کا محضر ہوتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے یہ محضر ایک سادہ لوح کی شکل میں آتا ہے اور قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ لکھے۔ ہم وہ دیوالیہ قوم ہیں جو اس محضر پر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود لکھنے کے بجائے اسے دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ اس پر جو چاہیں ثبت کر دیں، خواہ وہ ہماری اپنی موت ہی کا فتویٰ کیوں نہ ہو۔"

(تعلیمات ـ ص ۵۸)

اس نظامِ تعلیم کا یہ مایوس کن پہلو ہے کہ وہ کوئی مقصد طلبہ کو نہیں دیتا اس کی طرف مولانا نے خصوصی توجہ دی ہے:

"مجھے بکثرت ایسے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جو اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں، یا تازہ تازہ فارغ ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ مگر میری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب میں دیکھتا ہوں کہ مشکل سے ہزاروں میں کوئی ایک ایسا ملتا ہے جو اپنے سامنے زندگی کا مقصد رکھتا ہو۔ ۔ ۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظامِ تعلیم کو کس نام سے یاد کروں جو پندرہ بیس سال کی مسلسل دماغی تربیت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا کوئی مقصود متعین کر سکے۔ ۔ ۔ یہ انسانیت کو بنانے والی تعلیم ہے یا اس کو قتل کرنے والی؟"  (تعلیمات ـ ص ۵۹، ۶۰)

اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے:

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں ملتِ اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس

ملّت کی پیشوائی کے لیے نہیں بلکہ غارت گری کے لیے تیار کرتا ہے۔"
(تعلیمات۔ ص ۶۲)

## مثبت دعوت

مولانا مودودی نے ایک صحیح اسلامی نظامِ تعلیم کے سلسلے میں متعدد اہم چیزیں تحریر کی ہیں، ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ یہاں اجمال سے ان کا مرکزی نقطۂ نظر عرض کیا جاتا ہے۔

"۔ ۔ ۔ اگر فی الواقع ہم ایک اسلامی نظامِ تعلیم قائم کرنا چاہتے ہیں تو محض مرثیتیں اور داغ دوزیاں کرنے سے کام نہیں چل سکتا بلکہ اس کے لیے ایک انقلابی قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے۔

درحقیقت اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ وہ دونوں نظامِ تعلیم ختم کر دیے جائیں جو اب تک ہمارے ہاں رائج رہے ہیں۔ پرانا مذہبی نظامِ تعلیم بھی ختم کیا جائے اور یہ موجودہ نظامِ تعلیم بھی جو انگریز کی رہنمائی میں قائم ہوا تھا۔ ان دونوں کی جگہ ہمیں ایک نیا نظامِ تعلیم بنانا چاہیے جو ان کے نقائص سے پاک ہو اور ہماری ان ضرورتوں کو پورا کر سکے جو ہمیں ایک مسلمان قوم، ایک آزاد قوم اور ایک ترقی کی خواہش مند قوم کی حیثیت سے اس وقت لاحق ہیں۔"
(تعلیمات۔ ص ۵۸)

انقلابِ تعلیم کا یہ پیغام دیتے ہوئے مولانا نے ایک سے زیادہ مقالات میں مطلوبہ اسلامی نظامِ تعلیم کا خاکہ اور اس کے اساسی اصول واضح کیے ہیں۔ مزید تفاصیل کوئی دیکھنا چاہے تو اصل مقالات و مباحث میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

# لسانی و ادبی خدمات

اُردو زبان کی خوبیٔ قسمت کہ اسے مودودیؒ جیسا قلم راں ملا جس کے گرد ہم خیالوں کی سلطنتِ محبت جتنی جتنی وسیع ہوتی گئی، اُردو کے جھنڈے بھی اسی قدر دُور دُور تک گڑتے چلے گئے۔

عجیب بات یہ ہے کہ اگر ہم اُردو کی پچھلی ساری تاریخ کو دیکھیں تو دینی تحریکوں، مذہبی اکابر اور روحانی شخصیتوں نے اس کے فروغ میں اتنا زیادہ حصہ لیا ہے کہ اب اربابِ الحاد اور فریفتگانِ مادیت جب اسے اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کرتے ہیں تو یہ کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے کسی مسجد کی اینٹیں اکھیڑ اکھیڑ کر کچھ تیز طرار لوگ میخانہ تعمیر کر رہے ہوں۔ اُردو کا خزانہ جمع کرنے میں تو اسلامی ذہنوں کا حصہ ہے لیکن آج یہ خزانہ ایسے لکھ لٹوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے جن کا بس چلے تو اسلام کے لفظ کو گالی بنا دیں۔

پچھلے قریبی دَور میں دیکھیں تو تحریکِ خلافت نے اُردو زبان کے دامن میں بے شمار اہلِ قلم کے واسطے سے بہت کچھ ڈالا۔ تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان نے کتابوں اور مقالات، شاعری اور تقاریر کے واسطوں سے اُردو کو نوازا۔ تحریکِ مجاہدین نے نہ صرف اپنے عہد میں ہمارے کلاسیکل اساتذۂ سخن کے کلام اور اس دور کی اُردو صحافت میں نفوذ کیا بلکہ آج درجن بھر کتابیں ہماری تاریخ کے اس طوفانِ ساحل شکن پر موجود ہیں۔ تحریکِ ختمِ نبوت کے لیے جو اثباتی کام ہوا اور قادیانیت کے خلاف ہزارہا قلموں اور زبانوں کی جنبشوں سے معانی کے جو زیور ہائے اُردو کے لیے تیار ہوئے، لسانی صیرفیوں کا کام ہے کہ ان کے وزن اور قیمت کا اندازہ کریں۔ پاکستان کے بننے پر، اور پاکستان میں تحریکِ اسلامی یا تحریکِ دستورِ اسلامی کے اُٹھنے پر خاصا بڑا کام ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں جب قومی آزمائش کا زمانہ آیا تو الحاد اور سیکولرازم اور فحاشی کے تمام رجحانات ادب سے غائب ہوگئے اور سازِ سخن سے جہاد و شہادت کے نغمے اُبلنے لگے۔ ۱۹۷۰ء میں سوشلزم اور پھر اسلامی سوشلزم کے فکری تموج کے خلاف

اُردو میں قرآن و محمدؐ سے محبت کرنے والوں نے بھی طوفانی لہریں اُٹھائیں۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کا ایک ٹکڑا الگ ہونے کا حشر انگیز سانحہ پیش آیا تو اس کے نتیجے میں صدیق سالک اور مسعود مفتی کے دائیں بائیں اور بھی سینکڑوں افراد تھے جنھوں نے کتابوں، ڈائجسٹوں اور اخباروں میں اپنے خونِ دل کے قطروں کو موتیوں میں بدل کر اُردو کے قدموں میں نچھاور کیا۔ آزمائشیں اور مصیبتیں جب کبھی آئیں اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جب بھی تحریکیں اُٹھیں تو ہمارے آزاد طبقوں کے اندر سے بھی یہ شعور مدفون اُبھر آیا کہ تم مسلمان ہو۔ تفسیرِ قرآن اور سیرتِ رسولؐ اور تاریخِ ملتِ اسلامیہ اور اسلاف کی سوانح اور فقہی احکام سے مالا مال اُردو زبان اسلام کی کرامات اور عنایات سے فیض یافتہ ہے۔ اس زبان کا حق آتا ہے کہ جو شخص بھی اسلام کی بات کرنے کے لیے اُٹھے وہ اُردو کے ساتھ لُطف و احسان کا معاملہ کرے۔ اور سید مودودی نے اُردو کا حق ادا کیا اور اس زبان کے سامنے ہزارہا صفحوں کی کتابوں کا ایک گلدستۂ عظیم بنا کر پیش کیا۔

یاد آیا کہ پٹھانکوٹ کے زمانے میں اپنے پیشرو قمر الدین خاں کے چلے جانے کے بعد علمی اور تحریکی مباحث سے متعلق مولانا مودودی کے روز بروز بڑھتے ہوئے خطوط کے جواب ارسال کرنا میرے ذمہ تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ ہر دوسرے تیسرے دن جب مولانا کو وقت ملتا تو وہ مجھ کو بلا لیتے اور جواب املا کرا دیتے۔ کئی خطوط ایسے ہوتے کہ جونہی فرستندہ کا نام سامنے آتا خط کو پڑھوائے بغیر اپنی یادداشت سے مولانا اس کا جواب لکھواتے۔ کبھی خط کا مضمون میں پڑھ دیتا اور پھر اس میں شامل مختلف سوالات کے جوابات نمبر وار لکھواتے جاتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ خود ہی فرماتے کہ فلاں صاحب کا خط نکال لیں (واضح رہے کہ مولانا ہمیشہ صیغہ جمع مخاطب میں بات کرتے تھے، یعنی "نکال لیں" وغیرہ) بعض سرسری خطوط کے متعلق اجمالاً جواب مجھے بتا کر کہہ دیتے کہ خود لکھ لینا۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ کسی خط کو پڑھتے ہوئے میں نے لفظ ادا کیا "کترنا"۔ مولانا نے فرمایا "کُترنا نہیں کَترنا"۔ اس پر میں نے پوچھا کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ منہ سے اگر کسی پھل یا اس کے چھلکے کو کاٹ دیں یا چوہے کسی کاغذ یا کتاب کو یا ٹڈیاں کسی

بزرگ کو تو ایسے موقعوں پر کترنا بولتے ہیں، لیکن جب قینچی وغیرہ سے کاغذ یا کپڑے کو آدمی کاٹے یا کھیل کے لیے چھوٹے بچے تو ایسی صورتوں میں کترنا کہتے ہیں۔

اس ذرا سی بات کو جو حافظے میں محفوظ ہے، میں نے اس لیے بیان کیا کہ سوال صرف اُردو زبان ہی کا نہ تھا بلکہ صحیح زبان کا بھی تھا۔ مولانا بہت صحیح زبان لکھتے اور بولتے تھے۔

مولانا مودودیؒ کی زبان کے ابتدائی سرچشمے "دلی اور دکن" کی خاص فضا میں تھے، پھر گھرانا ایسا تھا، خصوصاً مولانا کے والدین اور دیگر بزرگ، کہ جس نے زبان کی شستگی و رفتگی کا تحفظ کیا۔ مولانا ابوالخیر مودودی تو آخر دم تک مولانا کے قریب رہے اور ان کی زبان تو اور بھی زیادہ معطر و مصفا تھی بلکہ وہ کبھی کبھی اپنے خاص انداز کے قولِ قاطع سے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ابوالاعلیٰ نے تو اپنی زبان خراب کر لی ہے۔ زبان و ادب سے متعلق بھی معروف لوگوں سے ابتدائی عمر میں مولانا نے کسی حد تک استفادہ کیا۔ ان میں مولانا ابوالکلام بھی تھے۔ جوش ملیح آبادی اور نیاز فتح پوری بھی تھے اور خاص طور پر مولانا محمد علی جوہر تھے۔ اقبال کا اثر بھی خاصا تھا مگر یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب آتش جوان نہیں تھا۔ وہ جب جوان ہو کر میدان میں اترا تو اپنی الگ ایک خاص زبان ساتھ لے کر آیا۔ مولانا مودودی کی زبان کے پودے پر جو پہلا پھل کھلا وہ "الجہاد فی الاسلام" کے نام سے موسوم ہے۔ "الجہاد فی الاسلام" میں تحقیقی رجحان زیادہ ہے مگر لوگوں کو اپیل کرنے والی ادبی زبان بھی اچھے خاصے زور سے آئی ہے۔ وہ اگر تحقیقی کام سنگلاخ قسم کا ہوتا تو مولانا مودودیؒ وہ کچھ نہ ہوتے جیسے کہ وہ بنے۔ یہاں ایک دوراہا تھا۔ امکان یہ بھی تھا کہ مولانا مودودی ایوانِ تحقیق میں بیٹھ کر ٹھوس علمی کام کرنے میں لگ جاتے، مگر قدرت نے اُن کو دوسرے راستے پر ڈالا۔ اُنھوں نے ترجمان القرآن کو حاصل کر کے اس میں بڑے جذبۂ بے تاب کے ساتھ مسلمانوں کو آنے والے خطرناک گردابوں سے بچانے کے لیے آواز اٹھائی۔

کام آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک خاص زبان کی نشوونما ہوتی گئی۔ کوئی بھی مسلمان جو دعوتِ حق کا کام وسعتِ شعور و مطالعہ کے ساتھ کرتا ہے اس کے ذہن پر الہامی زبان گہرا اثر ڈالتی ہے۔ میرے نظریے کے مطابق انسانی ادب کا آغاز انبیاء کی الہامی تعلیمات و تلقینات

سے ہو۔ الہامی ادب پاروں میں اتنی جان ہے کہ اگر کوئی قدیم ترین عبارت بھی اپنی اصلی شکل میں
سامنے آتی ہے تو آج بھی اس کی ادبیت کی تر و تازگی میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا۔ پھر قرآن
تو ادب الہامی کا وہ آخری گلدستہ ہے کہ جس کی ادبیت فصحائے عرب کے لیے چیلنج بن کر آئی اور
بڑے نامورلسان اور خطیب، شاعر اور فن کار گنگ ہو کر رہ گئے۔ عظمت خداوندی کا بیان، آیاتِ
کائنات کا تذکرہ، بندوں کے جذبۂ عبودیت کا اظہار، ذکر و دُعا کا درد بھرا اسلوب۔ عزم و صبر
کے جذباتِ عالیہ کی عکاسی، رزمِ خیر و شر کے احوال، نیکی کی طرف بلانے کے لیے پکار اور بدی
سے بچنے کے لیے انتباہ، دُنیا کی لذت اور مفاد کا عارضی امتحانی ہونا، آخرت میں اعمال کی بازپرس،
یہ سب ایسے موضوعات ہیں کہ ان کو بیان کرنے سے خوب صورت، پُرجوش اور پاکیزہ ادب نمودار
ہوتا ہے۔ اس لیے پیغمبروں کی ایک جداگانہ زبان ہوتی ہے، جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ میری زبان ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی زبان ہے۔

اس زبان کو جب مودودیؒ صاحب نے اُردو ادب کے مخصوص اسالیب کو ملحوظ رکھ کر
جدید ذہنی ماحول کے شعور کے ساتھ برتا تو ان کی اپنی انفرادی زبان اُبھرنے لگی۔ جو شخص ایک
طرف علمی و تحقیقی دنیا کا آدمی ہو اور دوسری طرف اسے عوام میں کام کرنا ہو، یعنی اسے زہد و تقشف
کے گنبد میں معتکفِ خلوت نہ رہنا ہو بلکہ ہجوم میں آکر لوگوں کو ایک جہاد کے لیے ساتھ لینا
ہو وہ پُرشکوہ علمی زبان کو کیسے اختیار کر سکتا ہے۔ پس مولانا نے معناً پُرشکوہ اور لفظاً سلیس و
سادہ طرزِ بیان اختیار کیا۔ اُنھوں نے بھاری بھرکم مطالب بیان کیے مگر اُنھیں بالکل عام فہم
بنا دیا۔ وہ اسٹیج پر آتے تو ٹھہر ٹھہر کر بولتے، مسئلے کا تجزیہ کرتے، سوالات اٹھاتے، جواب دیتے
اور حقائق کی کڑیاں اس طرح نمبروار بیان کرتے اور جملے ایسے رواں بولتے کہ معلوم ہوتا ساری
تقریر لکھ کر سامنے رکھی ہوئی ہے۔ ان کی تقریر کا انداز معلمانہ ہوتا تھا جیسے جلسہ گاہ کلاس روم ہو
اور پروفیسر یا ٹیچر اپنے عزیز طلبہ کو کوئی مضمون سمجھا رہا ہو۔ مولانا مودودیؒ کی زبان کا ایک نمونہ
الجہاد فی الاسلام میں ہے لیکن اس کے بالمقابل ان کے دورِ دعوت کی تحریروں مثلاً رسالہ دینیات،
خطبات، سلامتی کا راستہ، حیات بعد الموت کو ملاحظہ فرمائیے۔ پھر ادق موضوعات پر ان کی نگارشات
دیکھیے۔ مثلاً سود، پردہ، حقوق الزوجین، خلافت و ملوکیت، ضبطِ ولادت، اشتراکیت، دستوری

مباحث پر لٹریچر پڑھ کر آدمی حیران ہو جاتا ہے کہ بعض بھاری بھرکم مباحث کو کس طرح اس شخص نے عام فہم بنا دیا۔ دورِ آخر میں تفہیم القرآن کا رنگ دیکھئے۔ اس کو لکھنے کا محرک یہ تھا کہ پٹھانکوٹ میں مقامی حضرات اور باہر سے آنے والے مہمان مولانا مودودی کا درس عام فہم سلیس زبان میں سنتے، نہ ترجمے میں لفظوں کا الٹ پھیر ہوتا نہ تشریح اور توضیح میں گرامر اور بلاغت اور منطق اور فقہ کی الجھی الجھی بحثیں، تو آہستہ آہستہ یہ مطالبہ ابھرتا گیا کہ مولانا اپنے درس کے طرز پر تفسیر قرآن لکھیں۔ مولانا اس پر تیار ہو گئے۔ اور آج ایک ایسی تفسیر وہ ہمارے ہاتھوں میں دے گئے ہیں جس سے ایک عالمِ دین، ایک وکیل، ایک طالبِ علم، ایک استاد اور ایک صحافی سبھی یکساں استفادہ کر سکتے ہیں۔

مولانا کی پروردہ داده زبان کو میں "اردوئے مبین" کہوں گا۔

اس اردوئے مبین پر مشتمل ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا لٹریچر مولانا مودودیؒ نے فراہم کیا اور پھیلانے والوں نے اسے شہر شہر گاؤں گاؤں اور گھر گھر ہی نہیں ملکوں ملکوں پہنچا دیا۔ جہاں تک مولانا مودودیؒ کی محبت یا دعوت کی پہنچ ہے وہاں تک اردو نے بھی رسائی حاصل کی ہے۔

مولانا مودودیؒ کی زبان کو سامنے رکھ کر میں یہ اندازہ کرتا ہوں کہ کوئی ہمہ پہلو اچھی شخصیت ایسی نہ ملے گی جس کی زبان اچھی نہ ہو۔ زبان اگر بے ڈھنگی ہو گی، اس میں گندگی محسوس ہو گی، اس میں سفلہ پن ہو گا یا کوئی اور عیب، تو وہ شخصیت ہی کے عیوب کی آئینہ دار ہو گی بالکل اس طرح جیسے رسم الخط کسی شخصیت کے ذہن و کردار کا عکاس ہوتا ہے۔ پس بڑے کام کرنے والے بڑے لوگوں کی زبان ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی صاف ستھری اور قاعدے قرینے کی ہونی چاہیے۔

مولانا مودودیؒ نے عمر بھر صحیح اردو لکھی اور بولی۔ کبھی کسی بچے کی زبان پر کوئی غلط محاورہ آجاتا تو محسوس ہو جاتا کہ جیسے ذہن کی جھیل میں کوئی کنکری پھینکی ہو۔ ہم لوگوں کی تحریر یا بول چال میں بھی کوئی انحراف آتا تو ٹوکتے تو نہیں تھے مگر محسوس ضرور کرتے تھے۔ مولانا مودودیؒ کو جہاں "جدیدیت" کی بے جا کنویاں پسند نہ تھیں وہاں دل میں اتنی کشادگی کہ ان کے رفقاء اپنی تحریروں یا ادبی نگارشات میں جو نئے تجربے کرتے ان پر کبھی گرفت نہ کرتے۔

تحریر میں رموزِ اوقاف کا بہت خیال رہتا۔ سوال، استعجاب، ندا، وقفِ کامل، وقفِ ناقص

(یعنی مروجہ کوما) اور حوالوں اور اقتباسات اور روایت پر "واوین" کا استعمال بڑے قرینے سے کرتے، حتیٰ کہ کتابت شدہ کاپیاں آتیں تو ان میں علامات کو توجہ سے درست کرتے۔ ضمناً یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کتابت شدہ کاپیوں کی نظرِ ثانی کا کام مولانا اس انہماک سے کرتے کہ شاذونادر ہی کوئی غلطی ان کی زد سے بچ نکلتی۔ کمال یہ ہے کہ انتہائی مصروف زندگی میں اپنی ساری کتابوں کی کاپیاں بھی پڑھی ہیں اور ان کے ایڈیشنوں کی تصحیح بھی کی ہے۔ سال بھر پہلے میرے ذریعے مرتب شدہ کتاب "یہودیت و نصرانیت" چھپ کر آئی تو شائع شدہ اوراق میں اتنی غلطیوں پر مولانا نے نشان لگائے کہ ناشر اور کاتب اور متقرر کردہ مصحح تو کیا، خود میں سخت شرمسار ہوا۔

ہاں تو علاماتِ اوقاف کے سلسلے میں بعض باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ مرکباتِ صلہ موصول کے جملوں کے درمیان وقف نہیں لگاتے تھے۔ ورنہ عام قاعدہ یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی لفظ "ہے" یا "ہیں" آ جائے لوگ وقف لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح حرفِ بیان "کہ" سے پہلے وقف نہیں لگاتے تھے۔ علاماتِ اوقاف کا صحیح استعمال اجزاء کو متعین کر دیتا ہے بلکہ اس کی مدد سے لب و لہجہ میں مناسب تبدیلیاں کرنا ممکن ہوتا ہے۔

ایک خصوصیت مولانا کی یہ تھی کہ وہ ایسے الفاظ پر جن کے تلفظ کی ایک سے زیادہ صورتیں ہو سکتی ہیں یا جن میں لوگ اکثر مغالطہ کھاتے تھے ان پر اعراب لگا دیتے۔ خصوصیت سے قرآن، سیرت، سوانح، تاریخ اور حدیث پر جب کبھی کچھ لکھتے تھے تو اسماء و اعلام پر اعراب لگاتے۔ عربی ناموں کے بارے میں جیسی بھاری غلطیاں ہمارے ہاں ہوتی ہیں اُن سے قارئین کو وہ بچانا چاہتے تھے۔ خصوصاً صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ اور دیگر بزرگانِ دین کے اسماء کا تلفظ ضرور واضح کر دیتے۔ زبان کی تنہا یہی خدمت بہت بڑی خدمت ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا نے دینی حقائق کو بیان کرنے کا اُردو زبان میں بالکل ایک نیا ادبی اسلوب پیدا کیا۔ مقالاتی اور خطابتی ادب میں اُن کے قلم نے کئی سنگِ میل نصب کیے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جا بجا ایسے پُر زور ادب پارے بکھرے ہوئے ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک خاص کتاب انہی پر مشتمل بن سکتی ہے۔ یہی وہ قوتِ بیان کا نیا استعمال تھا جس کی مدد سے اُنہوں نے جامد مذہبی رجحانات کو ایک تحریک میں بدل دیا۔ مولانا مودودیؒ نے اردو

زبان کو بے شمار انگریزی الفاظ کے نئے تراجم دیے ہیں۔ بہت سی اصطلاحات وضع کی ہیں، جگہ جگہ امثال سے مدد لی ہے۔ حسب ضرورت تشبیہات، استعارات اور تراکیب ایجاد کی ہیں۔ یہ پوری گفتگو ایک مقالہ چاہتی ہے جو میں اس وقت نہیں لکھ رہا۔

خطوط نویسی میں بھی ان کا خاص مقام تھا۔ کبھی کوئی سر پھرا گالیاں لکھ کر بھیجتا تو رسید خط بھیجتے مگر گالیوں کا جواب دینے کے بجائے خط چھنکوا دیتے۔ بحث بحثی کے سے اندازِ گفتگو سے بچتے اور کسی کے پیچھے پڑ کر زور دے دے کر ایک ہی بات کو نہ دہراتے رہتے۔ "مکتوب الیہان" کو محترمی و مکرمی کے القاب سے مخاطب کرتے اور آخر میں اپنے نام کے ساتھ لفظ "خاکسار" لکھتے یہ ان کا مستقل رنگ تھا جو آخر تک رہا۔ لکھنے پڑھنے کی باتیں تو الگ رہیں، ان کی تحریک کی سرکاری زبان پہلے روز سے اُردو قرار پائی۔ تمام بیانات رپورٹیں، سرکلرز اُردو زبان میں ہوتے۔ پھر خط و کتابت کا بڑا وسیع دائرہ تھا۔ ہزاروں خطوط مولانا نے لکھے اور لکھوائے یہ سب اُردو ہی میں لکھے گئے۔ غیر ملکی خط و کتابت یا کسی غیر معمولی مقامی ضرورت کے لیے انگریزی سے کام لیا جاتا اور اصل اُردو تحریروں کا ترجمہ ہو جاتا۔

باہر سے آکر ملنے والے لوگ شہری ہی نہیں دیہاتی، قریبی علاقوں ہی کے نہیں، دیر، چترال، بلوچستان اور سندھ کے، لکھے پڑھے ہی نہیں غیر خواندہ، سب کے سب مولانا کے ساتھ بیٹھتے تو اُردو میں باتیں سنتے اور اپنی بات اُردو ہی میں کہتے۔ بہت سے دوست ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتے جس میں ان کی علاقائی بولی کے الفاظ شامل ہوتے، مگر بات سمجھ میں آجاتی۔

حیرت کی بات ہے کہ مولانا مودودیؒ جو نہ لپک لپک کر لوگوں سے معانقے کرتے تھے، نہ اُن کی ضیافتیں کرتے تھے (اس کے حالات ہی نہ تھے) اور نہ غیر ضروری طور پر ملاقاتیوں کے دل خوش کرنے کے لیے مصنوعی تکلم فرماتے، مگر لوگ بڑے جذبۂ محبت و فدائیت سے ان کی باتیں سنتے اور ان کے بولے ہوئے لفظوں کو اپناتے اور اُردو ہی میں اپنا مدعا بیان کرتے۔ یہ سب مولانا مودودی کے جذبۂ اخلاص اور حبّ فی اللہ کی وجہ سے تھا۔

تہائی صدی کے عرصے میں کبھی کسی علاقے کے لوگوں نے لسانی تعصب کا مظاہرہ

نہیں کیا۔ جلسوں اور مجالسِ شوریٰ میں اور عام کھلی اجتماعی ملاقاتوں میں ہر شخص بے تکلفی سے جیسے چاہتا اظہارِ خیال کرتا، کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ نہ تو اردو زبان کو کوئی جبراً ٹھونس رہا تھا اور نہ اسے قبول کرنے میں کسی کے اندر تعصب کارفرما تھا۔

پھر مولانا کے متاثرین جب اپنے علاقوں میں جاتے تو وہاں اپنی مجالس میں بیٹھ کر مقامی بولی سے بھی کام لیتے لیکن اجتماعات کی غیر علاقائی نوعیت انھیں مجبور کر دیتی کہ وہ اردو ہی میں کارروائی کریں۔ یہ لوگ پشاور میں بیٹھے ہیں اور ان میں کوئی پنجابی ہے، کوئی حیدرآباد سے آیا ہوا کراچی کا آدمی کوئی سندھ میں آباد بہاری، ان کا مل کے کام کرنا سوائے اس کے ممکن نہ تھا کہ اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا جائے۔

لوگ گھروں میں جاتے، مرد بھی اور عورتیں بھی تو ڈائریوں میں اپنے مشاہدات و تاثرات اور مولانا مودودیؒ کے بعض ارشادات نوٹ کر کے لے جاتے۔ پھر دوستوں اور گھروں میں ان کو سناتے۔ اس طرح اردو زبان تحریک کے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہی۔

یہاں میں یہ بھی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ مولانا زبان کے معاملے میں تعصب سے پاک تھے۔ برصغیر کی تقسیم سے پہلے بھی ابتدائی لٹریچر کے تراجم دوسری زبانوں میں ہونے لگے تھے مگر جب تقسیم کا وقت قریب آ گیا تو جنوبی ہند کے اجتماعِ ارکان میں مولانا نے ساتھیوں کو توجہ دلائی کہ اب جب کہ ملک تقسیم ہونے والا ہے۔ نئے بھارت میں اردو زبان میں کام کرنا مشکل ہو جائے گا اور حکومت ہندی زبان کو جبراً پھیلا دے گی۔ اندریں صورت مناسب یہ ہے کہ آپ لوگ فوری طور پر تمام لٹریچر کو ہندی زبان میں منتقل کرنے کا انتظام کریں۔ اسی طرح حالیہ بنگلہ دیش کا علاقہ جب ہمارے ساتھ تھا تو وہاں بنگلہ تراجم کا آغاز کرایا۔

ادھر صوبہ سرحد میں پشتو میں، اور صوبہ سندھ میں سندھی زبان میں ترجموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بنگلا اور سندھی میں تو بعض اخبار بھی مقامی زبانوں میں جاری ہو گئے۔ مولانا مودودیؒ کا نظریۂ لسانیات یہ تھا کہ ساری زبانیں خدا کی عطا کردہ ہیں اور ہم پر لازم یہ ہے کہ ہم ہر زبان کو خدا کے دین کی خدمت کے لیے استعمال کریں۔ کسی زبان کے بولنے والوں کو دعوتِ حق سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ آج ۲۰، ۲۵ زبانوں میں اسلامی لٹریچر کے تراجم موجود ہیں اور مغربی

ممالک، افریقہ، عرب ممالک، جاپان اور انڈونیشیا تک پھیل رہے ہیں۔

اس عام دبیع لسانی خدمت کے علاوہ مولانا مودودیؒ مغفور نے نوجوانوں میں ادبِ اسلامی کو فروغ دینے کے لیے تحریک پیدا کی اس میدان میں ابتدائی متاثرین میں میں بھی تھا مولانا کا ادب سے متعلق مشور جو کئی جگہ شائع ہوا ہے۔ جماعت بننے سے پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں مولانا نے مجھے ہی لکھا جسے میں نے اپنے زمانہ ادارت میں چراغِ راہ میں شائع کیا تھا ملاحظہ ہو:۔

"معاش کے لیے کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط چیز ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی معاش کے لیے اینٹیں ڈھولے۔ ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے۔ یہ کام محض معاش کے لیے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کو تو بالکل اپنے نظریہ مسلک پر کرنا ہوگا۔"

اس جملے کے مثبت تقاضے پر تو بات بعد میں ہوگی منفی حیثیت سے کبھی گوارا نہیں ہوا کہ کسی معاوضے یا مفاد کے حصول کے لیے اپنے ضمیر کی آواز کو مسخ کرکے کوئی ادبی تخلیق مہیا کی جائے، بلکہ خدا نے مجھے اتنی توفیق دی کہ بہت سی علمی و ادبی اور صحافیانہ خدمات بلا معاوضہ کرتا رہتا ہوں کیوں کہ میری فقیرانہ زندگی میں دولت کی اندھی ہوس نہیں پائی جاتی۔

مثبت حیثیت سے تقسیم سے پہلے کے دور ہی میں کام شروع ہو گیا اور شاید اس میدان میں پہلے پہل مجھے ہی زیادہ موقع ملا۔ میں نے ملک نصر اللہ خاں عزیز کے سہ روزہ اخبار میں نے خطوط پر لکھنے کے کچے پکے تجربات شروع کیے۔ ترقی پسند ادبیات کو پڑھ کر سوچتا تھا کہ میں اپنے نظریے کے تقاضے سے زندگی کو کس طرح دیکھتا ہوں اور اس کے مسائل پر کس طرح اظہارِ خیال کر سکتا ہوں۔ میں بڑی مشکلوں سے اس انقلاب سے گزرا ہوں۔ پھر تقسیم کے بعد حلقہ ادبِ اسلامی بھی قائم ہوا، تعمیر پسند مصنفین کی تنظیم بھی موجود رہی، اور آج کل شہر بہ شہر جدا جدا تنظیمیں ادب میں اسلامی قدروں کو اجاگر کرنے والے افراد کو ابھار رہی ہیں۔

ادب کے متعلق مولانا مودودیؒ کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے کھل کر اسلامی مقاصد کی روشنی میں زندگی کے مسائل کو پیش کرنے کی تعلیم وقتاً فوقتاً ادیبوں کو دی اس سے ایک طرف

۔ ۔ ۔ جدید دور کے منفی افکار سے ہٹ کر لکھنے والوں کی ہمت بندھی اور دوسری طرف نوجوانوں کی ایک ایسی ٹیم میدان میں کام کرنے لگی جس نے نگارشات کو الحاد، مذہب بیزاری، مذہبی شعائر کی تضحیک، اخلاقی قدروں کی نفی، جنسی جنون اور عریانی و فحاشی، انسان کو معاشی حیوان قرار دینے کی روایت اور مغربی نظریات و افکار کو سرمایۂ فن بنانے کے مروجات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ہر چند کہ اس نوجوان قوت کو کم ذرائع و وسائل ملے مختلف حکومتوں کی مخالفانہ پالیسیوں کا بوجھ ان پر پڑتا رہا۔ نشری اور اشاعتی ادارے ان کی دسترس سے باہر بلکہ مخالف قوتوں کے تسلط میں تھے۔ نامور ماہرین تنقید جو منڈی کے صیرفی تھے وہ بھی دوسرے ہی نقطۂ نظر کے تھے۔ پھر ان کا بائیکاٹ اور بلیک آؤٹ کیا گیا مگر مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی پکار میں ایک ایسی نامعلوم تاثیر تھی کہ جس ادیب تک وہ آواز پہنچی اس نے پھر صحیح کام کرنا نہیں چھوڑا خواہ شہرت اور مفاد سب کچھ قیمت میں دینے پڑے ہوں۔

خدا کے فضل سے آج اس ملک میں بیسیوں شاعر اور سینکڑوں نثر نگار ایسے موجود ہیں جو ادبی دائرے میں اسلامی قدروں کو اجاگر کرنے کے جذبے کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اسلامی مزاج کا جو بھی ادب آئندہ اس سرزمین میں ابھرے گا اس کا کریڈٹ سارے کا سارا علامہ اقبالؒ مرحوم اور مولانا مودودیؒ مغفور ہی کو جائے گا۔

جدید اسلامی ادب کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ زندگی کے اہم موضوعات میں سے کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر ان کے خیالات ریکارڈ نہ ہو چکے ہوں، تحریک پاکستان ہو، اسلامی دستور کا مطالبہ ہو، قادیانیت ہو، جہادِ کشمیر ہو، ۱۹۶۵ء کا معرکہ ہو، ۱۹۷۱ء کا سانحہ ہو، تاریخ کے ان سارے ابواب کی جھلک ہمارے جدید اسلامی ادب میں پوری پوری موجود ہے بلکہ بعض موضوعات ایسے ہیں کہ جن پر دوسرے لوگوں کی توجہ گئی ہی نہیں اور اسلامی حلقوں نے کام کر دکھایا۔ مثلاً سیز فائر (۱۹۶۵ء) کے سلسلے میں کوئی کام کی چیز نہیں آئی۔ ہمارے یہاں اس پر خاصی قابلِ قدر تخلیقات ہیں۔ یا مسئلہ فلسطین اور بیت المقدس اور اخوان اور جہادِ افغانستان کے متعلق مسلم ادیبوں اور شاعروں نے جو کام کیا ہے اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ کچھ پیش

نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اتحادِ اسلامی پر بڑا قابلِ قدر مواد مسلم اہلِ فن نے فراہم کیا ہے۔ خصوصاً مسلم ادیبوں کا ایک مستقل میدان نعت ہے جس کے لیے ابتداً ادبی رسائل کے دروازے بند تھے مگر آج اس صنف میں اتنی توانائی ہے کہ ہر رسالہ نعتیں شائع کرتا ہے۔ اسی طرح مرثیہ مسلمانوں کی خاص صنف ہے اور اس میں بے شمار دینی جذبات کو ظہور کا راستہ ملتا ہے۔ ہرچند کہ دوسری جانب سے بھی لہو لگا کے شہیدوں میں شمار ہونے کے لیے غمِ حسینؓ پر تھوڑی بہت نظم اور نثری چیزیں لکھی جاتی ہیں مگر اس صنف پر غلبہ مسلم ادیبوں ہی کا ہے۔ یہ موقع کسی ایسے تقابل کا نہیں کہ میں لکھ کر بعض مثالوں کی مدد سے بتاؤں کہ کن میدانوں اور موضوعات پر مسلم ادیبوں کا کام زیادہ دقیع ہے۔

یہاں اس امر کا تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھار مولانا کے ساتھ مشاعرے کی خصوصی نشستیں ہو جاتیں، جیسے ماہر القادری کی آمد پر یا جیسے جگر مراد آبادی کو خاص طور پر مدعو کرنے پر، کبھی اجتماعات کے موقعوں پر شعراء اکٹھے ہوتے تو مشاعرے کا انعقاد کر لیتے۔ چند سال پہلے ایک خصوصی وسیع نشست مولانا کے ساتھ رشید پارک میں ہوئی تھی اور اس موقع پر ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم بھی شریک تھے۔ اس مجلس کی ٹیپ میرے پاس محفوظ ہے۔ میں نے اس میں ایک غزل پڑھی تھی جس کی بحر میں ذرا سا تصرف کر لیا تھا۔ اس کا ایک شعر بھی اس وقت مجھے یاد ہے ؎

نہیں کچھ دیر کہ مٹ جائے گا جادو کا یہ سب جاہ و جلال
ہم دکھا دیں گے کبھی اپنی کرامات! کوئی بات نہیں

اس کا ایک اور مصرع تھا ؎

عزم سنگیں ہو تو سنگینیٔ حالات کوئی بات نہیں

وہ جو میں نے کہا کہ ہم دکھا دیں گے کبھی اپنی کرامات تو تاریک ترین حالات کے ستائے ہوئے حاضرین میں سے ایک بول اٹھا کہ پھر دکھا دیجیے ناں۔ عرض کیا کہ آپ جلد ہی دیکھیں گے۔ زیادہ دیر نہیں گزری کہ فسطائیت کا تخت ٹوٹ گرا۔

یہ کہانی خواہ مخواہ طویل ہو جائے گی، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مولانا مودودیؒ اپنی دینی

خدمات کا جو صلہ خدا تعالیٰ سے پائیں گے وہ تو پائیں گے۔ اُنھوں نے اُردو کو اسلامی حقائق سے مالا مال کرنے، اسے بنانے سنوارنے اور اسے پھیلانے کے لیے جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس کی بھی وہ بہترین جزا اپنے مالک کی بارگاہ میں پائیں گے۔

مگر اُردو والوں کو بھی کچھ احساس ہے ؟

ادب والے بھی اعتراف کرتے ہیں ؟

جو احساس و اعتراف کریں ان کی اپنی فلاح، نہ کریں تو مولانا مودودیؒ کے اعمال نامے میں ان کی خاطر خدا تعالیٰ کوئی کمی نہیں کر دے گا اور نہ ان کے تیار کردہ سپاہیانِ حق دین اور زبان اور ادب کی خدمت کی سرگرمیوں سے پیچھے ہٹیں گے اور نہ تاریخ کسی کی خوشنودی کیلئے مولانا مودودی کے لسانی و ادبی کام کو مٹانے یا چھپانے پر تیار ہو سکتی ہے۔[۱]

---

[۱] مجھے اندازہ ہے کہ مولانا کی نگاہ میں ادب کی کتنی اہمیت تھی اور وہ ادبی تحریک کو مضبوط دیکھنا چاہتے تھے، مگر بدقسمتی سے ذہین دوستوں کی قلیل تعداد کی توجہات کو کام کے دوسرے بے شمار دائروں نے اپنی طرف منعطف کر لیا، اور ادبی کام کا حق ادا نہ ہو سکا۔ کاش کہ اب نوجوان صفیں اس مہم کو سنبھالیں۔

# مولانا مودودیؒ

# اور

# جماعتِ اسلامی

جماعت اسلامی کا وجود دراصل مولانا کے تحریکی تصورِ اسلام کا ایک خارجی عملی ظہور تھا۔

میں چاہتا ہوں کہ خود مولانا مودودیؒ کے اپنے ہی نقطۂ نظر کی روشنی میں جماعت کا مختصراً تذکرہ کیا جائے۔

صورتِ واقعہ یہ نہ تھی کہ ۲۵ اگست کو تاریخ کے باغ میں ایک کیاری اجاڑ پڑی تھی اور اچانک اگلی صبح کو اس میں ایک نئی جماعت کا پیڑ اُگ آیا جس کے لیے نہ موسم سازگار تھا اور نہ کسی باغبان نے کوئی بیج بویا تھا۔ مناسب ہوگا کہ یہاں میں مؤسسِ جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ پیش کروں:

"دراصل یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا کہ کسی شخص کے دل میں یکایک یہ شوق چرایا ہو کہ وہ اپنی ایک جماعت بنا ڈالے، اور اس نے چند لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک جماعت بنا ڈالی ہو، بلکہ وہ میرے ۱۴ سال کے مسلسل تجربات، مشاہدات، مطالعے اور غور و خوض کا نچوڑ تھا جس نے ایک اسکیم کی شکل اختیار کی تھی اور اس اسکیم کے مطابق جماعت اسلامی بنائی گئی تھی" (جماعت اسلامی کے ۲۹ سال، ص ۵)

مولاناؒ کے مشاہدات و مطالعات پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر کے مسلم معاشرے میں اُس وقت اتنے تضاد نمودار تھے کہ جن سے پیدا ہونے والے سوالات اُس وقت تک تو ڈھکے رہے جب تک تحریکِ خلافت کا عروج تھا۔ ترکی میں نظامِ خلافت اور برصغیر میں تحریکِ خلافت کے انہدام کے بعد مسلمان

مایوسی کے اندھیروں میں ڈوب گئے اور درپیش سوالات کے جواب بس اُن کے پاس ذہنی خلاء کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی تضاد زدہ معاشرے میں جب لاینحل سوالات کی وجہ سے ذہنی خلا کی کیفیت چھا جاتی ہے، تو یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے کسی نہ کسی نئی حرکت کا آغاز ہوتا ہے۔

معاشرے کے جن تضادات اور لاینحل سوالات اور ذہنی خلاء کا میں تذکرہ کر رہا ہوں زیادہ تر لوگ ان پر کوئی توجہ نہیں دیا کرتے، پھر کچھ توجہ دینے والے محض دھیما سا احساس کر کے رہ جاتے ہیں، بعض سوچتے بھی ہیں مگر نہ مثبت طور پر کوئی راستہ نکال سکتے ہیں، نہ دوسروں کو پکار کر جمع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سید مودودیؒ کو خدا نے جس خاندان میں پیدا کیا، جیسی تربیت کا انتظام کیا اور جو صلاحیتیں عطا کی تھیں ان کی وجہ سے ایک ایسی شخصیت بنی جس نے گرد و پیش کے احوال کو محسوس کیا، واقعات کا تجزیہ کیا، سوالات کو متشخص کیا اور اجتماعی الجھن کے حل کا راستہ نکالا۔ ان کا اپنا قول ہے:

"ابتداء سے میری افتادِ طبع یہ رہی ہے کہ جس مسئلے سے بھی مجھے سابقہ پیش آیا یا جس سے مجھے دلچسپی ہوئی، میں نے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تا کہ اسے اچھی طرح سمجھ سکوں۔"

(جماعتِ اسلامی کے ۲۹ سال۔ ص ۷)

ایسے شخص کے سامنے ایک طرف مسلمانوں کا یہ جذبہ تھا کہ وہ ترکی خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں، دوسری طرف جلیانوالہ باغ کے حادثے نے ملک بھر میں آگ بھڑکا دی اور تحریک آزادی نے زور پکڑا، پھر گاندھی جی کی قیادت میں ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا جس کے بل پر ترکِ موالات کی تحریک شروع ہوئی، پھر ترکی قوم پرستی کا ظہور اور جواباً عرب قوم پرستی کا نشوونما، پھر خلافت کا انہدام اور تحریکِ خلافت کا تزلزل، اُدھر ہندو مسلم اتحاد کے ٹوٹنے کا حادثہ اور ملک بھر میں ہندو مسلم فسادات کی آگ کا بھڑکنا، پھر شدھی کی تحریک، سوامی شردھانند کا قتل،

پھر مسلمانوں پر مغربی تہذیب کی یورش اور الحاد اور بے دینی کا حملہ، لادین وطنی اسٹیٹ کے لیے متحدہ قومیت کا غلغلہ، ادب میں الحاد اور فحاشی اور کمیونزم کے اثرات کا اُبھار اور جواہر لعل نہرو کا نقیب اشتراکیت بن کے اٹھنا، یہ سب کچھ ۱۹۲۴ء کے بعد کے دس پندرہ سالوں کے وہ حوادث تھے جن میں سے ایک ایک پر جماعتِ اسلامی کے موسس نے غور کیا اور آخر اس نتیجے تک پہنچا کہ:

"مسلمانوں کی نجات اگر ہے تو اسی میں ہے کہ وہ پھر سے ایک مبلغ قوم کی حیثیت اختیار کر لیں۔ صرف اسی طرح ہندوستان میں مسلمان اس پیچیدگی سے نکل سکتے ہیں جس میں وہ مبتلا ہیں" (۲۹ سال ص ۱۴)

مسلمانوں پر مغربی تہذیب و افکار کے غلبے کا سدِباب کرنے کے لیے انھوں نے یوں سوچا:

"یہ بات اُن کے ذہن نشین کی جائے کہ اسلام اپنا ایک نظامِ زندگی رکھتا ہے، اپنا ایک نظامِ تہذیب رکھتا ہے، اپنا ایک سیاسی نظام رکھتا ہے، اپنا ایک معاشی نظام رکھتا ہے، اپنا ایک نظامِ فکر اور نظامِ تعلیم رکھتا ہے، جو ہر لحاظ سے مغربی تہذیب اور اس کے متعلقات سے فائق ہے۔ یہ خیال ان کے دماغ سے نکالا جائے کہ تہذیب و تمدن کے معاملے میں انھیں کسی سے بھیک مانگنے کی کوئی ضرورت ہے" (۲۹ سال۔ ص ۲۲)

اگر مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے نظامِ فکر میں سے اتنا ہی اقتباس ہمارے پاس ہوتا تو بھی ہم اس فکری نہج کو پوری طرح سمجھ سکتے تھے جس پر سوچنے والا سوچ رہا تھا اور جس کے مطابق جماعتِ اسلامی کی تشکیل ہوئی۔ موسسِ جماعت نے صرف ان واقعات پر ہی نگاہ نہیں ڈالی جن کی طرف میں نے اجمالی اشارے کیے ہیں، بلکہ ایک عظیم تر سوال پر خصوصی توجہ دی۔ وہ سوال سنیئے:

"ہماری تاریخ کا ایک نہایت اہم اور ... خیز واقعہ ہے کہ ہمارے ملک پر

انیسویں صدی میں۔ ۔ ۔ ہزاروں میل دور سے آئی ہوئی ایک غیر مسلم قوم مسلط ہو گئی تھی، ۔ ۔ ۔ یہ واقعہ ہمارے لیے کئی لحاظ سے قابلِ غور ہے۔

پہلا سوال جس کی تحقیق ہمیں کرنی چاہیئے یہ ہے کہ آخر یہ واقعہ پیش کیسے آگیا؟ کیا یہ کوئی اتفاقی سانحہ تھا جو یوں ہی بے سبب ہم پر ٹوٹ پڑا؟ کیا وہ قدرت کا کوئی ظلم تھا جو اس نے بے قصور ہم پر کر ڈالا؟ کیا ہم بالکل ٹھیک چل رہے تھے، کوئی کمزوری اور کوئی خرابی ہم میں نہ تھی؟ یا فی الواقع ہم اپنے اندر مدتوں سے کچھ کمزوریاں اور کچھ خرابیاں پال رہے تھے جن کی سزا آخر کار ہمیں ایک بیرونی قوم کی غلامی کی شکل میں ملی؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ بلا جو باہر سے آکر ہم پر مسلط ہوئی، آیا یہ صرف ایک غلامی ہی کی بلا تھی یا وہ اپنے جلو میں اخلاق، افکار، تہذیب، مذہب، تمدن، معیشت اور سیاست کی دوسری بہت سی بلائیں بھی ساتھ لائی تھی؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ ان بلاؤں کے مقابلے میں ہمارا اپنا ردِ عمل کیا تھا؟

(مسلمانوں کا ماضی، حال، مستقبل، ص ۱۰،۹)

کسی معاملے کو اس طرح سوالات اُٹھا اُٹھا کر اُس کا باریکی سے تجزیہ کرنے والے لوگ بہت کم ہوا کرتے ہیں، اور سید مودودی رحمتہ اللہ علیہ ایسی ہی ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ بظاہر یہ سوالات تشکیلِ جماعت کے بہت بعد جماعت کے سالانہ اجتماعِ عام منعقدہ کراچی سال ۱۹۵۱ء کی تقریر میں سامنے لائے گئے تھے، مگر فی الحقیقت یہ مولانا کے ابتدائی فکر کا اہم حصہ ہیں جس کا ثبوت ان کی انقلاب انگیز کتاب تنقیحات کی تحریریں دیتی ہیں، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغرب کی ملحدانہ تہذیب کے سیلاب کا رُخ پھیرنے کے لیے یہ شخص اُٹھا تھا، اور اُس کے کارناموں کا ایک

بڑا حصہ یہ ہے کہ اُس نے مغرب کی مرعوبیت کا شکار ہوتی ہوئی قوم میں سے ایسی فعال قوت اُٹھا کھڑی کی جو مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کا علَم لے کے نکلی۔ یہ گویا ایک سیلاب سے کے خلاف جوابی سیلاب کو ٹکرانے کا عمل تھا جو موصوف نے شروع کیا۔

معمولی حیثیت سے سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے انسانی زندگی کے صلاح و فساد پر غور و خوض کر کے جو نتیجہ نکالا وہ یہ ہے:

"دُنیا میں فتنہ کی اصل جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خُدائی ہے۔ اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی بس کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ . . . کہیں ایک قوم دوسری کی الٰہ ہے، کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے، کہیں ایک پارٹی نے الٰہیت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے، کہیں قومی ریاست خدائی کے مقام پر براجمان ہے اور کہیں کوئی ڈکٹیٹر۔ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي (القصص - ۳۸) کی منادی کر رہا ہے . . . یہی وہ چیز ہے جو انسان کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہیوں، اس کی تمام محرومیوں کی اصل جڑ ہے۔ یہی اس کی ترقی میں اصل رکاوٹ ہے . . . اس روگ کا علاج بجز اس کے کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام اِلٰہوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا اِلٰہ اور ربّ العٰلمین کو اپنا ربّ قرار دے . . . . یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انبیا علیہم السلام نے انسانی زندگی میں کی۔"

(اسلامی ریاست مضمون اسلام کا نظریۂ سیاسی۔ اقتباسات از ص ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳)

## تجدید و احیائے دین

مختلف حوادث کے مشاہدے اور مختلف سوالات کے تجزیے سے گزر کر

مولانا مودودی جس مقام تک پہنچے وہ دین کو جڑ بنیاد سے نمایاں کرنے کا تجدیدی کام تھا۔ اس تجدیدی کام کی نوعیت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے جب مولانا ہی کی مختصر تالیف "تجدید و احیائے دین" کے مندرجات سامنے ہوں۔ تجدید واحیائے دین کی بنیادی بحث پڑھنے والے کو یہ کتاب پوری تاریخ کی ایک نئی تعبیر سے آگاہ کرتی ہے۔ اوّل روز سے ایک قوت اسلام ہے اور دوسری قوت جاہلیت جس کے رنگ روپ بدلتے رہتے ہیں اور جس کی تین بڑی قسمیں مولانا نے تفصیل سے بتائی ہیں۔ یعنی جاہلیتِ خالصہ، جاہلیتِ مشرکانہ اور جاہلیتِ راہبانہ! اسلام اور جاہلیت کی ان دونوں قوتوں میں ایک معرکۂ مسلسل جاری ہے۔ اسلام کے محاذ پر سپہ سالار انبیاء ہیں اور ان کے ساتھ تعاون کرنے اور ان کے کام کو جاری رکھنے والے صدیقین، شہداء اور صالحین سب ہیں۔ تاریخ میں جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جاہلیت کی تاریکی ہر طرف چھا جاتی ہے اور اس کے خلاف لڑنے والی قوتیں دب جاتی ہیں تو خدا کا کوئی نہ کوئی بندہ اُٹھتا ہے اور وہ کام کر جاتا ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ "سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق" وہ جاہلیت کے خلاف از سرِ نو جہاد برپا کرتا ہے۔

بہر حال مجھے یہ کہنا ہے کہ مولانا مودودی عام جماعت سازی یا لیڈری کی راہ پر چلنے کی بجائے تجدید و احیائے اسلام یا اقامتِ دین کی اُس راہ پر چلے جس پر سے کسی قافلے کو گزرے بہت مدت گزر چکی تھی۔ یہ کام شروع کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے تجدید و احیائے دین کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں تجدید کی حقیقت اور تجدیدی کام کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کے ساتھ کارِ تجدید کی مختصر تاریخ بیان کی گئی اور چند ممتاز مجددین کے کارناموں کا ذکر کیا گیا۔ اس کتاب کا بہت بڑا پارٹ یہ ہے کہ اسلام کے احیاء کے متعلق برسوں سے جو مایوسی پھیلی ہوئی تھی اور جسے متعدد اسلامی مساعی کی ناکامی نے اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ قوم کی قوم نے سارا معاملہ ظہورِ مہدی پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ بزرگ جب آئیں گے تو کراماتی طور پر

کفار و مشرکین کو زیر کر کے اسلام کا اقتدار قائم کر دیں گے۔ ان سے پہلے چونکہ اسلام کو بطور ایک دین، ایک تحریک، ایک انقلاب اور ایک نظام کے جلوہ گر کرنا ناممکن ہے، لہٰذا فی الحال تھوڑے سے بہت انفرادی عقیدوں اور مذہبی تقریبوں کے ساتھ ہیں اپنے اپنے مشغلوں میں مگن رہنا چاہیئے بلکہ کافرانہ اور مشرکانہ قوتوں کے تحت امن چین اور صلح و سازگاری سے دب دبا کر معاملہ کر لینا چاہیے۔ یعنی مایوسی اتنی شدید تھی کہ لشکرِ ملت اور اس کے مذہبی سپہ سالاروں نے ہتھیار کھول دیے تھے بلکہ ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس ظلمتِ یاس میں "تجدید و احیائے دین" میں اسلام اور جاہلیت کے دوامی معرکے کا جو نقشہ کھینچا گیا تھا کہ کس طرح ایک ایک یا چند افراد نے جانوں کی بازی لگا کر علمِ حق کو بلند رکھنے کی کوششیں کی ہیں، بجائے خود وہ ولولہ انگیز تھا، لیکن اس کے ساتھ اہم تر کوشش یہ کی گئی کہ جن احادیث کی بنا پر مایوسی پھیلائی جاتی رہی تھی اور جن سے یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ بس نظامِ حق تو تہائی صدی تک رہا، پھر بات بگڑتی ہی چلی گئی اور آگے مزید بگڑتی ہی جائے گی، انہی احادیث سے مولانا مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے امیدوں کی نئی روشنی فراہم کی۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشین گوئی جسے امام شاطبیؒ نے موافقات میں اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے منصبِ امامت میں نقل کیا ہے، اسی کو تجدید و احیائے دین کے ذریعے جب نوجوان قوتوں کے سامنے لایا گیا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس حدیثِ مبارکہ میں پہلے دورِ نبوت کے نظامِ رحمت کا ذکر ہے، پھر خلافت راشدہ علیٰ منہاج نبوۃ کا، پھر ملکِ عضوض کا پھر ملکِ جبرٌ کا اور آخری پانچویں زمانے کے متعلق یہ مژدہ ہے کہ:

| | |
|---|---|
| ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ تَعْمَلُ فِي النَّاسِ بِسُنَّةِ النَّبِيِّ وَ تُلْقِي الْاِسْلَامَ بِجِرَانِهٖ فِي الْاَرْضِ يَرْضٰى عَنْهُ سَاكِنُ السَّمَاءِ وَسَاكِنُ | پھر وہی خلافت بطریقِ نبوت ہو گی جو لوگوں کے درمیان نبیؐ کی سنت کے مطابق عمل کرے گی اور اسلام زمین میں پاؤں جمائے گا۔ اس حکومت سے |

اُلاَرضِ لاَتَدَعُ السَّمَاءُ مِنْ قَطْرِہٖ اِلاَّ صَبَّتْہُ مِدْرَارًا وَلاَ تَدَعُ الاَرْضُ مِنْ نَبَاتِھَا وَبَرَکَاتِھَا شَیْئًا اِلاَّ اَخْرَجَتْہُ۔

آسمان والے بھی خوش ہوں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اُگل دے گی۔

اس پر مولانا مودودیؒ نے اپنی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ تمام قرائن بتاتے ہیں کہ انسانی تاریخ تیزی کے ساتھ اس کی طرف (یعنی متذکرہ پانچویں دور کی طرف) بڑھ رہی ہے۔ انسانی ساخت کے سارے ازم آزمائے جا چکے ہیں اور بُری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ آدمی کے لیے اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تھک ہار کر اسلام کی طرف رجوع کرے۔ اس گفتگو میں مضمرات یہ ہے کہ عالمگیر حد تک اس دور کے آنے سے پہلے مختلف اقوام اور خطوں میں نظامِ حق کی تجدید ہو سکتی ہے اور یہ کہ اس طرح کا کام کرنے والی مختلف تحریکیں کش مکش کر کے وہ ماحول تیار کریں گی جس میں ملّتِ اسلامیہ کا وہ کامل لیڈر پیدا ہو جسے الامام المہدی کے لقب سے متعارف کرایا گیا ہے۔ سب سے اہم قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ آنے والے دورِ سلامتی کے ظہور کے سلسلے میں ہم نے کیا خدمات انجام دیں۔

ٹوٹی ہوئی اُمیدوں کو بحال کرنے کے لیے تجدید و احیائے دین کا ایک بہت ہی مؤثر اور اہم پارٹ یہ ہے کہ مولانا نے کراماتی اور طلسماتی فضا سے نکال کر امام مہدی کے تصور کو کھلی اور روشن فضا میں لا کھڑا کیا۔ کہنے کو اتنی سی بات کہی کہ مہدی اپنے زمانے کے لحاظ سے ایک جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، لیکن اس چھوٹی سی بات کا بڑا اثر یہ نمودار ہوا کہ کسی عظیم المرتبہ اور مافوق الفطرت اوصاف سے آراستہ شخصیت کا انتظار کرنے کے بجائے لوگوں میں یہ جذبہ پنپنے لگا کہ ایمان و اخلاق اور فکر و حکمت سے آراستہ گوشت پوست کی عام شخصیتوں کے ساتھ مل کر بھی دین کی خدمت کی جا سکتی ہے، مگر چونکہ یہ طرزِ فکر لوگوں کے ذہنوں

میں بنے ہوئے برسوں کے محلاتِ فکر کو متزلزل کرنے والا تھا اس لیے طرح طرح کے اعتراضات بھی اُٹھے اور سوالات بھی ہوئے۔ خصوصاً تا دیر جماعت کے شرکاء اکابر اور خود مولانا مودودی پر حملہ ہوتا رہا کہ تقویٰ تو ہے نہیں اور چلے ہیں دین کی خدمت کرنے۔ معترضین کا یہ اعتراض بالعموم مروجہ تصوف کے دیے ہوئے تصورِ تقویٰ کے لحاظ سے تھا۔ اس سلسلے میں تجدید و احیائے دین کے ضمیموں کے علاوہ رسائل و مسائل میں بحثیں ملیں گی، مگر ایک جگہ اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیتے ہوئے مولانا نے یہ فرمایا کہ:-

"رہیں بشارتیں اور کشوف و کرامات اور انوار و تجلیات، تو آپ ان کے اکتساب کی فکر میں نہ پڑیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مادی دنیا کے دھوکا دینے والے مظاہر میں توحید کی حقیقت کو پا لینے سے بڑا کوئی کشف نہیں ہے۔ شیطان اور اس کی ذریت کے دلائے ہوئے ڈراوؤں اور لالچوں کے مقابلے میں راہِ راست پر قائم رہنے سے بڑی کوئی کرامت نہیں ہے۔ کفر و فسق اور ضلالت کے اندھیروں میں حق کی روشنی دیکھنے اور اس کا اتباع کرنے سے بڑا کوئی مشاہدۂ انوار نہیں ہے۔ اور مومن کو اگر کوئی سب سے بڑی بشارت مل سکتی ہے تو وہ اللہ کو رب مان کر اُس پر جم جانے اور ثابت قدمی کے ساتھ اُس کی راہ پر چلنے سے ملتی ہے۔"

مروجہ تصوف کے بجائے ان جملوں میں سچا اسلامی تصوف بیان ہو گیا ہے جس کے مراتب کو ایک عامی مسلمان بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ان جملوں میں تصوف کی اصل روح اور اصل حقیقت آ گئی ہے۔ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی نے عام مسلمان نوجوانوں میں بھی حوصلہ پیدا کر دیا کہ وہ دین کی خدمت کر سکتے ہیں اور ایمان و تقویٰ سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ دُنیا میں کوئی عام لیڈر تک ایسا نہیں گزرا جس نے لوگوں کو سرمایۂ اُمید فراہم کیے بغیر اُن کو منظم و متحرک کر لیا ہو، کجا کہ تجدید و احیائے دین کی راہ میں کام کرنے والا کوئی داعی و نقیب اُٹھے اور جن لوگوں کو پکارے اُن کے دلوں

کو مایوسی کی تاریکیوں سے نکالے بغیر ذرا سا بھی مؤثر کام کر سکے۔ ہر وہ شخص جس نے کسی بھی دور میں حق کی علمبرداری کا کام کیا ہے وہ شدید ناسازگاری ماحول اور مخالفتوں کی بوچھاڑوں میں بھی اُمید کا ایک اٹل مینارۂ نور ثابت ہوا ہے۔ مولانا مودودی شروع سے آخر تک مضبوط اُمید کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں اور اُنھوں نے مایوسی اور جمود کی برف توڑنے کا کام تجدید و احیائے دین اور دوسرے مؤثر مقالات و مضامین لکھ کر کیا ہے۔

## فضا کی تیاری کا ۹ سالہ دَور

تشکیلِ جماعت سے پہلے کے مرحلۂ کار کو خود مؤسس جماعت نے ۹ سال پر پھیلا ہوا بتایا ہے، یعنی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۱ء تک۔

فضا کی تیاری کے اس مرحلہ تنقید و تبلیغ میں ہر دو پہلوؤں سے جو کام ہوا اُس کی بہترین مختصر رپورٹ وہی ہے جو خود مولانا مودودی کی مرتب کردہ ہے۔

ملاحظہ ہو:

"ایک طرف جاہلیت کے ہر گوشے پر تنقید کی گئی۔ قدیم مشرکانہ اور راہبانہ جاہلیتوں پر بھی اور جدید مغربی جاہلیت پر بھی۔ جاہلیت کے اُن اثرات پر بھی جو اپنی پچھلی تاریخ کے دوران میں ہم قبول کرتے رہے ہیں، اور اُن اثرات پر بھی جنھیں آج ہم اپنی زندگی میں لیے ہوئے ہیں۔ ان ساری جاہلیتوں پر تنقید کر کے اُن کی عقلی کمزوریوں اور ان کے اخلاقی و تمدنی نقصانات کو واضح کیا گیا اور پورا تجزیہ کر کے بتایا گیا کہ اسلام کا راستہ اپنی فکری بنیادوں اور اپنے عملی نتائج میں ان جاہلیتوں سے کس کس طرح ممیز ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے مختلف مدارسِ فکر پر بھی تنقید کی گئی۔ فقہی جمود کے حامیوں پر بھی اور اجتہادِ مطلق کے مدعیوں پر بھی، حدیث کا انکار کرنے والوں پر بھی اور

حدیث کے بارے میں غلو کرنے والوں پر بھی۔ دین سے آزاد ہونے والوں پر بھی اور دین کو اپنی خواہشات کا پابند بنانے والوں پر بھی۔ اس پورے تنقیدی کام میں جو کچھ ہمارے پیشِ نظر تھا وہ صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے صاحبِ فکر لوگوں کی اُن ذہنی اُلجھنوں کو دور کیا جائے جن کی وجہ سے اُن کے لیے اسلام کو سمجھنا اور خیالات کے جنگل میں اس کی شاہ راہ کو دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی وجہ سے جب کبھی ہماری تنقیدوں پر بگڑ کر کسی نے ہم کو بحث میں اُلجھانا چاہا — اور اس کی نوبت بارہا آئی ہے — تو ہم نے اس کے ساتھ اُلجھنے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف اس مرحلے میں اسلام کے پورے نظامِ زندگی کو، جیسا کہ وہ خدا کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سُنّت میں بیان ہوا ہے، معقول اور مدلّل اور مفصل طریقے سے پیش کیا گیا۔ اس کے عقائد اور ایمانیات کیا ہیں، اُس کا نظریۂ کائنات و انسان کیا ہے، اُس کا فلسفۂ اخلاق کیسا ہے، اُس کی عبادات کس غرض کے لیے ہیں، وہ انسانی سیرت و کردار کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، اس کی تہذیب کے بنیادی اُصول کیا ہیں، وہ تمدن، معیشت، معاشرت اور سیاست کے لیے کیا قاعدے تجویز کرتا ہے، اس کے مزاج سے کس قسم کا نظامِ تعلیم مناسبت رکھتا ہے، وہ انسانی زندگی کے مسائل کو پہلے کس طرح حل کرتا تھا اور آج کس طرح کر سکتا ہے، اس کے نظامِ زندگی کو برپا کرنے کے لیے پہلے کیا کچھ کیا گیا ہے اور آج کیا کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام امور کو جہاں تک ہمارے بس میں تھا ہم نے ایسے طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش کی جو موجودہ دور کے تعلیم یافتہ آدمی کو مطمئن کر سکیں، مگر اس کام کا مقصد محض ایک علمی خدمت انجام

دینا نہ تھا بلکہ اوّل روز سے ہمارے پیشِ نظر یہ تھا کہ جو لوگ سوچ سمجھ کر اسلام کے معتقد ہوں وہ اس کو عملاً قائم کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں۔ اس لیے ہم ہر قدم پر دماغوں کو مطمئن کرنے کے ساتھ دلوں کو اکسانے کی کوشش بھی کرتے رہے اور ایمان کی دعوت کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرتے رہے کہ کوئی دین کسی دوسرے دین کی آغوش میں پرورش نہیں پا سکتا، لہٰذا جو لوگ بھی سچے دل سے اسلام کی پیروی کرنا چاہتے ہوں انھیں دنیا میں کفر کی امامت کے بجائے اسلام کی امامت قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر تیار ہونا چاہیے۔"

(جماعتِ اسلامی کا مقصد، تاریخ، لائحہ عمل ص ۳ تا ۲۶)

ان مقاصد کو جن تحریروں سے پورا کیا گیا وہ بیس مطبوعات کی شکل میں موجود ہیں[1] ان کے علاوہ مرحلۂ دعوت سے قبل الجہاد فی الاسلام شائع ہو چکی تھی۔ اسلامی انقلاب

---

[1] ان کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

- اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی اور مسئلہ جبر و قدر (۳۳ء)
- تنقیحات اور تفہیمات حصہ اوّل و دوم کے بیشتر مضامین (۳۳ء تا ۳۸ء)
- حقوق الزوجین اور اسلام اور ضبطِ ولادت (۳۵ء)
- خطبات (۳۸ء)
- اسلام کا نظریۂ سیاسی اور اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر (۳۹ء)
- تجدید و احیائے دین، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے اور ایک اہم استفتاء (۴۰ء)
- قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، اسلام اور جاہلیت، نیا نظام تعلیم اور انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل (۴۱ء)

کے لیے بڑی حد تک ضروری فکری مواد ان کے اندر آ گیا تھا، اور یہ لٹریچر تیزی سے اثر انداز ہونے لگا۔ یہ تحریریں جگہ جگہ لوگ پڑھتے اور دوسروں کو سناتے اور از خود ان کو پھیلاتے تھے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے بے شمار لوگ خط و کتابت میں متعلقہ مباحث کو چھیڑتے اور ملاقاتوں میں سوالات اور اعتراضات پیش کر کے وضاحتیں حاصل کرتے۔ قارئین کے حلقوں میں جابجا بحثوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سب کچھ آثار تھے اُس ذہنی حرکت کے جو چاروں طرف پیدا ہو رہی تھی۔

## تجدیدِ اصطلاحات

لیکن یہ کام جس کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے اس کا ایک اور پہلو بڑا اہم تھا۔ دُنیا کے ہر نظام یا دین کو سمجھنے کے لیے اُس کی اصطلاحات کلید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خود لفظ "اسلام" اور لفظ "مسلم" اصطلاحی معنویت رکھتے تھے۔ اسی طرح دوسری بے شمار معروف عام اصطلاحات ایسی تھیں جن پر جمود کی گرد اتنی پڑ چکی تھی کہ اُن کی صحیح معنویت کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ ہماری دینی اصطلاحات کے وہ بیج جن سے پورے ایک نظامِ فکر اور نظامِ عمل کی فصل اُگتی رہنی چاہیے تھی، جیسے اپنی قوتِ نمو کھو چکی تھیں۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے کارنامۂ عظیم کے فہم کے لیے یہ حقیقت جاننا ضروری ہے کہ اُنھوں نے تمام مستعمل و معروف اسلامی اصطلاحات کی اصل معنویت کو از سرِ نو بحال کر دیا۔

جب ہمارے کانوں میں یہ آواز آتی ہے کہ "مسلمان اور چور؟ مسلمان اور قاتل؟ مسلمان اور زانی؟" تو اسے سُنتے ہی ہم چونک جاتے ہیں اور سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مسلمان آخر کیا ہوتا ہے۔ پھر آواز آتی ہے کہ آج مسلمانوں کی اتنی ہی قسمیں پائی جاتی ہیں جتنی سانپوں کی ہوتی ہیں، حالانکہ مسلمان انسانوں کی صرف ایک ہی قسم کا نام تھا۔ پھر جب ہم مولانا کے جہانِ افکار سے گزرتے ہوئے یہ جملہ پڑھتے ہیں کہ "ساری کائنات کا مذہب اسلام ہے ۔ ۔ ۔ سورج، چاند اور

تارے سب مسلم ہیں، زمین بھی مسلم ہے۔ ہوا اور پانی اور روشنی بھی مسلم ہیں، درخت اور پتھر اور جانور بھی مسلم ہیں اور وہ انسان بھی جو خدا کو نہیں پہچانتا اور خدا کا انکار کرتا ہے، جو خدا کے سوا دوسروں کو پوجتا ہے، جو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے، ہاں وہ بھی اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے مسلم ہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس کے تمام اعضا اور اس کے جسم کے ایک ایک رونگٹے کا مذہب اسلام ہے۔ ۔ ۔ ۔ حتیٰ کہ اس کی وہ زبان بھی مسلمان ہے جس سے وہ نادانی کے ساتھ شرک اور کفر کے خیالات ظاہر کرتا ہے، اس کا وہ سر بھی پیدائشی مسلم ہے جس کو وہ زبردستی خدا کے سوا دوسروں کے سامنے جھکاتا ہے۔"

(رسالہ دینیات۔ ص ۱۱، ۱۲)

پھر نسلی اور مردم شماری کے مسلمانوں اور شعوری طور پر اسلام پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں کا فرق سامنے آتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ جب الٰہ کا مفہوم تذکرہ لٹریچر میں واضح ہو کر سامنے آیا تو کلمۂ طیبہ سمجھ میں آیا اور اندازہ ہوا کہ مسجدوں کے مؤذنوں کی پکار کتنی انقلابی ہوتی ہے جسے نہ وہ سمجھ رہے ہوتے ہیں، نہ اُن کے سننے والے۔

پھر جب دین اور مذہب اور رب اور عبادات کی اصطلاحیں واضح ہوئیں تو نگاہوں میں چکا چوندسی ہو گئی۔ سمجھ میں آیا کہ کیا کیا قوتیں دنیا میں رب اور الٰہ بنی ہوئی ہیں اور خود ہم مسلمان ان ارباب و اٰلہہ کو اپنی خدمات سے مضبوط کرنے میں مصروف ہیں۔ سمجھ میں آیا کہ دُنیا کے مختلف سیاسی اور تمدنی نظام اپنی جگہ ایک دین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لادین جمہوریت ہو یا اشتراکیت یا قوم پرستی یا سیکولر وطنی اسٹیٹ یا خاندانی بادشاہت یا شخصی آمریت، ان سارے پیرایوں میں خدا کے باغی انسانوں نے اپنی جھوٹی خدائیاں قائم کر رکھی ہیں اور باطل ادیان و شرائع چلا رکھے ہیں۔ پہلی بار یہ واضح ہوا کہ دین جہاں ایک طرف تہذیب کی وسعتوں پر حاوی ہے وہاں دوسری طرف وہ جدید اسٹیٹ جیسا خدائی اقتدار ریاست میں چاہتا ہے۔

عبادت کے متعلق کبھی یہ سوچا نہ تھا کہ عبادتِ خمسہ کی اہمیت و اوّلیت اپنی جگہ، مگر حقیقت میں مطلوب یہ ہے کہ مومن و مسلم کی پوری زندگی عبادت میں گزرے، یعنی اس کا ہر قول و فعل خدا کے امر و اذن کے دائرے میں آجائے۔ کبھی سوچا نہ تھا کہ خدا کے اوامر و نواہی کی حدود سے بے نیاز ہو کر کسی کی یکطرفہ اطاعت کرنا اس کی عبادت کی تعریف میں داخل ہے اور عنداللہ یہ شرک و بغاوت کا درجہ ہے۔

پھر دعوت، جہاد، شہادت، ہجرت، اقامتِ دین، صبر وغیرہ دوسری ساری اصطلاحات پر پڑے ہوئے پردے ہٹتے چلے گئے۔ اُمت اور ملّت اور جماعت، امامت اور خلافت کے تصورات واضح ہوئے۔ اسلام کے نظریۂ سیاسی میں تو داعئ حق نے دو نئی اصطلاحات وضع کر کے بہت سے ذہنوں کو چونکا دیا۔ ان میں سے ایک اصطلاح "Theo-Democracy" کی تھی، یعنی خدا پرستانہ جمہوریت۔ دوسری تھی "Popular-Vicegerency" یعنی جمہوری خلافت۔ خاص طور پر جمہوری خلافت کی بحث نے اُن بے شمار اُلجھنوں کا خاتمہ کر دیا جو اُس دَور میں اسلام اور جمہوریت کے متعلق پھیلی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کے لیے قوم ہونے کے بجائے جہانی انقلابی پارٹی ہونے کا تصور بھی سوچ بچار کی نئی راہیں کھولنے والا تھا۔

بعد کے تمام ادوارِ کار میں مولانا مودودی نے بے شمار اصطلاحات کی اصل دینی معنویت کو اس طرح نکھار کر پیش کیا کہ عام آدمی نے بھی بات پالی۔ مثلاً سُنت و بدعت والی تفریق کو نگاہوں میں لائیے۔ فرقہ وارانہ طرزِ فکر نے متذکرہ دونوں اصطلاحوں کو اسلحۂ جنگ بنا دیا ہے، مگر مولانا مودودی نے حکیمانہ انداز سے یہ حقیقت سامنے رکھی ہے کہ سنت ایک مستقل روش کا نام ہے اور بدعت اس کے مقابل کی دوسری روش ہے۔

تنقیحات ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اعلانِ جنگ ہے دورِ حاضر کے خلاف۔ یوں تو بہت سے دوسرے مقالات اور تقاریر

میں مغربی فکر اور مغربی تہذیب اور لادینی نظام ہائے سیاست و معیشت پر بصیرت افروز گفتگو ملتی ہیں، لیکن مغربی تہذیب و معاشرت کے حملے اور اس کے مسلم مفتوحین کو پیش نظر رکھ کر جس خوبی سے مولانا نے اہل مغرب کے غلبے اور مسلمانوں کی مغلوبیت کے اسباب، مغرب کی فکری امامت اور اس کا تنقیدی تجزیہ، مغربی طرز تعلیم اور اس پر تبصرہ اور مغربی یورش کے جواب میں مسلمانوں کے اختیار کردہ مختلف موقفوں کا جائزہ تنقیحات کے اوراق میں پیش کیا ہے، یہ سارا مواد مخاطب نوجوان طبقوں کو مغرب کے تہذیبی سیلاب کے خلاف جوابی سیلاب اٹھانے کے لیے تیار کرنے کا محرک بنا۔

## سیاسی حالات میں بھاری تبدیلیاں

اس نو سالہ مرحلے کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ شاید کچھ اور دراز ہوتا اور راقم کے خیال کے مطابق بھی دراز ہونا چاہیے تھا۔ مگر ملک کے سیاسی حالات میں تیزی سے ایسی بھاری تبدیلیاں نمودار ہوئیں کہ مرحلۂ دوم میں قدم رکھنا پڑا۔ وہ تبدیلیاں کیا تھیں؟ مولانا فرماتے ہیں کہ:

> "۱۹۳۷ء میں مجھ کو حیدر آباد سے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر کے دوران میں میں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد مسلمانوں پر کھلی کھلی شکست خوردگی کے آثار طاری ہو چکے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ میں نے دیکھا کہ مسلمان ڈاکٹر کھرے سے بالکل اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے ایک محکوم قوم کے افراد ایک حاکم قوم کے فرد سے کرتے ہیں۔ یہ منظر میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ حیدر آباد پہنچا تو یقین کیجیے کہ میری راتوں کی نیند اڑ گئی۔ سوچتا رہا کہ یا اللہ اب اس سرزمین میں مسلمانوں کا کیا انجام ہونا ہے۔"

(۲۹ سال ۔ ص ۲۲)

تب مولانا نے وہ سلسلۂ بحث لکھنا شروع کیا جو مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول کے نام سے شائع ہوا۔

پھر ۱۹۳۸ء میں کانگریس نے مسلمانوں میں رابطہ عوام یا Muslim mass contact کی جو تحریک شروع کی اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں کہ:

"مسلم رابطۂ عوام کی مہم شروع کی گئی جس کے اصل کارکن مسلمان کمیونسٹ تھے اور غضب یہ کہ اس کام میں علمائے کرام کا ایک گروہ بھی ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہ گروہ اس بات کا قائل تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں اور اس قوم کے اندر ایک ایسا جمہوری نظام رائج ہو سکتا ہے جس میں فیصلہ اکثریت کرنے والی ہو۔ اس پر میں نے وہ مضامین لکھنے شروع کیے جو مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم اور مسئلۂ قومیت کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اپنا پورا زور اس کام میں صرف کر دیا کہ مسلمانوں کو غیر مسلم قومیت کے اندر جذب ہونے سے بچایا جائے۔" (۲۹ سال - ص ۲۴)

اپنے اس نقطۂ نظر کی توجیہہ مولانا نے یوں پیش کی کہ:

"ظاہر بات ہے کہ جو شخص بھی اسلام کو یہاں سربلند کرنا چاہے گا وہ ضرور یہ خیال کرے گا کہ میرے پاس پہلے سے جو سرمایہ موجود ہے وہ ضائع نہ ہو جائے۔" (۲۹ سال - ص ۲۵)

اس داستان کا اگلا باب یہ ہے کہ بقول مولانا:

"اس کے بعد ۱۹۳۹ء اور اس کے بعد کا دور آیا۔ مسلم لیگ کی تحریک نے زور پکڑا۔ پاکستان کی تحریک اٹھنی شروع ہوئی، جس نے آخرکار ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی شکل اختیار کی۔ ۔ ۔ ۔ اُس زمانے میں جو بات میرے نزدیک اہم تھی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ تم محض ایک قوم نہیں ہو، تم ایک مبلغ قوم ہو، ایک مشنری قوم

ہو، تمھیں وہ حکومت قائم کرنی چاہیے جو دُنیا میں اسلام کے لیے ایک مشنری حکومت بن جائے۔ ۔ ۔ ۔ اس غرض کے لیے میں نے وہ سلسلۂ مضامین لکھنا شروع کیا جو بعد میں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ سوم کے نام سے شائع ہوا۔"

(۲۹ سال - ص ۲۵، ۲۸)

## تشکیل جماعت کی تیاری

مولانا فرماتے ہیں :۔

"جب میں نے دیکھا کہ میری آواز صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے تو پھر دوسرا قدم جو میری سمجھ میں آیا، یہ تھا کہ اپنی طرف سے ایک ایسی جماعت منظم کرنی چاہیے جو صاحب کردار لوگوں پر مشتمل ہو اور اُن فتنوں کا مقابلہ کر سکے جو آگے آتے نظر آرہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت جو اہم ترین سوالات میرے سامنے تھے وہ یہ تھے کہ حالات جس رُخ پر جا رہے ہیں اُن میں ایک شکل تو یہ پیش آسکتی ہے کہ پاکستان کے لیے کوشش کر کے مسلم لیگ ناکام ہو جائے اور ہندوستان میں انگریز واحد ہندوستانی قومیّت کی بنیاد پر ایک جمہوری حکومت قائم کر کے اُسے ہندوؤں کے حوالے کر کے چلا جائے۔ اس صورت میں کیا کرنا ہوگا؟ دوسری شکل یہ پیش آسکتی ہے کہ مسلم لیگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے اور ملک تقسیم ہو جائے۔ اس صورت میں کروڑوں مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ اُن کا کیا حشر ہوگا؟ اور خود پاکستان میں اسلام کا حشر کیا ہوگا؟ ۔ ۔ ۔ یہ موقع تھا، جب میں نے قطعی طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ جماعت اسلامی کے نام سے ایک جماعت قائم کی جائے۔"

(۲۹ سال - ص ۲۵-۲۶، ۲۷، ۲۸)

تشکیلِ جماعت کے اقدام سے پہلے پہلے اُلجھنوں کے اور بھی بہت سے جھاڑ جھنکاڑ تھے جن کو مؤسسِ جماعت نے صاف کیا۔ جامد انفرادی مذہب پر مطمئن ذہنوں کو ہلا دیا۔ قرنوں سے دین و سیاست کا جو انقطاع رائج چلا آ رہا تھا اسے ختم کیا اور واضح کیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ ایک ایسا دین ہے جو سیاست پر بھی بہت حاوی ہے۔ اسی طرح دین کے لیے جماعتی زندگی کی اہمیت اور منظم نیکی کی ضرورت سے خواص و عوام کو آگاہ کیا۔

پھر جماعت قائم کرنے سے پہلے کے ماحول میں جب کہ بہت سے متاثرین میں اضطراب کی ایک لہر اُٹھ چکی تھی اور وہ اسلام کے انقلابی مشن کے لیے کام کرنے کا کوئی اسلوب چاہتے تھے، مؤسسِ جماعت نے یہ بھی بتایا کہ حالات کے سیلاب کا رُخ پھیر دینے، طاغوتی قوتوں سے عہدہ برآ ہونے اور زمانہ ستیزی کا مسلک اسلام کی علمبرداری کے لیے اختیار کرنے کا فریضہ کیسی جماعت ادا کر سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مضمون لکھا "ایک صالح جماعت کی ضرورت" جو ابتداً اپریل ۱۹۴۱ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا۔ اس کا ایک اقتباس:

> "اب انسانیت کی نجات اسلام میں ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بس اسلام کی دعوت شائع کر دیں اور دنیا مفتوح ہو جائے گی۔ ہر موجود تہذیب کی شکست و ریخت کے لیے ایک قوت اور ایک گروہ کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر نئی تہذیب لانے کے لیے ایک فکر اور ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس دُنیا کو آئندہ دورِ ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریے کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔"

اس مضمون میں زور دیا گیا کہ اسلامی نظریے کی پشت پر ایسے صلوق الایمان لوگوں کی جماعت موجود ہونی چاہیے جو اعلیٰ سیرت اور قربانی اور سرفروشی کی صفات رکھتے

ہوں کیونکہ انھیں مسلط نظام سے بغاوت کرتے ہوئے :

"ان تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔"

(حوالۂ مذکور۔ ترجمان القرآن اپریل ۴۱ء)

اور اس مضمون کی پشت پناہی تنقیحات کے ایک مضمون سے ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

"یہ شریعت ان بہادر شیروں کے لیے اتری ہے جو ہوا کا رُخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں، جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کے رُخ بدل دینے کی ہمت رکھتے ہوں، جو صبغۃ اللہ کو دُنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں، اور اس رنگ میں تمام دُنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس کی آفرینش کا مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہِ راست اور صراطِ مستقیم ہے۔" (تنقیحات۔ کیشِ مردان نہ مذہبِ گوسفنداں)

ایک اور ضروری حوالہ عرض ہے :

"۔ ۔ ۔ ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اُٹھے، اسی قسم کے انفرادی کیریکٹر تیار ہوں، اسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے۔ اسی طرز کے کارکن تربیت پائیں، اسی ڈھنگ کی لیڈر شپ ہو، اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضا اُس خاص نظامِ حکومت کی نوعیت فطرتاً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم)

## کیسے لوگ درکار ہیں؟

پھر یہ سوال کہ کیسے لوگ درکار ہیں، اس کے متعلق یہ عبارت خصوصی اہمیت رکھتی ہے کہ:

"اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر، قربانیاں کر کے، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ . . . اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور فعل سے اپنی مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں، اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث، بے غرض، راست باز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں اس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہو گا۔"

(ایضاً)

دوسرا ایک حوالہ:

"اس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں، جن کی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو۔ جو ہر حال میں اس ضابطہ اور طرز عمل کے پابند ہوں جو اس کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے۔ جن کی تمام سعی و جہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو۔ جو تنگ نظری اور تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشے میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں۔ جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے

نہ ہوں۔ جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ زمین کے خزانے ان کے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکّے امانت دار ثابت ہوں۔ جب بستیوں کی حکومت ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیندوں سے محروم ہو جائیں اور لوگ ان کی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں۔ جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو اُن سے قتل و غارت گری، ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔" (ایضاً)

یہ تھا فکری پس منظر جس کی تیاری مکمل ہونے پر اگست ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی قائم ہوئی۔ جماعت کے قیام کی فضا بڑی دل گداز تھی، شرکا میں احساسِ ذمہ داری پوری طرح موجود تھا اور ایک طرح کا نو مسلمانہ جذبہ بے تاب کام کر رہا تھا۔

## جماعت کی ۱۵ خصوصیات

جماعت اسلامی کے امتیازی خدوخال یہ تھے:

(۱) دعوت، عقیدے اور نصب العین کی طرف تھی، نہ کہ کسی شخصیت کی طرف۔

(۲) جماعت کی ہیئت فرقوں کی طرز کی نہ تھی، اور واضح طور پر یہ طے کیا گیا کہ ہمارا ادّعا یہ نہیں ہوگا کہ اسلام صرف اسی جماعت کے دائرے کے اندر ہے۔

(۳) نہایت اہم بات یہ تھی کہ شرکا سے مطالبہ یہ تھا کہ وہ جماعت کی دعوت اور نصب العین اور اس کے طریقِ کار کو پورے شعور سے سمجھ کر آئیں اور متفرق تصورات اور دلچسپیوں کو چھوڑ کر اقامتِ دین کے کارِ عظیم کے لیے یکسو ہو جائیں۔

(۴) بنیادی کام یہ سونپا گیا کہ ہر شخص اپنے علمِ دین کو بڑھانے اور اپنی اصلاح کرنے کے ساتھ ساتھ نظامِ حق کی دعوت کو بالمشافہ دوسروں تک پہنچائے اور اس سلسلے میں جو لٹریچر تیار ہوا ہے پھیلائے۔ کوئی شک نہیں کہ اس پہلو سے ہمارے

بعد ان کارکنوں نے شاندار مثال قائم کر دی۔ انھوں نے رشتہ داروں، پڑوسیوں، تعارف کے لوگوں، دفتر اور کاروبار کے ساتھیوں تک پہنچ پہنچ کر تحریک اخلاص سے دعوت پیش کی، وہ بستی بستی گھومتے پھرے، انھوں نے ایک ایک دروازے پر دستک دی، وہ ہر مرحلے میں جماعت کا لٹریچر تھیلوں میں ڈال کر نکل کھڑے ہوئے۔ کہیں مخالفت ہوتی، کہیں مولانا اور جماعت کو گالیاں دی جاتیں، کہیں بات سُنی جاتی، کہیں سے یکایک تائید مل جاتی۔ میرا خیال ہے کہ ان کی ہر دس ملاقاتوں میں سے چار لازماً نتیجہ خیز رہیں۔ اور یہ انھی کی کمائی ہے جس کے نتیجے میں آج ہم وسیع تر دائرے میں کام کر رہے ہیں۔ انقلابی کام کرنے والوں کے لیے یہ وہ طریق کار ہے جس کا کوئی بدل نہیں اور جس کا کوئی توڑ نہیں۔ یہ وہ کام ہے جو ہر قسم کے حالات میں جاری رہ سکتا ہے۔ صرف عزم اور جرأت کی ضرورت ہے۔ اس کام کے بغیر نہ انقلابی عمل تیز ہو سکتا ہے، نہ انتخابی سرگرمی سے کچھ بڑے نتائج نکل سکتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے کارکن کا یہ وہ مجنونانہ مشغلہ ہے کہ جو اگر جاری نہ رہے تو کارکن کارکن نہیں رہتا بلکہ ایمانی و اخلاقی لحاظ سے وہ زوال کا شکار ہو جاتا ہے، آج ہمارے جو ساتھی اس بنیادی کام کو باقی رکھے ہوئے ہیں، ہمارا حقیقی سرمایۂ زندگی وہی ہیں۔

(۵) جماعت کا انتظامی ڈھانچہ اس طرز پر بنایا گیا کہ اس کے اربابِ حل و عقد رفقاء کی رایوں کی تائید حاصل کر کے چلیں، مگر کوئی شخص خود کسی منصب کے لیے امیدوار بن کر سعی نہ کرے۔

(۶) تنظیمی دائرے میں ایک دوسرے کے خلاف نجویٰ اور کنویسنگ اور گروہ بندیوں کو ممنوع قرار دیا گیا۔

(۷) تنظیم کا بنیادی واحدہ یا یونٹ مقامی جماعت کو قرار دیا گیا اور یہ ضروری قرار پایا کہ مقامی جماعتیں ہفتہ وار اجتماعات کر کے ان میں اجتماعی طور پر قرآن و حدیث کا مطالعہ کریں، پچھلے کاموں کی رپورٹیں جمع کریں اور آیندہ کے لیے نقشۂ کار طے کریں، نیز مرکز سے شائع ہونے والے نئے لٹریچر (خصوصاً ماہنامہ ترجمان القرآن کی

تازہ اشاعت ) اور نیز وہاں سے آنے والی ہدایات اور اطلاعات کو اجتماع میں پیش کرکے ان پر غور کریں۔ علاوہ ازیں مقامی کام کے سلسلے میں جو مشکلات، رکاوٹیں اور مخالفتیں پیش آئیں اُن کا باہمی مشورے سے حل سوچیں یا مرکز یا بالاتر نظام حلقہ سے رہنمائی لیں۔

یہ مقامی تنظیموں اور ان کے ہفتہ وار اجتماعات کا نظام، دینی کام کے سلسلے میں گویا اوّلین تجربہ تھا اور کارِ دعوت کی اس تکنیک کو اختیار کیا گیا جو دُنیا کے جدید ترین تجربات کے لحاظ سے نہایت موثر تھی۔

(۸) جماعت اسلامی کا یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ جماعت کی دعوت و تنظیم کا سارا کام اپنے اندر ہی کے چندوں سے چلایا جائے اور باہر سے چندہ حاصل کرنے کی کوشش اپنی طرف سے نہ کی جائے، ہاں اگر عقیدہ و نصب العین سے اتفاق اور جماعت پر اعتماد کرنے والے اصحاب بے لوث اور بے ریا طریق سے اس دینی مہم میں حصہ لینا چاہیں تو اس کے لیے دروازے بند نہ کیے جائیں۔ چنانچہ اللہ کے فضل سے آج تک جماعت کے لوگوں میں چندہ بازی اور چندہ خوری کی بیماری نہیں پائی گئی۔ صرف خدمتِ خلق یا دوسرے اہم قومی کاموں (مثلاً جہادِ کشمیر یا مہاجرین افغانستان کی امداد وغیرہ) کے لیے اگر عام لوگوں سے امانتیں لی گئیں تو رسید پرچے اور حساب کتاب کا کڑا نظم برسرِ عمل رہا اور وقتاً فوقتاً ایسے کاموں کے آمد و خرچ کے حسابات شائع کر دیے جاتے رہے۔ خدا کا کرم ہے کہ آج تک جماعت اور اس کے کارکنوں پر ان امانتی رقوم کے متعلق کوئی الزام عاید نہیں ہوا۔ پوری قوم حتیٰ کہ اختلاف کرنے والے لوگ بھی اس پہلو سے اعتماد کرتے ہیں۔

جماعت کے مالی بوجھ کو اُٹھانے کی ذمہ داری اس کے ارکان اور ہمدردوں اور متفقین پر پڑی تو ان میں انفاق فی سبیل اللہ کے جذبات اُبھرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے کہ جماعت کا کبھی کوئی کام مالی وجوہ سے نہ رکا، نہ خراب ہوا۔

(۹) جماعت اسلامی نے اپنے لیے ایک غیر مصنوعی نظامِ تربیت قرآن و سنت

کی روشنی میں اختیار کیا جس کے چند پہلو یہ تھے: تربیت بذریعہ لٹریچر، تربیت بذریعہ مطالعۂ قرآن وحدیث، تربیت بذریعہ اجتماعات، تربیت بذریعہ توسیع دعوت، تربیت بذریعہ کش مکش۔ اس نظامِ تربیت کو مضبوط بنانے کے لیے تربیت گاہوں کا ایک نظام شروع کیا گیا جو آج تک جاری ہے۔

(۱۰) جماعت کے نئے فکری انداز اور اس کے خاص نظامِ تربیت کی بعض برکات بالکل آغاز سے نمودار ہونے لگیں۔ مثلاً ایک یہ کہ اجتماعات اور جماعتی کاموں میں پابندیٔ وقت کو بڑے اہتمام سے اختیار کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس دور میں کسی مقررہ وقتِ حاضری سے تاخیر ہو جاتی تھی تو احساسِ گناہ پیدا ہوتا تھا کہ ہم نے نظمِ جماعت کا حق ادا نہیں کیا۔ اس طرح ایک امتیازی خوبی یہ اُبھری کہ جماعت کے اجتماعات میں بڑی سنجیدگی اور بڑا نظم وضبط پیدا ہوا۔ خصوصاً پچھلے دور میں مسلمان واعظوں اور لیڈروں نے بگٹٹ تقریروں کا جو اسلوب پیدا کر دیا تھا جماعت نے اسے توڑ دیا۔ اس کے بجائے تقریریں اس انداز سے کی جانے لگیں کہ اوّل تو مقررہ موضوع خطیب کے سامنے رہے اور ادھر اُدھر نہ گھومے، دوسرے محض لذّتِ تقریر بڑھانے کے لیے لطائف اور قصّے کہانیاں بیان نہ کرے بلکہ سامعین کی پوری توجہ کو اپنے اصل حرفِ مدعا پر مرتکز کرائے؛ چنانچہ مولانا مودودی تو اس معاملے میں ایک معیاری مقام رکھتے تھے، دوسرے مقررین نے بھی اس طریقے کو اختیار کیا کہ پیشِ نظر تقریر کے تمام اجزاء کو اس طرح ذہن میں پہلے سے مرتب کر لیتے جیسے ایک مضمون نگار کرتا ہے۔ پھر باری باری ایک ایک جزو پر تسلسل سے گفتگو کرتے۔ آہستہ آہستہ قوم اس طرزِ خطاب کی ایسی عادی ہوئی کہ دو دو گھنٹے کی تقاریر ۵۰، ۵۰ ہزار اور ۲، ۲ لاکھ کے مجمعے خاموشی اور سکون سے سُنتے، جبکہ نہ نعرے بلند ہوتے، نہ لطیفے سُنائے جاتے، نہ ترنم سے کوئی مقرر شعر الاپتا۔ پھر تقریروں میں مصنوعی جذباتیت اور جوشیلے پن سے گریز کیا جاتا اور مخالفین کے لیے بھی کبھی غیر شائستہ زبان استعمال نہ کی جاتی۔ ہمارے کتنے ہی رفیق

ایسے ہوں گے جو گھر سے چلنے سے پہلے تقریر کے اہم حصوں کے لیے مطلوبہ الفاظ تک کا ایک دھندلا تصور قائم کر لیتے۔ اس معاملے میں جماعت کا رویہ یہ تھا کہ دوسروں سے اثر لینے کے بجائے دوسروں پر اپنے انداز کا اثر ڈالا جائے۔

(۱۱) اس جماعت کے قیام سے پہلے بھی دعوتِ اقامتِ دین کے زیرِ اثر بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں واضح طور پہ انقلاب نمودار ہوا۔ بہت سے لوگوں نے حرام کی آمیزش کی وجہ سے اپنی آمدنیاں چھوڑ دیں، اپنے کاروبار یا ملازمتیں ترک کر دیں، کئی حضرات نے اپنی جائیدادیں مستحقین میں تقسیم کر دیں، بعض حضرات نے ناجائز طور پر حاصل کردہ املاک اصل مالکوں کو واپس کر دیں، سود کی آمدنی سے دستبرداری اختیار کر لی، دنیوی جھگڑے خود ختم کر دیے، کسی پر زیادتی کی تو معافی مانگ لی، یہاں تک کہ پردے سے ناآشنا خواتین نے برقعے اوڑھ لیے۔ لوگوں نے تصاویر سے اجتناب کر لیا، موسیقی کے شائقین نے سازوں کے ساتھ گانا سننا ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔ خود مولانا مودودی اس تبدیلی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"سب سے بڑی چیز جو ہمارے نزدیک ہر دوسرے نتیجے سے زیادہ قیمتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دعوت کا اثر جہاں جہاں بھی پہنچا ہے، اُس نے مردہ ضمیروں کو زندہ اور سوئے ہوئے ضمیروں کو بیدار کر دیا ہے۔ اس کی اوّلین تاثیر یہ ہوئی ہے کہ نفس اپنا محاسبہ کرنے لگے ہیں۔ حلال اور حرام، پاک اور ناپاک، حق اور ناحق کی تمیز پہلے کی محدود مذہبیت کی بہ نسبت اب بہت زیادہ وسیع پیمانے پر زندگی کے تمام مسائل میں شروع ہو گئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ پہلے جو دینی حس اتنی کند ہو چکی تھی کہ بڑی بڑی چیزیں بھی نہ کھٹکتی تھیں، اب وہ اتنی تیز ہو گئی ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی کھٹکنے لگی ہیں۔ ۔ ۔ خیالات کی پراگندگی دور ہو رہی ہے، فضول اور دُور از کار دلچسپیوں سے دل خود ہٹ رہے ہیں، زندگی کے حقیقی اور اہم تر مسائل مرکزِ توجہ

بن رہتے ہیں ۔ ۔ ۔ "

حقیقت یہ ہے کہ کسی عقیدہ و دین کو قبول کرنے والوں کے فکر و عمل میں اسی طرح تبدیلی آیا کرتی ہے۔ اگر دینِ اسلام سے تعلق قائم ہونے کے باوجود کسی شخص کی عادات، دوستیوں دشمنیوں اور آمد و خرچ میں کوئی تغیر نہ آئے یا ایک دعوتِ حق دینے والے کی دعوت اسے قبول کرنے والوں میں تبدیلی کا یہ عمل پیدا نہ کر دکھائے تو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ یا دین کے شعور میں فرق آگیا ہے، یا اس کے لیے ویسی محبت و فداکاری نہیں رہی جس کا تقاضا وہ کرتا ہے۔ لوگ اگر دعوتِ اسلامی کو پھیلاتے یا قبول کرتے ہوئے اپنے اموال، احوال اور اعمال میں حالتِ جمود دیکھیں تو اُن کو اِس خطرے کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے کہ کہیں نہ کہیں کوئی خرابی ہے۔ شعوری ایمان لانے والا مسلمان غلط کاموں کے لیے جواز کی راہیں نہیں ڈھونڈا کرتا اور متضاد چیزوں میں جوڑ لگانے کے تجربے نہیں کیا کرتا۔ جماعتِ اسلامی زندگی پر چھائے ہوئے تضادات ہی کو تو ختم کرنے کے لیے اُٹھی ہے۔

(۱۲) جماعتِ اسلامی میں ابتدا ہی سے اس امر کا اہتمام کیا گیا کہ دینی تعلیم یافتہ علماء اور ان کے متاثرین کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ عناصر کو مل کر چلنا ہے، اور دونوں ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوں گے، اور دو طرفہ صلاحیتوں کے جمع ہونے ہی سے معاشرے میں وہ نئی قوت اُبھر سکتی ہے جو کثیر التعداد لوگوں کا اطمینان حاصل کر سکے؛ چنانچہ یہ اللہ کا فضل ہوا کہ ہمارے حلقے میں دونوں اطراف سے آنے والے عناصر بالکل ہم آہنگ ہو کر چلے ہیں اور ایک دوسرے کے محب اور معاون رہے ہیں۔ ہمارے حلقوں میں جدید اور قدیم کا کبھی کوئی افتراق پیدا نہیں ہوا۔ یہ حکمتِ عملی آج تک کام کر رہی ہے کہ ہر دو دائروں کے اصحاب کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں بلکہ ملک و قوم میں دین کے مستقبل کے لیے نہایت درجہ اہمیت رکھتی ہے۔

(۱۳) اس جماعت کو شروع ہی میں ایک اشارہ یہ دے دیا گیا تھا کہ سرِدست یہی

کچھ ہمارا پروگرام ہے، آگے جیسے جیسے حالات ہوں گے کام کی نئی راہیں نکلتی رہیں گی۔ اس اشارے میں جماعت کو ذہنی و فکری تحجر سے بچایا اور وہ بعد کے بدلتے حالات میں مجتہدانہ حکمت سے نت نئی ذمہ داریوں کو سمجھنے کے قابل ہو گئی اور طریق کار یا میدانِ عمل میں جس تبدیلی کی ضرورت پیش آئی، کتاب و سنت کی حدود میں رہتے ہوئے کشادہ دلی سے اختیار کر لی گئی۔ ورنہ اگر کہیں جماعت تدبیروں اور طریقہائے کار اور نو بنو پیش آمدہ احوال سے عہدہ برا ہونے کے نئے نقشوں کے معاملے میں بند ذہن رکھتی تو سارا کام کسی بھی مرحلے میں پراگندہ ہو جاتا۔ مثلاً اگر اصولی انقلاب کی اس راہ پر مولانا مودودی قائم رہتے تو وہ آخر کیوں کانگریس کی متحدہ وطنی قومیت کے خلاف معرکہ آرا ہوتے، یا پاکستان بننے پر اگر یہاں سیکولر دستور بن رہا ہوتا تو کیوں اُس میں مخل ہونے کی فکر کرتے، یا مصائب کے موقعوں پر خدمتِ خلق کی مہمات کیوں کی جاتیں۔ لیڈر اور کارکن یہ سوچتے کہ ہمارا کام تو اسلامی انقلاب برپا کر کے حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے، ہم بیچ میں آنے والے حوادث پر کیوں توجہ دیں؟ مگر خدا کا کرم تھا کہ اُس نے جہاں جماعت کو اصول و مقصد کا شعور اور اس کے لیے والہانہ محبت دی وہاں نت نئے احوال و ظروف سے پیدا ہونے والے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی بھی بصیرت عطا کی۔

(۱۴) ہر رکن کو اس امر کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا کہ وہ جماعت کے نصب العین، اس کے دستور، اس کے اخلاقی معیار اور اس کے طے شدہ طریق کار کا محافظ ہو گا اور اگر کبھی کوئی فرد یا گروہ یا لیڈر جماعت کو اس کے مقررہ راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے یا عام فضا میں خلل آئے تو وہ ہر بگاڑ کے خلاف جماعت کو بچانے کی پوری کوشش کرے گا۔

(۱۵) جماعتِ اسلامی کی امارت اور نظم کے متعلق پہلے ہی اجتماع کے موقع پر شرکاء کو آگاہ کر دیا گیا تھا کہ نہ اس جماعت کی نوعیت عام سیاسی جماعتوں کی طرح کی ہے اور نہ اس کی امارت و قیادت کا معاملہ معمولی نوعیت کا ہے۔ جہاں اس

جماعت میں شریک ہونے والوں کو اس شعور سے اس میں آنا چاہیے کہ منہاجِ کتاب و سُنت پر اقامتِ دین کا کام کرنے والی ایک جماعت ہے، وہاں اس کے امیر کی اطاعت، اس سے محبت، اس کی خیرخواہی سچے دینی جذبے سے کرنی چاہیے۔ امیر سے تعلق میں اگر فرق آئے گا تو یہ دینی نقطۂ نظر سے ایک طرح کی معصیت ہوگی۔

مَیں سمجھتا ہوں ان پندرہ نکات کی روشنی میں جماعت اسلامی کے امتیازی وجود اور اس کے مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے اور اس کے امیر، اس کے ذمہ داروں، اس کے ارکان اور اس کے حامی کارکن اپنے بارے میں اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو کس روش پر چلنا ہے، نیز اُن کو ایسے تمام اعتراضات کے جواب مل جائیں گے جن سے مختلف مراحل میں اُنھیں سامنا کرنا پڑا ہے۔

یہاں جماعتِ اسلامی کی پوری تاریخ بیان کرنا مدِ نظر نہیں بلکہ جماعت کی تشکیل کے پسِ منظر اور اس کے اعتقادی، مقصدی اور تنظیمی خدوخال کے پسِ منظر میں مولانا مودودیؒ کے طرزِ فکر اور ان کی شخصیت کی ساخت کو سمجھنا مطلوب ہے۔

---

# موجِ نور و نگہت

مولانا کی خدمت میں ہوں تو وقت کا کوئی بھی لمحہ ہو، ہر دم بہ صد مسرت یہی احساس ہوتا ہے کہ "یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا" یہ کچھ "گلہائے ناز" اور کچھ گلہائے راز" ہر ناز ایک راز، اور ہر راز ایک ناز!

کیوں نہ ہو، وہ لمحہ بھی شاید قدرت کے چمنستانِ تخلیق یا خیابانِ تکوین میں شگفتنِ گلہائے ناز کا لمحہ ہوگا جب مولانا مودودی (رحمہ اللہ) نے اس دنیا میں پہلی سانس لی ہوگی۔ مولانا کی پوری شخصیت کا اجمالی بیان صرف اتنا ہے کہ وہ کمالِ شعور اور شدتِ احساس کے باوجود زندگی کی وادیٔ کرب والم سے گزرنے والی ایک موجِ نور و نکہت تھی جو موتی اور پھول برساتی گزر گئی۔ ان کے افکار اور ان کی دلیلیں موتیوں جیسی تھیں اور ان کے مزاحیہ جملے پھولوں کی مانند تھے۔

کچھ لوگوں نے ان موتیوں اور پھولوں سے دامن بھر لیے کچھ نے موتیوں پر پتھر برسائے اور پھولوں پر انگارے پھینکے۔ اپنی اپنی نگاہ، اپنا اپنا نصیب!

---

غالباً پہلا آدمی میں تھا جس نے تحریری طور پہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شگفتہ مزاجی کی ایک ہلکی سی جھلک اپنی کتاب "مولانا مودودی، ایک تعارف"[1] (شائع شدہ: ۱۹۶۳ء) میں پیش کی تھی۔ پھر ہر لکھنے والے نے اس موضوع پر لکھا، اور کئی لکھنے والے مجھ سے آگے نکل گئے، مگر ابتدا کو تو آگے پیچھے نہیں کیا جا سکتا، انتہا کی سرحد اور بھی آگے بڑھائی جا سکتی ہے، یعنی ابتدا معلوم، انتہا نامعلوم! کہ

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت

---

[1] وہی کتاب جس کا تازہ ایڈیشن آپ کے ہاتھ میں ہے۔

مولانا مودودی کا مسلک ہر معاملے میں اعتدالی تھا اور بالعموم انتہا پسندی سے بچ کر ترازو کے پلڑے برابر رکھتے۔ وہ نہ "مقطع" تھے، نہ "ہنسوڑ"۔ ایسا نہ تھا کہ مولانا کی محفل میں زور شور سے قہقہے لگ رہے ہوں، لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے ہوں اور مسلسل ظرافت کا ایک طوفان برپا رہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی نہ تھا کہ مولانا خشونت کا ایک پیکر بنے تقویٰ جھاڑ رہے ہوں اور حاضرین سر جھکائے منہ بسورے رہے ہوں۔ ایک طرف دعوت و تحریک سے پیدا ہونے والے معاملات و مسائل کی پیچیدگی اگر سنجیدہ تفکر کا تقاضا کرتی تو دوسری طرف سید مودودی سنجیدگی کے بوجھ سے ساتھیوں کو بچانے کے لیے لطافتِ بیان سے کام لیتے۔ اُن کا میدان تضحیک و استہزا نہ تھا جس کے پیچھے کبر میں ڈھلا ہوا احساس کمتری کام کرتا ہے۔ نفرت و تحقیر کو ان کے دل میں جگہ نہ مل سکی۔ اُنھوں نے کبھی مہارتِ تکلم کا نشانہ بنا کر کسی کی دل آزاری نہیں کی، کسی کی کمزوریوں کا خاکہ نہیں اڑایا۔

وہ مزاح نگار بھی نہ تھے کہ سوچ سوچ کر مزاحیہ مضمون اور عبارتیں تخلیق کرتے۔ ہنسنے ہنسانے کا فن ان کے ذہن پہ سوار نہیں تھا کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے لطیفہ دار واقعات کو بہم کریں اور پھر ایک کاریگر کی طرح اُنھیں لفظوں میں جوڑ جاڑ کر اس طرح لائیں کہ جو پڑھے سُنے، اس کا دل خوش ہو جائے۔ مولانا کے بیان تبسم انگیز کلام میں بھی آپ کو ثقاہت و اخلاق سے گری ہوئی کوئی بات نہ ملے گی۔

بہت سے لوگوں نے "جنسیت" کے مواد سے مزاح گوئی کی ہے اور کئی جگہ تو لکھنے والے بالکل غلاظت کی جھیل میں غوطہ ہی لگا گئے ہیں۔ حُسن کی باتیں ایسی بھونڈی کہ سرے سے حسنِ عبارت، مولانا نے اس جادۂ پامال پر کبھی قدم نہیں رکھا۔

مولانا مودودی لطیفہ گو بھی نہ تھے کہ مطالعہ اور گفتگوؤں سے لطائف جمع کرتے رہتے اور پھر ان کو حسب موقع استعمال فرماتے۔ ہمارے بزرگوں میں سے دو لطیفہ گو بڑے نمایاں تھے۔ ایک ملک نصراللہ خاں عزیز، دوسرے مولانا ماہرالقادری۔

(خدا دونوں کی مغفرت فرمائے) ان دونوں کے ساتھ رہتے ہوئے یا سفر کرتے ہوئے ان کی لطیفہ بیانی سے استفادہ کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا۔ لطف اندوزی کے لیے سامع ہمہ تن متوجہ ہونے کے ساتھ ساتھ برابر منتظر رہتا کہ اب آیا کوئی لطیفہ۔

۱۹۶۴ء کے جیل میں ملک نصراللہ خاں عزیز مرحوم نے ایک مدّت تک ایسے تسلسل سے لطیفہ گوئی کی کہ ہمیشہ وہ دور یاد رہے گا۔ یعنی ناشتے اور دوپہر اور رات کے کھانے کے دسترخوان کی تو ایک مستقل "ڈش" ہی ان کے لطائف کے رس گلّوں یا سموسوں کی ہوتی۔ یاد رہے کہ ملک صاحب نے برسوں مدینہ (بجنور) کا فکاہی کالم لکھا اور پھر لاہور میں اپنے اخبار میں 'سیر و سفر' کے عنوان سے پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اصل موضوع گفتگو یہ تھا کہ مولانا مودودی اس انداز کے لطیفہ گو نہ تھے جو خندہ آفریں واقعات یا گفتگوؤں کی روایت ڈرامائی انداز سے بیان کرکے زعفران پاشی کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اکا دُکا موقعوں پر انھوں نے کسی مروّج لطیفے کی روایت بھی کی ہے۔

وہ گفتگوؤں میں اکثر اور تحریر میں کبھی کبھی بے ساختہ انداز سے لطافت پیدا کر دیتے اور ایسے جملوں کو میں "شگوفے" کہوں گا۔ یہ شگوفے تخلیقی انداز کے ہوتے، جن کی مثالیں غالبؔ کے یہاں ملتی ہیں، مگر مولانا کا رنگ قدرے مختلف ہے۔ مولانا کا مزاح آمیز کلام کسی پُر تکلف انداز کی سوچ بچار کا نتیجہ نہ ہوتا، بلکہ شگوفہ دار بات وہ فی البدیہہ کہتے۔ مولانا کا اندازِ لطافت و مزاح کلام میں اس طرح ہوتا جس طرح آٹے میں نمک، مزاح برائے مزاح ان کا مسلک نہ تھا۔

مولانا مودودی نے اگرچہ کئی جگہ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے بھی لطافتِ کلام پیدا کی ہے مگر یہ ان کا مستقل اسلوب نہیں ہے۔ ان کا اسلوب جہانِ معانی سے زیادہ تعلق رکھتا ہے کئی جگہ دوہرے مفہوم کے جملے آپ نے کہے اور ان سے لطفِ گفتار پیدا کیا۔ مثلاً،

ایک بار بھارت سے آئے ہوئے کچھ سکھ گھومتے گھامتے ۵۔ اے ذیلدار پارک میں بھی آ گئے۔ مولانا مودودی سے ملے۔ مولانا کے یہاں پائیں باغ کے تختہ گیاہ میں کرسیاں بچھی تھیں۔ وہ بیٹھ گئے۔ مولانا نے ان کی تواضع کے لیے "سیون اپ" کی بوتلیں منگوائیں جن کے ساتھ پلاسٹک کی نلکیاں بھی تھیں۔ وہ لوگ حسب قاعدہ نلکیاں بوتلوں میں ڈال کر پانی پینے لگے۔ مولانا کے سامنے بھی سیون اپ کی بوتل رکھی گئی مگر انھوں نے پی نہیں۔ کسی نے توجہ دلائی کہ مولانا آپ نہیں پی رہے ہیں؟ فرمایا:

"بھئی! یہ ٹھنڈا حقہ تو مجھ سے نہیں پیا جا سکتا" سکھ مہمان بھی ہنس دیے۔ تب کوئی صاحب گلاس لائے اور مولانا نے اس میں پانی پیا۔ اب اس چھوٹے سے جملے میں ایک تو تشبیہ دیکھئے، دوسرے سکھوں کی مناسبت سے حقے سے مشابہ چیز سے بھی اجتناب کرنے کا انداز ملاحظہ فرمائیے۔

اس سلسلے میں مولانا کی شگفتہ مزاجی کا ایک نمونہ اور۔ ۔ صدر ایوب صاحب کے آخری دور میں عید رمضان جمعہ کو پڑتی تھی۔ عوامی اوہام میں سے ایک یہ تھا کہ جس دفعہ عید اور جمعہ کے دو خطبے ایک دن جمع ہو جائیں، اُس مرتبہ حاکم بدل جاتا ہے۔ یہ جاہلی تصور ایوانِ صدارت میں بھی پہنچ گیا۔ کچھ ڈر یہ بھی ہوگا کہ اس اجتماعِ سعدین کی وجہ سے سیاسی طور پر رائے عام تبدیلیٔ حاکم کے لیے تیار ہو جائے گی اور خدانخواستہ "نقارہ خدا" نہ بج جائے۔ سو خاص اہتمام سے ایک دن پہلے ہی چاند نکلوایا گیا اور ریڈیو سے سرکاری اعلان ہو گیا کہ عید جمعرات کو ہو گی۔ اُدھر علماء ملک بھر سے شہادتیں تلاش کر رہے تھے۔ مطلع صاف ہونے کے باوجود کہیں سے شہادت نہ مل رہی تھی؛ چنانچہ علماء نے ٹیلیفون پہ پوچھنے والوں کو ملک بھر میں اپنا فتویٰ بتا دیا کہ جمعرات کو روزہ ہوگا اور جمعہ کو عید ہو گی۔ اس سلسلے میں بڑے دلچسپ واقعات ہوئے جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔ یہ البتہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ سرکاری عید کے اعلان سے اختلاف کرنے کے جرم میں مولانا مودودی بشمول

جیل پہنچا دیے گئے تھے۔ چند ہی روز میں رہائی ہو گئی۔

اس عید کے بعد کا قصہ ہے کہ ولیمہ کی کسی دعوت میں مولانا اور چند رفقاء مدعو تھے جس میں راقم بھی شامل تھا۔ اتفاق سے مولانا کھانے سے فارغ ہو کر چلے تو میں بھی ساتھ تھا۔ دوسرے کمرے میں قدم رکھتے ہی شیخ خورشید احمد مرحوم (وزیر) بالکل دروازے کے پاس بیٹھے تھے۔ مولانا سامنے ہوئے تو انھوں نے احتراماً اُٹھ کر مصافحہ کیا اور بڑی پھرتی سے طنزاً کہا۔ "مولانا! گذشتہ عید مبارک!"

مولانا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا "مبارک باد اگر جمعرات کی عید کی ہے تو سیدھی ایوب خاں صاحب کو بھجوا دیجیے اور اگر علماء والی عید مراد ہے تو قبول!"

اُس دن میں حیران رہ گیا کہ ایک شخص بالکل بے دھیانی میں چلا آ رہا ہے اور اچانک ایک فقرہ اس کے دماغ میں ٹکراتا ہے مگر دماغی عمل کی اس سرعت کی کیا مثال کہ نہ صرف فقرے کا جواب دیا بلکہ اس مختصر جواب میں دین و سیاست کے اشارات بھی آ گئے۔

مولانا کے اس لطیف مزاح یا شگفتہ مزاجی کا اثر یہ ہوتا کہ دلوں کے بوجھ اتر جاتے، پریشانیوں کے بادل چھٹ جاتے، مایوسیاں کافور ہو جاتیں، غافل آدمی چونک کر متوجہ ہو جاتا، کارکنوں کے عزم و ہمت میں اضافہ ہو جاتا۔

جب لوگ یہ دیکھتے کہ آلام و مصائب اور اعتراضات والزامات سے گزرتا ہوا یہ شخص کبھی چیں بجبیں نہیں ہوتا، کبھی غصے میں اس کا ذہن زیر و زبر نہیں ہوتا، اُلٹا وہ ہنستا کھیلتا موجہائے حوادث سے گزرتا جاتا ہے تو ساتھیوں کے دلوں سے غم اور مایوسی کا دباؤ ہٹ جاتا اور نوجوان قریب ہو جاتے۔

مولانا کی شگفتہ مزاجی کا اثر ایسے ہوتا کہ ان کے لیے دلوں کے کواڑ کھل جاتے اور وہ بڑی آہستگی اور خاموشی سے لوگوں کے عالمِ باطن میں داخل ہو جاتے۔ ٹھیک اس طرح جیسے آپ کی خواب گاہ کے کسی دریچے کی درز سے صبح کی پہلی کرن

سبک سبک انداز میں داخل ہوتی ہے جب کہ اس میں نہ تپش ہوتی ہے نہ چبھن،
..... محض آسودگی بخش روشنی کی ایک لکیر!

مولانا مودودی کی شگفتہ مزاجی بس ایسی ہی روشنی کی لکیریں بناتی رہی اور
یہ لکیریں کتنے انسانوں کی قسمت کی لکیریں بنتی رہتیں۔

(اخذ و اقتباس از تقریظ بر کتاب "سید مودودی کی شگفتہ مزاجی")

# سوچ آن کر دیا

مسلمانوں کے اندر انقلابی جذبے کی بیداری اور ان کے موجودہ تحریکی توجہ کو پیدا کرنے میں بہت سی ہستیوں کا حصہ ہے۔ ان ہی ہستیوں میں سے ایک وہ شخص تھا جس نے اپنی شعوری زندگی کی ہر گھڑی اور قوت کی ہر رمق اسی مقصد میں صرف کر دی۔

اِدھر وہ ہم سے جدا ہوا، اُدھر تیرہ سو ننانوے سال ہجری ختم ہوا اور چودھویں صدی اپنے اختتامی سال میں داخل ہو گئی۔

وہ تھا ساداتِ چشت کا چشم و چراغ اور خواجہ مودودؒ چشتی کے سلسلۂ اخلاف کا گُل تاباں، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ!

یہ کوئی گمنام شخص نہ تھا کہ آج اس کا تعارف کرانے کی ضرورت ہو۔ اس کا مقام ایسا ہے کہ آپ اگر جنوبی کوریا یا کینیا یا ڈنمارک کی کسی بھی جگہ چلے جائیں تو کچھ لوگ ایسے ضرور ملیں گے جو آپ کو پاکستانی دیکھ کر اولیں سوال یہ کریں گے کہ مولانا مودودی کی کوئی بات کرو۔ اور ٹوکیو سے کیلیفورنیا تک زمین کے ایک خطِ طول بلد کے دائیں یا بائیں یا خطِ عرض بلد کے اُوپر یا نیچے کوئی اہم آبادی ایسی نہ ملے گی جہاں مولانا مودودی کا لٹریچر کسی نہ کسی زبان میں موجود نہ ہو۔

وسیع لٹریچر، تفسیر، جماعتی تنظیم، نوجوانوں کی تحریک، بین الاقوامی دعوت اور شہرت و کردار کے پیچھے جھانک کر جب میں نے غور سے دیکھ کر سارے احوال کا تجزیہ کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مولانا مودودی نے درحقیقت بالکل ایک چھوٹا سا کام کیا ہے۔ مگر ایسا چھوٹا سا کام جس کے لیے ہمیشہ کسی مردِ عظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ چھوٹا سا کام کیا تھا جو مولانا مودودیؒ نے انجام دیا۔

کتنا چھوٹا سا کام ہے کہ آپ بجلی کے ایک بٹن کو انگلی سے ذرا سی جنبش دیتے ہیں تو سارا کمرہ یا صحن یا راستہ روشن ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کام تھا جو مولانا مودودیؒ نے

کیا۔ بجلی گھر موجود تھا، وائرنگ تھی، لائنوں کی فٹنگ تھی، مگر بٹن "آن" نہیں ہوا کرتا تھا۔ بس لوگ چراغ جلا کر کام چلاتے۔ سوچ بورڈ کی حفاظت کے لیے اس پر باکس لگا دیا گیا تھا، تالہ ڈالا ہوا تھا اور چابی کسی کے پاس تھی نہیں، وہ گم ہو چکی تھی، پھر اس تک پہنچنے میں بہت سی رکاوٹیں حائل تھیں۔ کیچڑ، کانٹے، گندگی اور کچھ تختے اور کھونٹے راستے میں نصب تھے۔ جب کوئی ادھر کا رخ بھی کرتا تو کیا رند کیا شیخ سب اٹھ کھڑے ہوتے اور شور مچا دیتے۔ ایں، ایں، دیکھیے صاحب، کچھ خدا کا خوف کیجیے، ادھر نہ جائیے، اُدھر بجلی کے سوچ ہیں، انھیں چھیڑا تو کرنٹ سارے کمرے میں پھیل جائے گا۔ بجلی سب کچھ بھسم کر دے گی، یہ ہو جائے گا اور وہ ہو جائے گا۔

مولانا مودودیؒ نے ان تمام محافظوں اور مخالفوں کے شور، ان کی گالیوں، ان کے فتووں، ان کے پروپیگنڈے اور ان کی دھمکیوں کی پروا کیے بغیر کیچڑ اور کانٹوں میں قدم رکھ دیے۔ کفِ پا نے اپنا سینہ کانٹوں کیلئے کھول دیا، ہاتھ زخمی کر کے رکاوٹوں کو ہٹایا اور سوچ بکس تک جا پہنچے۔ آواز آئی "صاحب تالا لگا ہے، چابی نہیں ہے۔" مگر مولانا مودودی نے نئی اصطلاحات کی چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور تالا کھول دیا۔ سوچ پر ہاتھ رکھا اور ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔

آیئے، ذرا استعارے کی گرہ کھول کر سادہ طریق سے سمجھیں۔ مولانا مودودی کی بنیادی دعوت مسلمانوں کے لیے بس یہ تھی کہ تضاد ختم کرو۔ اسلام پر ایمان کا دعویٰ ہے تو اس پر چلو، نہیں چلنا ہے تو پھر نہ خود مغالطے میں رہو، نہ دوسروں کو مغالطے میں ڈالو۔ قول و فعل کا تضاد ہو یا عقیدے اور کردار کا تضاد، یا انفرادی مسلمانی اور اجتماعیت بلا اسلام کا تضاد، مسجد کی زندگی اور مسجد سے باہر کی زندگی کا تضاد، صحت مند زندگی کے لیے اس مہلک بیماری سے نجات ضروری ہے اور تضادات کو ختم کیے بغیر نہ دنیوی قوت و ترقی کا حصول ممکن ہے نہ دینی فلاح و سعادت کا!

مولانا مودودیؒ کے کام کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے جامد مذہبیت کی یخ کو پہلے پگھلایا اور پھر اسے سیلِ رواں میں بدل دیا۔ دوسرے لفظوں میں انفرادی مذہب داری

کو انقلابی تحریک کی شکل دے دی۔

اُنھوں نے جب پہلے پہل واعظانہ تبلیغ کی جگہ سعی وجہد کے الفاظ استعمال کیے، دین کو نظامِ حیات اقامتِ دین کی سعی کو تحریک ملتِ اسلامیہ کو انقلابی پارٹی اور سچی مسلم حکومت کو اسلامی اسٹیٹ قرار دیا تو ان اصطلاحات کی وجہ سے ذہنی زلزلوں کی کئی لہریں تا دیر اُٹھتی رہیں۔

لوگ بھنائے پٹپٹائے مگر جامد یخ کے مقابلے میں سیلِ رواں کی قوت کا مشاہدہ کرنے والی بے شمار مخلوق میں سے بہت سے لوگ یہ ماننے پر مجبور تھے کہ پہلی حالت درست نہیں، دوسری حالت ہی برحق ہے۔ خاص طور پر نوجوان عناصر جو حالتِ یخ سے بھاگ کر دنیا کے مختلف نظریات کی حرکی قوت کی طرف کھنچتے تھے اُنھوں نے جب اسلامی تصورِ حیات کو انقلابی حرکت کے ایک اُمڈتے ہوئے دریا کی صورت میں دیکھا تو وہ اغیار کی طرف بھاگنے کے بجائے اسلام کے انقلابی تصورات کی لہروں میں کود کر خود بھی تغیّر کی لہر بن گئے۔ اُنھوں نے پہلی دفعہ اسلام کے جلال وجمال کو دیکھا جس کے سامنے تضادات نے گرد وغبار کی کئی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں۔ آخر یہ ہوا کہ آج ہر وزیر اسلامی نظام اور ہر واعظ اسلامی تحریکِ انقلاب کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے، مگر بہت سے لوگ اب بھی اس بات پر ناراض ہیں کہ کیوں مولانا مودودی نے زمانے کی ضروریات کے مطابق ایک تازہ تعبیرِ دین پیش کی ہے۔ حالانکہ دین کی یہ تعبیر اتنی پرانی تھی کہ لوگ اس سے دور رہتے رہتے اسے پہچاننے کے قابل نہ رہے تھے۔

مولانا مودودی تنہا نہ تھے، بلکہ ایک ہی وقت میں دنیائے اسلام میں جابجا اس طرز کی اسلامی تحریکات اُٹھنے لگیں جیسی مولانا مودودیؒ نے برپا کی تھی۔ مصر میں شیخ حسن البنا اور ترکیہ میں احمد سعید نورسی میدان میں نمودار ہوئے۔ اُدھر ایران میں قم کے علماء نے جبری بادشاہت کے زیرِ تسلط ایک خفیہ تحریک شروع کی جو آج امام خمینی کی سربراہی میں سطح پر آگئی ہے۔ چار اطراف سے اُٹھنے والی اِن یک رنگ تحریکوں

کے اثرات عرب اور افریقی ممالک میں ملائشیا اور انڈونیشیا میں بھارت، لنکا، نیپال اور بنگلہ دیش میں، نیز یورپ، برطانیہ، امریکہ اور جاپان میں اسلامی قوتوں کو متحرک کرنے کا سبب بن گئے۔ جگہ جگہ حسب ضرورت فکری اور سیاسی قیادتیں بھی نمودار ہو گئیں اور کیفیت یہ ہو گئی کہ ؎

ہے ایک ہی نغمہ، کہیں اُونچا، کہیں مدھم

اسلام کے اس وسیع تحریکی عمل کا اصل مظاہرہ پندرھویں صدی میں ہوگا۔ احیائے اسلام کا جذبہ اب بلوغ کو پہنچ چکا ہے۔ کہیں کہیں انقلاب کے تجرباتی اقدام ہو رہے ہیں۔

وقت گزرتا ہے۔ تارے ٹمٹماتے اور کھو جاتے ہیں۔ موسموں کا ادل بدل ہوتا ہے۔ شعاعیں آفاق میں دوڑتی پھیلتی ہیں، کشش اور حرارت وجود کے سمندر میں مدوجزر پیدا کرتی ہیں۔ بہار و خزاں کی دوڑ لگی ہے، مگر جمادی، نباتاتی بلکہ حیوانی دنیا میں معمول کے جتنے واقعات اور معمول کے خلاف جتنے حوادث رونما ہوتے ہیں، ان کی ترتیب زمانی (Chronology) تو ہوتی ہے مگر وہ بھی صرف ذی شعور موجودات کے لیے، ان واقعات و حوادث سے "تاریخ" نہیں بنتی۔ موجودات سے کسی کی کوئی سوانح عمری مرتب نہیں ہوتی اور نہ سیرت!

تاریخ اور سوانح و سیرت کا ظہور انسان کی کش مکش خیر و شر سے ہوتا ہے۔ انسان جب سچ اور جھوٹ، اچھائی اور برائی، انصاف اور ظلم، عفت اور بے حیائی، دیانت اور خیانت، پاسِ عہد اور وعدہ شکنی، کے محاذوں سے دوسرے انسانوں کے خلاف لڑتا ہے تو اس کا جنگ نامہ حیات تاریخ کہلاتا ہے اور انسان دونوں محاذوں کے جنگ باز ہوتے ہیں۔ کچھ انسانیت کی خیر و فلاح کے لیے لڑتے ہیں کچھ انسانیت کے لیے شر و فساد کا ہنگامہ اٹھاتے ہیں۔

رزمِ خیر و شر کا آغاز تو روزِ اول ہی ہو گیا۔ جب آدمؑ کے خلاف ابلیس چیلنج لے کر میدان میں آ گیا۔ پھر ان دونوں قوتوں کو قدرت نے ارضی اکھاڑے میں بھیج دیا۔ جب سے اب تک کچھ انسان خلافتِ آدمؑ کے شعور سے اور کچھ بغاوتِ ابلیس کے اندھے جذبے

سے باہم آویز رہے ہیں۔

اس معرکۂ خیر و شر کو گرم رکھنے کا سہرا اصلاً انبیا علیہم السلام کے سر ہے۔ جو آدمؑ کے احساسِ عبدیت، اس کی ذمہ داریٔ خلافت، اسکے جذبۂ توبہ و انابت اور اس کی علمبرداریٔ ہدایت کے وارث ہوئے۔ خدا نے شرائع میں تبدیلیاں کیں، مگر دین اوّل روز سے ایک ہی تھا اور تمام انبیا و رسل علیہم السلام اسی دین کا بار بار احیا کرتے رہے اور بار بار ابلیسیت کو انھوں نے دعوتِ مبارزت دی۔ پھر انبیاء کے پیروکار صلحاء، مجددین اور ربّانی بھی کارِ تجدیدِ دین اور سعیٔ اقامتِ حق کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دینِ حق کی عالمگیر صبح نمودار ہوئی اور اُفق تا اُفق اُجالا پھیل گیا۔ اس صبح کی پہلی چمک غارِ حرا سے ظاہر ہوئی۔ اس کا سورج کوہِ صفا سے اُبھرا۔ اس کا وقتِ اشراق بدر کے میدان میں سامنے آیا مگر اس کی ساعتِ چاشت فتح مکہ کے وقت چھا گئی۔ ابلیسیت پر اس سے زیادہ بُرا وقت اتنے بڑے پیمانے پر نہ آیا تھا ——— جاہلیت کے کُشتوں کے پشتے لگتے چلے گئے۔ یہ تھا حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ۔ پھر خلافتِ راشدہ کے دور میں خدا پرستانہ تہذیب کے علمبردار چاروں طرف بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ خلافتِ راشدہ کے بعد حقیقی نظام میں دراڑیں پڑ جانے کے باوجود پچھلے دورِ زریں کی دی ہوئی قوت کے بل پر مسلم قوت نے اتنا فروغ حاصل کیا کہ اس وقت کے متمدن و معروف انسانی دنیا کے بڑے حصے میں دینِ ہدایت چھا گیا اور طاغوتی قوتوں کے لیے سر چھپانا مشکل ہو گیا۔

بلاشبہ شیطانی قوتوں نے ملتِ اسلامیہ میں طرح طرح کے بگاڑ پیدا کیے۔ ان کو داخلی تصادموں کا شکار بنایا۔ ان کی وحدت کو ختم کرنے کے لیے ان کے اندر سے فرقے اُٹھا کھڑے کیے۔ خود ان کے آدمیوں کے ذریعے ہی عجمی ثقافت، یونانی فلسفہ، ہندی تصوف اور آخر میں مغربی تہذیب کو نفوذ و غلبہ دلوایا، مگر یہ بات ہمارے لیے قابلِ فخر ہے کہ خرابی کے دور میں مسلمانوں کے اندر سے بار بار ایسے افراد، ایسی جماعتیں اور ایسے ادارے نمودار ہوئے جنھوں نے وقت کے جاہلی اور باطل کا قلع قمع کرکے

دینِ حق کا چہرہ از سرِ نو نکھار دیا۔ ہمارے پاس ایسی زریں مثالیں ہیں کہ انتہائی شدید نظامِ جبریت کی تلواروں کے سائے میں تن تنہا ایک شخصیت اٹھتی ہے اور پوری بے باکی سے تنقید کر کے حق کے تقاضوں کو واضح کرتی ہے۔ ایسی ہستیوں نے کوڑے کھائے اور قیدیں بھگتیں، مگر بالآخر ان کے آوازہ صداقت کے سامنے اقتدار کو جھکنا پڑا۔ ہماری تاریخ کے شدید سے شدید تاریک دور میں ایسے لوگ موجود رہے کہ جن کی ایک نگاہ نے تیرگیوں کے قلعوں کو منہدم کر دکھایا اور گم شدہ روشنی از سرِ نو ابھر آئی۔

یہ ہستیاں اگر نہ ہوتیں تو ہم نہ نظامِ حق کو جان سکتے اور نہ اپنے آپ کو۔ ہم نے ایسے ایسے طوفانوں میں ڈبکیاں کھائی ہیں جن کے گردابوں سے بچ کر نکلنا ممکن نہ ہوتا اگر یہ ہستیاں دستگیری نہ کرتیں اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفینۂ سلامتی پر ہمیں نہ پہنچا دیتیں۔

ایسی ہستیوں کو اصطلاحاً ہمارے ہاں مجدد کہا جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جس نے وقت کی فتنہ انگیز طاغوتی طاقتوں کی پھیلائی ہوئی دھواں دھاری میں سے مسلمان کو باہر نکال کر قرآن کی روشنی میں لا کھڑا کرنے کی سعی اخلاص اور للّٰہیت سے کی، اس کیلئے قربانیاں دیں، تکلیفیں اٹھائیں، وقت کے غلط رو اقتدار سے ٹکر لی، زمانے کے باطل فکری دھارے کے خلاف پیرتے ہوئے جان ہلکان کر دی، وہ کسی نہ کسی درجے کا مجدد تھا۔ کام کی وسعت اور معیار کے لحاظ سے وہ مجدد کامل ہو سکتا ہے، ورنہ صحیح نہج سے تھوڑا بہت تعلیمی، تبلیغی اور اصلاحی کام کرنے والے بھی جزوی مجدد ضرور تھے۔

منصب دو ہی ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو متجدد بنے یعنی وہ جنھوں نے مسلمانوں کو اصلِ دین سے ہٹا کر وقت سے سمجھوتہ کر کے کوئی آسان راستہ نکال لینے کی کوشش کی۔ دوسرا گروہ ان ہستیوں کا ہے جنھوں نے زمانے اور اس کے نظریات و مروجات کو بر طرف رکھ کر اصلِ دین کو صحیح شکل میں واضح کر کے مسلمانوں کو اس کے مطابق چلنے کی تلقین کی۔ ہماری تاریخ کا سارا بگاڑ متجددین کے ہاتھوں ہوا اور خیر و فلاح کی راہ جب بھی نکلی، مجددین کے ہاتھوں نکلی۔

تجدید احیائے دین صرف ہم مسلمانوں ہی کی تاریخ کا عمل ہے اور ہمارا تصورِ ترقی بھی یہ ہے کہ ہم اپنے ہی دین کے بے آمیز اصولوں اور اپنی تہذیب کی درخشاں اقدار کو نئے حالات میں مسخ کرنے کے بجائے اجتہاد سے ان کا انطباق کریں۔

پس مثبت طور پر ہماری تاریخ مجددین کی بنائی ہوئی تاریخ ہے۔ تو پھر کیا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ مجدد تھے؟

جی نہیں! میں یہ نہیں کہوں گا، کیونکہ اڑتالیس چالیس سال کے زمانے میں میں نے "تجدید احیائے دین" کے مؤلف کی طرف سے ایسا دعویٰ نہیں سُنا، بلکہ اسے یہ کہتے سُنا کہ میں ایسے ہر دعوے سے پاک صاف خدا کے سامنے حاضر ہو جاؤں گا۔ مجھے سیدؒ مغفور سے جو محبت ہے وہ اُس خطِ احتیاط سے تجاوز کی اجازت نہیں دیتی جسے سیدؒ نے خود کھینچا اور آخر دم تک اسے عبور نہیں کیا۔

مودودی مجدد تھا یا نہیں تھا، اس کا فیصلہ تو خدا کے ہاں ہونا ہے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے مگر اتنا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو وسیع اور اتھاہ کام سیدؒ مودودی نے کیا وہ ویسا ہی تھا جیسا مجدد کیا کرتے ہیں۔

وہ کام کیا تھا؟

یہ سیدؒ جس بڑے مقصد کے لیے اُٹھا وہ یہ تھا کہ دنیا بھر میں سیکولر مزاج کے مادہ پرست مغربی سامراج کی سیاست و فراست اور اس کے علوم و فنون اور اس کے تمدن و ثقافت کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روک دے، اور اس مقصد کے لیے اس نے قوم اور بالخصوص اس کے نوجوان طبقے کو پکارا اور اسلامی دعوت کا علم بلند کیا۔ پھر ایمان و شعور کے لحاظ سے جو جو لوگ تیار ہوتے گئے ان کا ایک جوابی طوفان مغربی طوفان کا رُخ بدلنے کیلئے اٹھا دیا۔ مولانا مودودیؒ کا مرکزی اور بنیادی کارنامہ یہی ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کو جاگتے ہوئے ایمان اور شعورِ توانا سے آراستہ اور منظم کر کے، اور ہر طرح کی سطحی اور ہنگامہ خیز جذباتیت سے پرہیز کر کے مغربیت کے محاذ سے سیکولرازم، وطنی و نسلی نیشنلزم، ملحدانہ رشنلزم، لادین جمہوریت، کمیونزم اور اسلامی سوشلزم اور اخلاق باختہ ثقافت جیسے

یلغار کرتے ہوئے فتنوں کے خلاف نبرد آزما کر دیا۔

کسی بادشاہ کے ظلم پر صدائے احتجاج بلند کرنا، معاشرے کی کسی ایک متعین خرابی کو دور کرنے کے لیے اصلاحی کام کرنا، کسی گروہ کے اٹھائے ہوئے فکری فتنے کا توڑ کرنا مشکل کام ضرور ہے۔

ہمارے ہاں مغربیت اور مادی تہذیب کے خلاف کچھ متفرق انسدادی اور حفاظتی تدابیر اختیار کی جاتی رہی ہیں، مگر مولانا مودودیؒ نے پہلی بار بتایا کہ دورِ حاضر کے اس تباہ کن طوفان کو روکنے کے لیے ایک جوابی طوفان کی ضرورت ہے' اور پھر انھوں نے وہی جوابی طوفان اٹھانے پر ساری توجہ صرف کر دی کہ اسلام اور مادہ پرستی کی اس جنگ میں جو لوگ حصہ ادا کر سکتے ہوں وہ آگے آئیں۔ لوگ آہستہ آہستہ آئے، مگر دیکھتے دیکھتے وہ وقت آیا کہ جوابی طوفان اُمڈ رہا ہے اور الحادی اور مادہ پرستانہ طوفانی لہروں کو پیچھے دھکیل رہا ہے۔

دراصل مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب کے خلاف اکبر الٰہ آبادی نے کچھ نکتے ایسے اٹھا دیے تھے کہ بعد میں وہ تاریکیوں میں چنگاریوں کی طرح چمکنے لگے۔ پھر اقبال نمودار ہوا جس نے نہ صرف جزیہ جزیہ مغربی فکر، الحادی تمدن و سیاست اور مادہ پرستانہ معاشرت نیز نو آبادیاتی تاخت و تاراج اور صیادیٔ اقوام اور غلام سازی کی فرنگی مہم، اور اس سلسلے میں وحشیانہ جبر، لٹریچر، تعلیم اور مفادات کے ذریعے جو چرکے ملت کے اعتقاد اور اخلاق کو لگائے گئے، اور مسلمانوں کی خودی کو تباہ کرنے، ان کے حجازی نظریۂ جمہوریت کو مضحکہ بنا دینے، ان کی تاریخ کو مسخ کرنے، ان کی حقیقی لیڈرشپ کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے اور ان کے تصورِ قومیت کو بے وزن بنانے کے لیے جو عمل مسلسل جاری رکھا گیا، ان سب حملوں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ پھر اقبال نے متقابلاً اسلام کے اساسی عقائد، روایات و اقدار، تصورِ قومیت، جذبۂ جہاد، نظریۂ قانون و اجتہاد اور تاریخِ اسلام کی ماہیت اور تہذیبِ اسلام کی مخصوص نوعیت پر مثبت خیالات گہرے فلسفیانہ تجزیے اور دردناک شاعرانہ نغموں میں پیش کیے۔ وہ دراصل مغرب کی ملحدانہ و مادہ پرستانہ تہذیب کے خلاف جہانِ فکر و فن میں

جنگ چھیڑ چکا تھا۔ پھر اس نے ضرب کلیم لکھتے ہوئے ساری قوم کو تہذیب حاضر کے خلاف جنگ کے لیے پکارا۔

اقبال کا یہ نہایت وسیع مجددانہ کام مسلمانوں کو ایک جذبۂ عام تو دے گیا اور ایک محدود سے طبقۂ فکر و نظر نے شعوری سطح پر اس کے پیغام کو سمجھ کر ذہن نشین تو کر لیا مگر ان سچے اقبالیوں کے سامنے کام کا کوئی پروگرام نہ تھا کہ کیا اقدام کدھر سے کریں۔ تحریک پاکستان چلی تو بہت سے لوگ اس کے کام میں اس جذبے سے شریک ہو گئے کہ پاکستان تہذیب فرنگ کے خلاف اسلام کا مضبوط قلعہ بننے والا ہے۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد بھی مغربیت کے خلاف معرکہ ابھی مسلمانوں کے سر اُدھار تھا۔ اقبالؒ نے اپنے کام کو جہاں تک پہنچا دیا تھا وہاں بجا طور پر اس نے محسوس کیا کہ اس کام کو آگے بڑھ کر مطلوبہ نتیجے تک پہنچانے کے لیے "دگر دانائے راز" کی ضرورت ہے۔ اپنے بعد آنے والے اور کام کو آگے بڑھانے والے کے لیے اقبالؒ کا جذبۂ بے تاب اس کی نگارشات میں جھلملا رہا ہے۔

مولانا مودودیؒ اقبالؒ کے "دگر دانائے راز" ہیں یا نہیں (کیوں کہ بہت سے حضرات کے نزدیک "دگر دانائے راز" جبھی قابل قبول ہو سکتا ہے جب کہ وہ ایک خاص گروہ کے اندر سے اُبھرے، ورنہ کسی کو دگر دانائے راز نہیں مانتا) مگر انھوں نے مغرب کی ملحدانہ و مادہ پرستانہ تہذیب اور اس کے پھیلے ہوئے پُر فریب نعروں اور سلوگنوں اور اصول و تصورات کے خلاف ہمہ گیر جنگ نہ صرف پاکستان میں چھیڑ دی بلکہ خدا کی مدد سے بقیہ عالم اسلام میں بھی یہ رَو اُٹھتی چلی گئی۔

مولانا مودودیؒ نے نہ صرف اقبالؒ کے آغاز کردہ فکری معرکے کو مکمل کیا، بلکہ تحریک پاکستان جب برصغیر کی تقسیم ہو جانے کے بعد پاکستان کا اصل نصب العین نہ پا سکی بلکہ تحریک پاکستان کے لیے جمع ہونے والی قوت دوسرے مشاغل میں کھو کر اپنے ہی وجود کو بکھیرنے میں مصروف ہو گئی تو اس نئے خلاء کو مولانا مودودیؒ کی منظم کردہ طاقت نے پُر کیا۔ اور قافلۂ ملت اسلامی نظام کی اقامت کے لیے از سر نو گامزن ہو گیا۔ گویا مولانا مودودیؒ نے

قائدِ اعظم کی اس مہم کو آگے چلایا جس کا دوسرا اہم تر اور مشکل تر مرحلہ طے کرنے کا موقع مسلم لیگ کے لیے نہ رہا۔

ہم پچھلے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہیں:

سید مودودیؒ کے کارنامے کے دو پہلو تھے: ایک دورِ جدید کی مرعوب کن جاہلیت جس کا چہرہ روشن اور اندرون چنگیز سے تاریک تر تھا یعنی مغربی فکر و تمدن اور اس کے ہر شعبۂ زندگی پر محققانہ تنقید۔ دوسرا اسلامی نظام کی اقامت کے لیے ایک منظم جہادی تحریک کا اجراء۔ کام کا ایک حصہ اگر "لا" تھا تو دوسرا "اِلا" "کفر بالطاغوت" اور "ایمان باللہ" دونوں منفی اور مثبت تقاضے ساتھ ساتھ تھے۔

یہ جائزہ لینا تو مبصرین اور مورخین کا کام ہے کہ وہ اندازہ کریں کہ ان دونوں ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں مولانا مودودیؒ کا پارٹ کس درجے کا تھا!

اب ذرا ان تفصیلی اجزائے معنی پر ایک سرسری نظر جن پر سیدِ انقلاب انگیز کی کی دعوت مشتمل تھی:

(۱) انگریزی سامراج، ہندوؤں کی چانکیائی سیاست اور دنیا بھر میں مختلف نظریات کی پیدا کردہ فتنہ و فساد کی بلاؤں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو اوّلین نکتہ یہ سمجھایا کہ خدا کی اس منظم، متوازن سلطنت میں تمام موجودات خدا کے قوانین و حدود کی پابندی کر کے، دوسرے لفظوں میں اس کے سامنے مسلم بن کر کروڑوں برس سے بصد امن و سلامتی برقرار ہیں۔ انسانی دُنیا میں تمام خلل اور ظلم اور بگاڑ اس لیے ہے کہ انسان خدا کی عطا کردہ ذرا سی آزادی کو مسلم بن کر نہیں باغی بن کر استعمال کرتا ہے۔ اگر ہم زندگی کے لیے امن و سلامتی چاہتے ہوں تو اس کائنات میں مسلم بن کر جینا چاہیئے۔

(۲) اسلام مسیحیت، ہندومت، بدھ مت اور یہودیت کی مانند ایک مذہب نہیں ہے۔ وہ دین (مکمل نظامِ زندگی) ہے، لہٰذا اس پر وہ تعریف اور تحدیدات اور تنگ تصورات منطبق نہیں ہوتے جو مروجہ مذہب سے متعلق ہیں۔ یہ ہماری کوتاہی ہے کہ خود ہم نے بھی عملاً خدا کے وسیع و ہمہ گیر دین کو محدود انفرادی مذہب بنا دیا ہے۔

اب از سرِ نو اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے لے کر ہمیں اُٹھنا ہے۔

(۳) دین کا کام کرنے کے لیے وہ غیر شعوری نسبت کافی نہیں جو مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے کی وجہ سے موجود رہتی ہے، بلکہ دین کا مطالعہ کر کے اس کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ایک شعوری ایمان کے ساتھ اقامتِ دین کے لیے آگے بڑھنا لازم ہے۔ اقامتِ دین کا کام کرنے کے لیے ایمانِ خوابیدہ یا نسلی مسلمانی کافی نہیں، یہاں جاگتے ہوئے شعوری ایمان اور اصلی مسلمانی کی ضرورت ہے۔

(۴) ہم مسلمان محض ایک جامد قوم بن کر رہ گئے ہیں حالانکہ ہمارے لیے قرآن نے ایک بین الاقوامی انقلابی پارٹی کا مقام متعین کیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ انسانوں پر سے انسانوں کی خدائی کو ختم کرنے اور خدا کی حاکمیت و شریعت کو اخلاقی، سیاسی اور تمدنی زندگی کے اس حصے میں نافذ کرنے کی کوشش کرے جس میں انسانوں کو ایمان و کفر اور طاعت و بغاوت یا خیر و شر اور صلاح و فساد میں انتخاب کرنے کی امتحانی آزادی دی گئی ہے۔ مسلمان بہ حیثیت قوم اور مسلمان بہ حیثیت جماعت (اور اسلام بہ حیثیت تحریک) کا فرق واضح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے یہ راز بھی کھول دیے کہ مسلمانوں کے مدارس اور اسلامی نظامِ تعلیم، مسلمان معاشروں کے مروجات اور اسلامی اصول و اقدار باہم کر الگ الگ ہیں۔ ان کے التباس کی وجہ سے بہت سی حقیقتیں مسخ ہو جاتی ہیں۔

(۵) عبادت صرف اُن اذکار اور اعمال کا نام ہی نہیں جنھیں محدود سے لمحات میں مسجد کی حدود کے اندر انجام دیا جاتا ہے، بلکہ مسجد کی چار دیواری سے نکل کر ہم گھروں، دکانوں، کھیتوں، بازاروں، کارخانوں، دفتروں، تھانوں، کچہریوں، پارلیمنٹوں اور مجالسِ وزارت میں جو کچھ کام کرتے ہیں وہ اگر خدا کے احکام و حدود کے مطابق ہوں تو سب عبادت کی تعریف میں داخل ہیں، اور اگر اُن میں ہم خدا سے بے تعلق ہو کر مصروف ہوتے ہیں تو پھر مسجد سے باہر کی ساری زندگی بغاوت کی زندگی ہو جاتی ہے۔ مسجد میں اطاعت اور اس کے باہر بغاوت، یہ ایک ایسا سنگین تضاد ہے جس نے ہماری قوموں کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ بڑا بھاری شرک ہے کہ مسجد کا خدا اور مسجد سے باہر کا خدا اور دین الگ الگ

ہوں۔ پس دین اور سیاست یا دین اور معاش یا دین اور دنیا کی وہ تفریق باطل ہے جو بالعموم رائج ہے۔

(۶) ایک شخص کا یہ کہنا کہ وہ مسلمان ہے اور پھر اس کے بعد زندگی کے تمام مسائل و معاملات اور دلچسپیوں میں خدا کی کتاب اور رسولؐ کی سُنت سے کوئی تمسک ہی نہ کرنا، یا کتاب و سنت کے احکام کو مسترد کرنا، یا ان میں ہیر پھیر کر کے من ملنے طریق سے مطلب کو خبط کرنا یا ان کا مذاق اڑانا یا ان کو ناقابلِ عمل قرار دینا یا ان کے بالمقابل دوسرے فلسفوں اور ضابطوں کو ترجیح دینا، یہ اس دورِ زوال کا بہت بڑا تناقض ہے۔ اس تناقض کو رفع کرنے کے لیے یا تو ٹھیک ٹھیک طریق سے انقیاد کا رویہ اختیار کیا جائے، یا اگر ایسا رویہ اختیار کرنے میں عقل اور مفاد مانع ہوں تو پھر دھوکے کی منافقانہ رسمی نسبت کو چھوڑ دینا چاہیے۔ قرآنی الفاظ کے مطابق "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْن" کا یہ ایسا سخت تازیانہ تھا کہ بہت سے سلیم الطبع حضرات کی اس سے آنکھیں کھل گئیں اور ان کی زندگیاں اسلام کے سانچے میں ڈھل گئیں۔ اسلام کے بھاگے ہوئے سپاہی چھاؤنی میں واپس آنے لگے۔

(۷) تحریکِ خلافت سے لے کر تحریکِ پاکستان تک اسلامی حکومت کا ہر طرف چرچا تھا مگر خود یہ بات مبہم تھی کہ اسلامی حکومت کیا ہوتی ہے؟ اسے واضح کرنے کے لیے سیدِ مغفور نے اس کے بنیادی تصور کو چند نکات میں مضبوط دلائل کے ساتھ "اسلام کا نظریۂ سیاسی" میں پیش کیا جس میں اپنی بات سمجھانے کے لیے "الٰہی جمہوری حکومت" "Theo-Democracy" اور جمہوری خلافت .... "Popular-Vicegerency" جیسی انقلاب انگیز اصطلاحات وضع کیں۔ اس بحث کے پیدا کردہ سوالات کے جواب میں پھر اپنا مشہور رسالہ "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" لکھا اور بتایا کہ اس منزل تک پہنچنے کا راستہ اگرچہ دعوت و پیغام سے شروع ہوتا ہے اور تعلیم و تزکیہ کی منزلوں سے گزرتا ہے، مگر ہے وہ سراسر انقلابی راستہ۔ ایسا نہیں کہ جونہی کسی جگہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے وہ آپ سے

آپ (Automatically) اسلامی حکومت بن جائے گی۔ اسے اسلامی بنانے کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے بڑی قربانیاں دینا ہوں گی؛ چنانچہ تاحال مکمل شکل میں کوئی اسلامی حکومت موجود نہیں ہے۔

(۸) دیوبند اور علی گڑھ اور ندوہ کے وجود سے اسلامی تعلیم کے متعلق جو بحثیں چھڑی ہوئی تھیں اور سرکاری کالجوں اور سکولوں میں دینیات کا پیریڈ شامل ہونے کا جو قصہ چل رہا تھا اس کے اندر ایک بڑا سوال مخفی تھا۔ وہ یہ کہ اسلامی تعلیم کیا ہوتی ہے اور اسے کیسے جاری کیا جا سکتا ہے۔ سید مودودیؒ نے مسئلے کا تاریخی جائزہ لے کر بتایا کہ مختلف حالات کی وقتی ضرورتوں کے تحت ایک اور دوسری اور تیسری صورت اختیار کی گئی مگر اسلامی نظامِ تعلیم اس طرح نہیں جاری ہو سکتا کہ عام لادینی نصابات میں کسی ایک پیریڈ اور نصاب کو شامل کر دیا جائے، نہ کام اس طرح چل سکتا ہے کہ دینی تعلیم ایسے طریق سے دی جائے کہ جدید زمانے کے علوم اور مسائل سے اسے کوئی تعلق نہ ہو۔ بعد میں اس موضوع پر کئی چیزیں مولانا نے لکھیں اور متعدد بار اہم مجالس میں خطابات کیے۔

(۹) تحریکِ پاکستان کے وقت ایک اہم بحث آزادی کی چھڑی، جس کا تصور کانگریسی اور ہندو حلقوں کا یہ تھا کہ پہلے سب کو مل جل کر انگریز سے آزادی حاصل کر لینی چاہیے۔ بعد میں آپس میں طے کرنا چاہیے کہ آزادی میں سے سب کو حصہ کس طرح مل سکتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس تصورِ آزادی کی مخالفت اس نظریے کی بنا پر کی کہ مسلمان کا تصورِ آزادی یہ ہے ہی نہیں کہ آدمی ایک غیر اسلامی نظامِ غلامی سے نکل کر پھر کسی دوسرے غیر اسلامی نظام میں جکڑا جائے یا از سرِ نو ایک داخلی جنگِ آزادی لڑے۔ مسلمان کا تصورِ آزادی تو ہے ہی یہی کہ ایک غیر قوم کے غیر اسلامی تسلط سے نکل کر وہ صحیح اسلامی نظام قائم کر کے اس میں زندگی گزار سکے۔ پھر انھوں نے مثال دے کر کہا کہ نقشہ یا حوالی یہ ہے کہ بڑا جیلر اندر کے نمبرداروں کو جیلر بنانے کے لیے ان ساری نمبرداریوں کے سرے اس کے ہاتھ میں دے رہا ہے تاکہ مسلمان جیسے پہلے

جیل میں جکڑے ہوئے تھے ویسے ہی بعد میں جکڑے رہیں۔ یہ صورت آزادی ہمیں منظور نہیں ہے۔ ہمیں پہلے سے بتایا جائے کہ ہمیں اپنے دین اور اپنی تہذیب اور ان کے احیاء کے لیے کیا قوت دی جائے گی۔ اگر ایسا نہیں تو وطنی متحدہ قومیت میں لادین اسٹیٹ کے قیام کی اسکیم میں ہم حصہ دار نہیں بن سکتے۔ ہمیں تم اگر متحدہ ہندوستان میں دینی اختیارات اور تہذیبی آزادی کی ضمانت نہیں دے سکتے تو پھر زمین کا کوئی ٹکڑا کتنے ہی حصوں میں بٹے، اس پر تڑپے وہ جس کے لیے وہ معبود یا دیوتا ہو، پورے ہندوستان کے بالمقابل زمین کا ایک مربع میل ٹکڑا ہزار درجہ زیادہ قیمتی ہے جس میں خدا کا دین جاری وساری ہو اور ہم اس میں اپنی زندگیوں کو صحیح شکل دے سکیں۔

مولانا کا یہ تصورِ آزادی تاریخ کا ایک سنگِ میل ہے اور اسلام کے مقصد و منشا کو سمجھنے کا وسیلہ!

(۱۰) اسی سلسلے میں ایک بحث متحدہ وطنی قومیت کی چلی، جو نزاعی رنگ اختیار کر گئی۔ مولانا مودودیؒ نے اسلامی قومیت کو موضوع بنا کر تفصیل سے بہت مدلل کتاب لکھی مسئلہ قومیت۔ اس میں قرآن و حدیث کی بحثوں کے علاوہ مغربی مثالوں اور حوالوں سے دکھایا کہ قومیں کبھی بھی وطن سے نہیں بنتی ہیں۔ کیوں کہ کہیں تو ایک ہی یورپین ملک یا ریاست میں تین تین قومیں موجود ہیں اور کہیں زبردستی سے باندھی گئی ایک قوم میں داخلی کش مکش برپا ہے اور کہیں ایک ہی قوم کے ٹکڑے کاٹ کر الگ کیے جا رہے ہیں۔ اور آج تو ہمارے سامنے متحدہ وطنی قومیں ٹوٹ رہی ہیں اور مذاہب کی بنا پر مختلف فریق الگ الگ ہو رہے ہیں یا اس وجہ سے شدید تصادم برپا ہیں۔ الغرض مولانا نے ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں جو الگ دین، الگ معاشرت، الگ ضابطہ حلال و حرام، الگ تاریخ، الگ آداب و شعائر رکھتے ہیں۔ یہ کتاب تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ کے لیے بہترین کامیاب حربہ ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ اوّل و دوم نے بھی کام دیا۔

(۱۱) مگر مولانا مودودیؒ نے اس سے اگلی ایک بات جب وضاحت سے کہی تو انتہائی ممنون مسلم لیگ ناراض ہوگئی۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ جدید اصطلاحات کی رو سے تم یقیناً ایک وطن پرست قوم نہیں ہو اور نہ کسی متحدہ وطنی قومیت کا کمزور سا جزو بن کے رہ سکتے ہو، لیکن دوسری طرف یہ بھی فراموش نہ کرو کہ تم خود بھی حقیقت میں ایک نسلی قوم نہیں ہو، بلکہ اسلام کو برپا کرنے والی ایک پارٹی ہو اور تم محض ایک قوم کا پارٹ ادا کرنے کی بجائے ایک انقلابی پارٹی کا سا پارٹ ادا کرو۔ ظاہر ہے کہ تنقید کیے بغیر اتنی بڑی حقیقت بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سید مودودیؒ کا نام مخالفینِ پاکستان میں لکھ دیا گیا، حالانکہ انھوں نے خود برصغیر کی تقسیم کا ایک خاکہ پیش کیا تھا جب کہ تقسیم کے مبحث پر مختلف آراء سامنے آرہی تھیں۔

مولانا مودودی مغفور نے مسلمانوں کے سامنے یہ حقیقت فاش طریقے سے اس لیے وقت پر بیان کر دی کہ پاکستان بننے کے بعد جو ذمہ داریاں ان کے سر آنے والی تھیں جو محض ایک قوم بن کر انجام نہیں دی جا سکتیں۔ بلکہ انقلابی پارٹی کے سے طرزِ فکر اور کردار کے ساتھ ہی ادا کی جا سکتی تھیں۔

مشکل یہ ہوئی کہ مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ سوم اس وقت مسلمان سیاسی قوت کی بارگاہ میں ناپسندیدہ ٹھہری۔

(۱۲) آزادی سے پہلے شروع دور ہی میں، ایک اور اہم مسئلہ مودودیؒ نے یہ اٹھایا کہ قوموں کی عظمت کی گاڑیوں کو دنیا میں علمی و تحقیقی کاموں کے انجن کھینچتے ہیں۔ پس ہمیں بھی اگر دورِ حاضر میں سر اٹھانا ہے تو مغربی علوم کے مقابلے میں اسلامی علوم کو از سرِ نو تحقیقی بنیادوں پر کھڑا کرنا ہوگا اور فلسفہ ہو یا سائنس، سیاست ہو یا معیشت نیز دیگر مختلف علوم ان کی تشکیلِ نو اسلامی اصولوں کے مطابق کرنا ہوگی۔ اس دعوت کی آواز اٹھاتے ہوئے مولانا نے ایک طرف ڈیکارٹ، ڈارون، مارکس، لینن وغیرہ کے خیالات پر سخت تنقید کی اور دوسری طرف اپنے مثبت فکر کو مضبوط استدلال کے ساتھ ثابت کیا۔

(۱۳) پاکستان بن گیا اور تحریک چلانے والی جماعت بطور ایک فاتح جماعت کے عہدہ وجاہ اور مفاد و منفعت کا مالِ غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہونے لگی تو کمیونسٹوں اور سیکولرسٹوں اور "مسلمانی بلا اسلام" سے آراستہ جاگیرداروں اور لیڈروں، اور برائے کے بے مقصد مصنفوں، صحافیوں اور خطیبوں کے لیے ہر طرف راستے کھل گئے کہ وہ اسلام اسلام کے شور میں ایک لادین جمہوری نظام قوم پر مسلط کر دیں، مگر ابھی وہ کچھ زیادہ کام نہ کر پائے تھے کہ فروری ۱۹۴۸ء میں (تشکیل پاکستان کو ابھی چھ مہینے ہی گزرے تھے) مولانا مودودیؒ کی طرف سے چار نکاتی مطالبہ اس غرض کے لیے اٹھا کہ ریاست کی دستوری تشکیل سے پہلے اس کی ضروری بنیادیں معین کر دی جائیں۔ کچھ دیر کے لیے سرکیرا گئے۔ سرکار نے دفتروں سے لے کر مسجدوں تک مورچے کھول دیے۔ مولانا مودودیؒ کو ملتان جیل میں پہنچا دیا گیا، مگر پرنالہ وہیں رہا۔ چاروناچار ۱۲، مارچ ۱۹۴۹ء کو "قراردادِ مقاصد" پاس کی گئی جو نہ صرف اسلامی ریاست کے قیام کا دوٹوک اعادہ تھی بلکہ اس میں وہ تمام خطوط بھی مذکور تھے جن پر اسلامی ریاست اور معاشرے کی تشکیل کی جائے گی۔ قراردادِ مقاصد کی ایک اور اہمیت مورخ اور مبصر نوٹ کریں گے کہ اسلامی نظریۂ سیاست کے تحت جو اصطلاحات اور جو امتیازی زبان مولانا مودودیؒ استعمال کر رہے تھے، اس کا واضح انعکاس اس میں موجود تھا۔

(۱۴) اسلامی نظام کے قیام کے لیے جو تحریک اس شکل میں شروع ہوئی، وہ "قراردادِ مقاصد" کے بعد اور زیادہ قوت کے ساتھ آگے بڑھی اور تمام مذہبی حلقے اور عوام آہستہ آہستہ اس کے زیر اثر آتے گئے، یہاں تک کہ ۱۹۵۱ء میں ملت کے تمام مدارسِ فکر کے نمائندہ علماء نے اپنے لاینحل اختلافات کو درکنار رکھ کر اسلامی دستور (یا ریاست) کے ۲۲ اصول متفقہ طور پر طے کر دیے اور یہ سلسلہ مساعی ۱۹۵۶ء کے دستور پر منتج ہوا جسے ساری قوم نے خوشیاں منا کر قبول کیا۔

(۱۵) تحریکِ دستورِ اسلامی کے ساتھ ساتھ سوالات ابھرتے رہے کہ مختلف شعبوں کا کام اسلامی اصولوں کے تحت کس طرح چلے گا۔ سیدؒ نے ان سوالوں کے

جواب میں اسلامی تعلیم ـــــ اسلامی قانون، اسلامی معاشرت اسلامی ریاست، اسلامی پردہ، حقوقِ زوجین، مسئلہ سود، ضبط ولادت وغیرہ تمام موضوعات پر ایسا ٹھوس کام کر دیا کہ آئندہ ریسرچ کرنے والے حضرت بڑی سے بڑی عمارت اٹھا سکتے ہیں۔

(۱۷) قرار داد مقاصد پاس ہو جانے کے بعد سید مودودیؒ نے یہ محسوس کیا کہ اب دستوری ارتقا یا کاروبار حکومت کی مزید اصلاح کا کام دور رہ کر نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے حلقۂ اثر کے سامنے "انقلابِ قیادت" کا ایک اور میدان عمل کھول دیا۔ یعنی اب اسلامی ریاست کے خواہاں لوگوں کو انتخابات کے میدان میں جانا چاہیے اور مروجہ خلافِ اسلام خرابیوں سے بچ کر قیادت کی صفوں میں تبدیلی لانے کے تجربے کا آغاز کر دینا چاہیے۔ انقلابِ قیادت کی دعوت جہاں کچھ لوگوں کو پچھلے کام کی نوعیت کی وجہ سے بے ربط سی محسوس ہوئی۔ وہاں ذی شعور علماء، جدید طبقوں اور عوام کے لیے امید کا ایک نیا راستہ کھل گیا کہ سیاسی قوت میں سے ابتداً اگر تھوڑا سا حصہ بھی ملتا ہے تو دو چار انتخابات کے بعد نتائج زیادہ بہتر ہو سکتے ہیں۔

(۱۸) اشتراکیت کے خدا ناشناس اور مذہب دشمن فلسفے اور نظام پر تقسیم سے پہلے بھی مولانا نے کام شروع کر دیا تھا۔ پھر جب جدید معاشی تصورات پر بحث اٹھائی تو اس لادین خوں ریز نظام کا بھی مزید تجزیہ کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۹ء میں انگلستان سے علاج کرا کے واپس پہنچتے ہی، یہاں کے حالات کو دیکھ کر اشتراکیت کے خلاف پہلی ہی تقریر میں اعلان جنگ کیا اور پھر اُنہی کی رہنمائی میں دارالفکر نے عوامی لٹریچر کا ایک سیلاب برپا کر دیا۔ اس دباؤ کے زیرِ اثر اشتراکیت کے لیے ایک اور مصنوعی چہرہ تیار ہوا اور وہ تھا "اسلامی سوشلزم" کا پُر تضاد سلوگن۔ اس سلوگن کی بھی دھجیاں بکھر گئیں۔ نتیجہ یہ کہ بھٹو صاحب اپنی فسطائیت کے باوجود ۱۹۷۳ء کے دستور پر آ رُکے۔

(۱۹) سید مودودی کی ایک گراں بہا خدمت اتحادِ اسلامی کی تحریک ہے اور اس کے لیے برصغیر ہی زیادہ سازگار خطہ ہے۔ ملک میں داخلی طور پر تو مولانائے مغفور شروع سے (۱۹۴۹ء سے) اس امر کے لیے کوشاں تھے کہ مسلمان فرقہ وارانہ تقسیموں کی سطح سے بلند ہو کر محض مسلم بن کر کام کریں۔

ملک سے باہر ـــــــ خصوصاً عربی ممالک میں ـــــــ نہ صرف بہ نفسِ نفیس سیّد مودودیؒ نے حاکموں اور علماء کو وحدتِ اسلام کا پیغام دیا بلکہ اس مقصد کے لیے ان میں لٹریچر بھی پھیلایا۔ دوسرے ملکوں کی دینی شخصیتوں اور تنظیموں سے تعلقات پیدا کیے۔ ان سے خط و کتابت کی، ہم عصر رجال میں سے علماء کی خاصی بڑی تعداد اتحادِ اسلامی کے لیے گامزن ہو گئی۔

(۲۰) دعوتِ اسلامی کو فروغ دینے، اس کے انقلابی شعور کو عام کرنے اور اتحادِ اسلامی کو محکم بنانے کے لیے مولانا مودودی نے دنیا کی اسلامی تحریکوں میں زیادہ سے زیادہ قرب اور اتحاد پیدا کیا۔ استاد حسن البنا شہید اور حسن الہضیبی شہید اور سید قطب شہید کے تیار کردہ اخوان ہوں، یا ترکیہ کے شیخ احمد نورسی کے تربیت دیے ہوئے کارکن، اور اسی طرح وہ مولانا مودودیؒ کے افکار کے پروردہ ذہن ہوں، وہ جہاں کہیں ہوں ایک دوسرے سے جا ملتے ہیں اور مل کر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں۔ ادھر حال ہی میں ایران کے اسلامی انقلاب کے نقیبوں سے بھی مولانا کا رابطہ قائم ہوا تھا اور ان کی مساعی کو بھی دین ہی کے کام کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔

پچھلے چند سال سے مولانا مودودیؒ عالمی تحریکِ اسلامی ہی کے ایک مفکر قائد تھے۔ یہ کوئی نظم نہیں اور نہ یہ اس کا کوئی عہدہ ہے، مگر یہ ایک قدرتی تعلق ہے جو از خود پیدا ہو جاتا ہے۔

خصوصاً مولانا مودودیؒ اور سید قطب کا لٹریچر تو چاروں طرف نور کے ایک جال کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ سلیم الطبع لوگ اس سے کنارہ کش نہیں رہ سکتے، وہ فوراً شکار ہو جاتے ہیں ـــــ اور جو اللہ کے لیے شکار ہو جاتے ہیں اس سے بہتر مرتبہ کس کا ہے۔

آخر میں میں اس کام کا ماحصل بیان کرنا چاہتا ہوں۔ چار بڑی قوتیں سید مودودیؒ مغفور نے اپنے پیچھے چھوڑی ہیں۔ ایک وسیع انقلاب انگیز لٹریچر اور اس کے تراجم۔ دوسری نظامِ اسلامی کے ظہور کے لیے کسی مزدوری کے بغیر سعی و جہد کرنے

والے مردانِ کار اور ذاتی مفاد کو قربان کرنے والے سپاہی۔ تیسری مختلف دائروں میں تحریکِ اسلامی کے اثرات۔ خواتین میں، کسانوں میں، مزدوروں میں، طلبہ میں، استادوں میں اور کہاں نہیں۔ چوتھی ـــــ معاشرے میں نوجوان قوت کی بیشتر صفوں کا غلبۂ اسلام کے لیے صف بستہ ہو جانا۔ یہ کتنی بڑی میراث ہے۔ اور یہ چہارگانہ میراث ایک ایسی زندہ قوت ہے کہ مولانا مودودی کے پیغام، فکرِ رسا اور ان کی تحریک کو آگے بڑھاتی رہے گی۔

سید مودودیؒ کے اس کام کے نتیجے میں خدا نے اپنے بندے کو ایک عجیب اعزاز سے نوازا۔ اور وہ یہ کہ اس کا وجود اور اس کا نام اسلامی انقلاب کی ایک آیت و علامت (Symbol) بن گیا۔ کتنی قوت ہے اس نام میں۔ کتنے دل ہیں جسے اس نام نے جوڑ کر خدا اور رسولؐ کے حضور میں لا کھڑا کیا ہے۔ کسے آج سے پہلے یہ اعزاز ملا کہ اس کی بات دنیا کی ساری آبادیوں میں پھیل گئی۔ اُس کا لٹریچر ہر گوشۂ زمین میں پہنچ گیا۔ اس سے محبت کرنے والے چاردانگِ عالم میں موجود ہیں۔

آج یہ شخصیت اس بات کی کسوٹی ہے کہ کون اسلام کے غلبے کی خاطر مولانا مودودیؒ سے محبت کرتا ہے اور کون ہے جو اسلام کا راستہ روکنے کے لیے مولانا مودودیؒ سے مخالفت رکھتا ہے۔

یہ تھا سید مودودیؒ جسے کتنوں نے جاننے کا موقع ملنے پر بھی نہ جانا۔ اور ایسے بھی بہت سے تھے جنھوں نے جانا ضرور مگر مانا نہیں۔

ایک عرصے سے سید مودودیؒ کے وجود کو کالعدم سمجھنے کی روش کا تجربہ بھی کیا گیا ہے۔ شترمرغوں کا خیال تھا کہ ریت میں منہ چھپانے سے شاید بلا ٹل جائے۔ وہ بھی تھے جنھوں نے مولانا مودودیؒ کو "سطحی" لکھ کر یہ اُمید باندھی کہ اب اس شخص کے علمِ دین کو کون تسلیم کرے گا جب کہ ہم نے اس کے عالم ہونے پر قلمِ نسخ کھینچ دیا ہے۔

صد حیف کہ اتنا رجلِ عظیم اس قوم میں اُبھرا، اس کے درمیان رہا، اس کے

اجتماعی معاملات کو درست راستے پر ڈلوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا رہا، لیکن عوام کو چھوڑیئے اس کے بعض خواص کا یہ حال تھا کہ وہ گویا ایک سمندر کا پانی چھلنیوں سے چھان کر برسوں تنکے تلاش کرتے رہے اور ہر تنکا ہاتھ میں لے کر ہجوم کی طرف دوڑے کہ آؤ لوگو، تمھیں مولانا مودودیؒ کی ایک غلطی بتائیں۔ افسوس کہ ان لوگوں کے وہم میں یہ بات نہ آئی کہ چند تنکے ایک طرف رکھ کر دیکھو کہ دوسری جانب سمندر کتنا عظیم ہے، اس کی موجوں کی اُفت و خیز کو دیکھو، اس پر تیرنے والے سفینوں کو دیکھو، اس میں رقص کرتی مچھلیوں پر نظر ڈالو، اور اگر توفیق ہو تو اس کی تہ میں ٹکے ہوئے ایک ایک صدف میں پرورش پانے والے موتیوں کو دیکھو؟ کیا تمہاری آنکھیں صرف تنکوں کو دیکھ سکتی ہیں یا تمھیں صرف تنکوں سے دلچسپی ہے؟

غرضیکہ قسم قسم کے لوگ یہاں ایسے موجود تھے جن کی ساری مساعی کا ماحصل یہ تھا کہ کسی طرح خواص و عام براہِ راست سید مودودیؒ کو جاننے نہ پائیں۔

مگر کب تک ـــــ سال، دو سال، دس سال! آخر کب تک!!

ایک وقت تھا کہ وہ شخص راز تھا، مگر اب تو کسی خوشبو کے راز کی طرح یہ راز چار دانگ عالم میں فاش ہو چکا۔ آپ بھی قوتِ شامہ کو کام کرنے دیجیے۔ آنکھیں کھولیے۔ کانوں سے وقت کی آواز سُنیے اور یہ بھی دیکھیے کہ آپ کی تحریروں اور آپ کی گفتگوؤں میں مولانا مودودیؒ کی فکر کے علامتی الفاظ شامل ہیں اور آپ اگر اس کی مخالفت بھی کرتے ہیں تب بھی آپ کے ذہن میں اس کے نقوش ثبت ہیں۔

پھر؟؟؟

آخر میں یہ بھی خوب سمجھ لیجیے کہ یہ دور مولانا مودودیؒ کا دور ہے۔ آپ نہ اس سے نکل کے باہر جا سکتے ہیں، نہ اس کے اثرات سے بالکل خالی رہ سکتے ہیں۔

آپ مولانا مودودیؒ کو نہ پہچانیں گے تو اپنے کو بھی کبھی صحیح طور پر نہ پہچان سکیں گے۔ بسا اوقات کچھ خود پیدا کردہ آسیبی قوتیں آدمی کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ اپنی ان آسیبی قوتوں سے نجات پا لیجیے، پھر کبھی آپ سے بات ہو گی۔

---

# دارُالاسلام سے

# منصورہ تک

گزری ہوئی تاریخی گھڑیاں جو کسی شخص یا جماعت کی ذہنی و عملی زندگی کی بنیادی اینٹیں بن جاتی ہیں، اتنی بڑی قدر و قیمت کی حامل ہوتی ہیں کہ نہ صرف متعلقہ اشخاص اور جماعتیں ہی ساری عمر ان کو سینوں سے لگائے رکھتی ہیں بلکہ بسا اوقات مستقبل کے مؤرخ بھی ان کی کھوج کرید میں بڑی کاوشیں کرتے ہیں۔ سرزمینِ واقعات و حوادث کے ذرے ذرے کو الٹ کر فکر و تحقیق کی انگلیاں ایسے تاریخی لمحات کی جستجو کرتی ہیں جو انفرادی اور اجتماعی کاموں کے ایک ایک پودے کے لیے نرم و نازک جڑیں بن کر اسے نادر بناتے ہیں، دنیا جاننا چاہتی ہے کہ کسی فرد یا کسی جماعت کی زندگی کی جڑوں کی رسائی کہاں تک ہے اور وہ کہاں کہاں سے غذا اور سرمایۂ قوت فراہم کر کے پتے پتے، کلی کلی اور کونپل کونپل کو زندہ رکھتی ہیں۔

خصوصاً اصولی و مقصدی جماعتوں کا دورِ آغاز، یا زمانۂ تربیت بڑا اہم دور ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں ان کی زندگی میں وہ شگوفے پھوٹتے ہیں جو آگے چل کر ان کی مستقل روایات بن جاتے ہیں۔ اسی دور میں وہ ایسے تجربوں سے گزرتی ہیں کہ جن کے زیرِ اثر ان کو ایک مستقل مزاج ہاتھ آتا ہے۔ اس دور میں ذہنیت بنتی ہے۔ اسی میں کردار کا حدود اربعہ متعین ہوتا ہے اور اسی میں اصول و مقاصد، رگ و پے میں رس بس جاتے ہیں۔ اسی دور کی یادگاروں کے قیمتی خزانوں کو کوئی ہیئت اجتماعی مرتے دم تک اپنے سینے سے الگ نہیں کرتی۔ یہی وہ بنیادی سرمایہ ہوتا ہے جس کے بل پر تحریکیں اپنا تمام کام چلاتی ہیں۔
ہم لوگوں کے لیے ممکن نہیں ہے کہ دارالاسلام پٹھان کوٹ کے مختصر سے دورِ اخذ و اکتساب کو زندگی کے کسی بھی مرحلے میں بھلا سکیں۔ وہاں کا ایک ایک دن ہمارے ذہنوں میں جگمگا رہا ہے۔ وہاں کی ایک ایک رات اپنے چاند تاروں کے ساتھ نگاہوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ وہاں کے گھڑیال کی بجائی ہوئی ایک ایک نوبت کی آواز

کانوں میں گونج رہی ہے۔ وہاں کی تعمیراتِ سنگ و خشت عالمِ تصور میں اسی طرح سر اُبھارے کھڑی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابھی ابھی چل پڑیں گی اور لپک کر اپنے پُرانے مکینوں کے گلے لگ جائیں گی۔ وہاں کی صاف ستھری مسجد کے مینار جیسے ہمک ہمک کے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے زیرِ سایہ کھڑے ہو کر اذانیں پکارنے والے، درس کے حلقے میں بیٹھنے والے اور رب العالمین کے حضور سجدہ ریز ہونے والے لوگ کہاں سدھار گئے۔ اس مسجد کا کشادہ صحن جیسے دامن پھیلائے ہوئے آسمان والے خدا سے بھیک مانگ رہا ہو کہ میری کھوئی ہوئی ذکر و تسبیح کی آوازوں کی دبی گونج ایک بار پھر مجھے لوٹا دے۔ وہاں کے درختوں میں سے ایک ایک جیسے عہدِ رفتہ کی یاد میں کھڑا کھڑا بُت بن گیا ہو، وہاں کا سبز پوش ماحول ذہن میں اتنی گہری تصویر چھوڑ رہا ہے کہ جیسے اگر ہم چاہیں تو ایک ایک بوٹی اور گھاس کی ایک ایک پتی کو گن سکتے ہیں۔ وہاں کی فضا میں ساڑھے ستر فٹ چوڑی نہر جس میں دریائے راوی کا پورا پانی ڈال دیا گیا ہے اُس کی تعمیر "تحالی" کا نعرۂ پُر شور ابھی تک کانوں میں گونج رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس بستی کا ایک منظر اصل کہانی سنانے سے قبل الفاظ میں محفوظ کر دیا جائے۔

سُنئے، صُبح کی اذان ہو رہی ہے، زندگی کروٹ لے کر اُٹھنے لگی۔ یہ بستی ایسی بستی ہے کہ جس کے تمام کے تمام بالغ افراد ایک بلاوے پر مسجد کی طرف سمٹ رہے ہیں۔ نماز بڑے سکون کی نماز ہے۔ معتدل بھی ہے۔ نہ زیادہ بھاری، نہ زیادہ ہلکی، تحریکِ اسلامی کا داعیِ اوّل خود امام ہے، قرأت ایسی کہ ایک ایک آیت ٹھہر ٹھہر کے پڑھی جا رہی ہے، قرآن کے ہر ہر لفظ کے دامن سے ذہن معانی کے موتی چن رہے ہیں، روحیں اونگھنے کے بجائے تحریک اور تبدیلی کا پیغام سُن رہی ہیں اور عملی زندگی کے مسائل کو سامنے رکھے سوچ میں ڈوب جاتی ہیں!

یہ وہ مقام ہے کہ فکر تمام وقتی جھمیلوں سے بلند، تمام سیاسی جتھا بندیوں سے بالا، تمام قیادتوں اور فلسفوں سے برتر ہو کر پوری کی پوری انسانی زندگی کو دیکھنے لگتی ہے کہ اس کی صلاح و فلاح کی راہ کدھر جاتی ہے اور اس کے فساد و تباہی

کا راستہ کدھر کدھر مڑتا ہے۔ نماز ختم ہوئی، مختصر سی دُعا مانگی گئی، اب درسِ قرآن شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وہ اصل درسِ حیات ہے جس نے ہمیں وہ کچھ بنایا جو کچھ ہم ہیں۔ ایک ایک آیت سامنے آتی ہے۔ اس پر سوالات ہوتے ہیں اور ہر سطح اور ہر نوعیت کے سوالات ہوتے ہیں۔ صاحبِ درس ہر نوعیت اور ہر سطح کے سوالوں کا جواب دیتا ہے اور ہر جواب حقیقتوں کے نئے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس کا انداز ایسا ہے جیسے وہ ایک ایک لفظ بول کر ایک نئے عالمِ افکار کی تعمیر کے لیے اینٹیں چن رہا ہے۔ ایک گھنٹہ کی روزانہ کی اس محدود مصروفیت کے ذریعے آئندہ کئی صدیوں کی تاریخ بنائی جا رہی ہے۔ لیجیے درس ختم ہوا۔ لوگ کبھی سنجیدگی سے سوچتے، کبھی ہنستے مسکراتے، کبھی درس میں چھڑنے والے مسائل پر بحث و تمحیص کرتے، بغلوں میں مصحف لیے منتشر ہوتے ہیں۔ اب کوئی نہر کے کنارے سیر کے لیے چلا گیا، کوئی سرنا کی بستی میں دودھ وغیرہ لینے روانہ ہو گیا، کوئی گھر کے کام کاج میں لگ گیا، تھوڑی دیر میں سب ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوئے اور اپنے اپنے شعبوں کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ملک غلام علی صاحب نے مکتبے کا کام شروع کر دیا، سید عبدالعزیز شرقی صاحب نے ترجمان القرآن کا دفتر کھول لیا، سید نقی علی اور حامد صاحب بستی کے بچوں کو پڑھانے میں لگ گئے، راقم الحروف اپنی بیٹھک میں واقع اپنے دفتر میں ترجمان القرآن کے لیے کچھ کاوش کرنے یا استفسارات کے جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ وہ دیکھیے، حافظ عطاء الرحمٰن (مرحوم) ہمارے سامنے کوارٹر سے نکلے انھوں نے کھڑے ہو کر ایک انگڑائی لی۔ اور زور سے "۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ!" کہا۔ پھر مجھے پکارا "کیوں بھئی نعیم صاحب! کیا حال ہے؟" "ٹھیک ہے" ان کا واحد سہارا عبدالرحیم ایک بوسیدہ سی کرسی نکال کے رکھتا ہے۔ پھر حافظ صاحب کا حقہ باہر لاتا ہے، "ابجی" کہتا ہے اور حافظ صاحب بیٹھ جاتے ہیں۔ اب عبدالرحیم گٹے کو چرانے باہر لیے جا رہا ہے۔

اُدھر دُور کوارٹروں کی لائن کے آخری سرے پر نگاہ ڈالیے۔ وہ ایک ۔۔

مہاجر، مجاہدانہ تن و توش کے ساتھ باہر نکلا ہے۔ یہ ہے اعظم ہاشمی- ایک اونچے خاندان کا پالا پوسا ذہین ادیب نوجوان جسے اشتراکی تسلط نے وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ گود میں اپنی صاحب زادی باطورہ کو لیے ہوئے ہیں، اپنی مرغیوں کو دانہ روٹی ڈال رہے ہیں۔ یہ ابھی کمرے میں جا بیٹھیں گے اور اپنے مہاجر ترک بھائیوں میں اسلامی دعوت کو زندہ رکھنے کے لیے ترجمہ اور خط و کتابت کا کام شروع کر دیں گے۔

یہ مسٹر فقیریا ہے۔ پیچھے پیچھے مسز فقیریا بھی آ رہی ہیں۔ اس کے پیچھے انہی کا ایک بچہ ہے۔ اس کے پیچھے ایک اور بچی ہے اور اس کے پیچھے کیا ہے، دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بستی کے حلال خور ہیں اور پکے عیسائی ہیں۔ میری کھڑکی کے سامنے سے گزرا تو جھاڑو رکھ دی اور کبھی "ملک صاحب اسلام" اور کبھی "میاں جی اسلام" کہہ کر باتوں میں لگ گیا۔

حافظ عطاالرحمٰن صاحب کے گھر سے دُود ھ بلونے کی آواز آ رہی ہے۔

یہ جا رہے ہیں حافظ عظمت اللہ پانی پتی، ننھے ساجد کو اُنگلی پکڑائے ہوئے۔ یہ اپنے محل کتابت میں جائیں گے اور ایک اونچے اسٹول پر مسطر رکھ کر کھڑے کھڑے کتابت کریں گے۔ یہ اس فن کا ایک نیا میتھڈ ایجاد کر رہے ہیں۔

پھر مغرب کی طرف اوپر چڑھیں تو مولانا صدرالدین اصلاحی کا "صدر خانہ" ہے، یعنی اقامتی کمرہ جو دفتر اور اطاقِ مطالعہ بھی ہے۔ برادرم صدرالدین اصلاحی صاحب کو اللہ نے جسم ہلکا پھلکا دیا مگر عالمانہ دماغ زیادہ وزنی (الوزن یومئذن الحق) اور روح بہت بھاری بھرکم، مگر مزاج لطیف جس کی ایک خوبی نظافت پسندی تھی اور دوسری تبسمِ تکلم۔ کبھی جملوں میں ہلکا مزاح۔ عمر کے لحاظ سے بالکل عنفوانِ شباب اور علم و کردار کے لحاظ سے پیری نہ سہی، پختہ سِنی کی ادھیڑ عمر۔ کبھی شدید سنجیدگی اختیار کرتے تو معلوم ہوتا کہ ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات کہ حقیقت میں وہ بے حد سنجیدہ ذہن کے رفیق تھے۔ جبھی تو حقیقتِ نفاق جیسی کتاب سے انہوں نے تصنیفی دور کا آغاز کیا۔ مجھے ان سے قلبی ربط تھا جو یکجائی کے مختصر سے دور میں بڑھتا گیا۔ اور جب تقسیم کے وقت بہت

سی مغارقتیں ہوئیں تو میں نے یوں سمجھا کہ ایک بھائی تھا جو جدا ہو گیا۔ پھر ایسی دیواریں حائل ہوئیں کہ خط تک لکھنے کا سلسلہ نہ چل سکا۔ بس یوں معلوم ہوتا رہا کہ ٹوٹے ہوئے خاندانوں کے کچھ افراد کو وجبریت کے اُس طرف ہیں، کچھ اس طرف۔ دونوں بس ایک دوسرے کے لیے دُعا کر سکتے ہیں۔

اب ذرا دیکھیئے تو اپنے مکان کی بیٹھک کے سامنے آم کے درخت کے نیچے ایک شخص سفید لباس ــــ لٹھے کا پاجامہ، ململ کا کُرتہ، وائل کی سفید ٹوپی پہنے بیٹھا نظر آئے گا۔ لباس کی سفیدی اتنی غیر معمولی قسم کی ہے کہ سرسبز ماحول میں وہ شخص ایک نقشِ نمایاں بن کر دکھائی دے رہا ہے۔ یہی ہے جسے لوگ "مولانا مودودی" کہتے ہیں۔ کبھی لکھنے میں معروف۔ کبھی ملاقاتیوں سے محوِ گفتگو اور کبھی اصحابِ دفاتر سے معاملاتی امور میں محوِ کلام!

مسجد، کنواں، آم کا درخت۔ وہ کینوس بناتے تھے جس میں مولانا کا تشخص نمایاں ہوتا تھا۔

لیجئے دوسرے ایک ترک طوختہ اخوند نمودار ہوئے۔ یہ بستی کی متفرق خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ اس وقت گھوڑے کو ایال سے پکڑے چرنے چُگنے کو چھوڑنے لے جا رہے ہیں۔ فارغ ہو کر مولانا کے پاس پہنچے۔ گھوڑے کی داستان وہ روزانہ ایک مرتبہ سُناتے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں "یہ گولا صاحب، بہت خراب آدم ہے۔ رات کو ہیچ نشتہ کھایا۔ ماگر میں اس کی خصلت خوب سمجھتا ہے۔" مولانا فرماتے ہیں "اچھا طوختہ اخوند، بچوں کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانا ہے۔ تانگہ جوڑ دو!" اب طوختہ چلے۔ گھوڑے کو پکڑ لائے اور تانگہ میں گھوڑا جوڑنے کی کشتی شروع ہوئی۔ اس موقع پر بستی بھر کے لیے مختصر سا سرکس ہو جاتا ہے۔ پہلا مرحلہ طے ہوا۔ اب دوسرا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے، یعنی اب گھوڑے کو چلانا ہے۔ کبھی طوختہ اخوند کوچوان بنتے ہیں اور کبھی مولانا ڈرائیونگ سنبھالتے ہیں۔ ہنٹر ہوا میں گھومتا ہے۔ طوختہ پہیے کو پکڑ پکڑ کے گھماتے ہیں، مگر یہ "گولا صاحب!" نہیں مانتا۔ وہ آخری ہتھیاروں پر اتر آتا ہے۔ ہوا میں اچھلتا ہے۔ مولانا کے بچے چیختے

ہیں "ہائے ابا! ہائے ابا!"۔۔۔ مگر مولانا استقلال کا مجسمہ بنے مسکراتے ہوئے تانگے کے عالم متزلزل کی باگ ڈور تھامے بیٹھے ہیں۔ آدمی کی سیرت ہر جگہ اپنے کچھ خاص پہلو دکھا جاتی ہے۔ بستی کے لوگ چاروں طرف سے طوعاً اخوند کا یہ سرکس دیکھ رہے ہیں۔ آخر تانگہ روانہ ہو جاتا ہے۔

لیجیے، لاہور امرتسر سے گاڑی آگئی۔ سرنا اسٹیشن سے چھوٹنے کا وسل سنائی دے رہا ہے۔ اب گاڑی ہمارے مکانوں کے پاس سے گزر رہی ہے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد گاڑی سے اترنے والے مسافر ریلوے لائن پر آتے دکھائی دینے لگے۔ نگاہیں ادھر ضرور اٹھ جاتی ہیں ۔۔۔۔ شاید ہمارے کوئی مہمان بھی ہوں۔ وہ ۔۔۔ بستی کے قریب کی پُلی سے اترنے والے راستہ پر آکر دو اصحاب نے ریلوے لائن چھوڑ دی ہے۔ یقیناً یہ ہمارے مہمان ہیں ۔۔۔ جماعت اسلامی کے مہمان!

دوپہر کو کام چھوڑ کر لوگ گھروں کو چلے گئے۔ ظہر کو مراد علی شاہ صاحب کی اذان گونجی اور عین مقررہ وقت پر جماعت کھڑی ہوگئی۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی پیچھے صف باندھے کھڑے ہیں۔ نماز کے بعد پھر لوگ دفتری فرائض میں محو ہوں گے۔

عصر کو پھر نماز کا اجتماع ہوا۔ نماز کے بعد درس حدیث ہو رہا ہے۔ اسی طرح ترجمہ و تشریح۔ اسی طرح سوالات، پست سوالات، اونچے سوالات، سطحی سوالات، مفکرانہ سوالات، دماغی سوالات، عملی سوالات، سیدھے سیدھے سوالات، ٹیڑھے ٹیڑھے سوالات۔ صاحبِ درس اس جھاڑ جھنکاڑ کے اندر سے سامعین کو تلاشِ حقیقت کے راستے بنائے دے رہا ہے۔

درس کے بعد پھر تمام لوگ بکھر گئے اور گھریلو کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ دیکھیے ملک غلام علی صاحب لکڑیاں پھاڑ رہے ہیں۔ ادھر ملاحظہ فرمائیے۔ قیم جماعتِ اسلامی (کل ہند) رسّی اور بوری لیے آرہ مشین کے کارخانے پر لکڑیاں اور برادہ لینے جا رہے ہیں۔ جہاں خود انہیں اپنے ہاتھوں سے برادے کی بوریاں بھرنی ہیں اور پھر ریڑھی پر لاد کر تہائی میل دوری پر خود ہی لانی ہیں۔ عبدالرحیم ۔۔۔۔ جو ابھی ایک

نوعمر بچہ ہے ـــــــ درانتی لیے چارے کا گٹھڑ لانے نکل گیا ہے۔ راقم الحروف غلہ کا بوجھ کندھے پر لادے پن چکی پر پسوانے لے جارہا ہے۔ باقی لوگ مولانا مودودی کے جلو میں تفریح کے لیے نہر کے کنارے چلے جا رہے ہیں۔ ایک گھاٹ کے ساتھ مستقل جائے نشست ہے۔ سب لوگ مولانا کے معمول کے مطابق کنارے کے بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھیں گے اور یخ جیسے پانی میں ٹانگیں ڈال دیں گے اور متفرق باتیں ہونے لگیں گی۔ نمازِ مغرب بھی اکثر وہیں پڑھی جاتی ہے۔ واپس آئے تو کھانے کا وقت ہو جائے گا۔ شام کا کھانا وقتاً فوقتاً اجتماعی ہوتا ہے۔ بستی کے کھلے میدان میں ایک دسترخوان بچھ جاتا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے گھر سے اپنے اپنے ذوق کا پکا ہوا کھانا پیش کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح مہمانوں کی خدمت بھی ہو جاتی ہے اور باہم دگر کھانوں کا ادل بدل بھی دلچسپی کا موجب ہوتا ہے اور پھر باتیں چھڑ جاتی ہیں ـــــــ عام لطیفوں سے لے کر تحریک کے اونچے مسائل تک دارالاسلام کی بستی کے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے مباحث تک۔ کوئی چیز مستثنیٰ نہیں رہتی۔

یہ بستی ایسے لوگوں کی بستی ہے جو دُنیا کی ساری دلچسپیاں چھوڑ کر یہاں ایک نئی برادری کی شکل میں جمع ہوئے ہیں۔ یہاں ان کا جینا مرنا ایک ہے۔ یہاں ان کے دُکھ سُکھ باہم دگر وابستہ ہو گئے ہیں۔ یہاں نئی محبتیں اور دوستیاں اور دلچسپیاں کونپلیں نکال رہی ہیں۔ یہاں کچے اَن گھڑ خیالات ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر اور ٹوٹ پھوٹ کر ایک مستقل شکل اختیار کر رہے ہیں۔ یہ مرکز ہے اس ننھی سی طاقت کا جسے پہاڑ جیسے مضبوطی سے جمے ہوئے نظریوں کو ایک دن چیلنج کرنا ہے۔

اس بستی میں اچھے اور بُرے واقعات و حوادث کی بڑی بڑی لہریں اُٹھتی رہی ہیں اور اپنے گہرے نقوش چھوڑ کر گم ہو گئی ہیں۔ یہاں ہم باہم دگر کئی کئی دن ایک ایک بحث میں اُلجھتے رہے ہیں۔ یہاں ہم بارہا ایک دوسرے سے رُوٹھے اور منے ہیں۔ یہاں کئی آنے والے گئے ہیں، اور ان کی جگہ نئے لوگ آئے ہیں۔ یہاں کئی بچھڑے

ہوئے آملے ہیں، اور کئی مل کر بچھڑ گئے ہیں۔ کون بھلا سکتا ہے ان شادیوں کو جو اس بستی کے ماحول میں ہوئی ہیں۔ کون فراموش کر سکتا ہے ان موتوں کو جو اس فضا میں واقع ہوئی ہیں۔ کیسے بھول سکتے ہیں۔ بیماریوں کے وہ حملے جو اس کے مکینوں پر کبھی ہوئے ہیں۔

## بھوت

"نیشنلزم" وہ تیز زہریلی شراب ہے کہ جسے پینے والے آہستہ آہستہ اپنا دماغی توازن بالکل کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کا نشہ جب پوری طرح سوار ہو جاتا ہے تو عقل ماری جاتی ہے۔ مذہبی تعلیمات اور روحانی قدروں کا اثر طبائع سے بالکل کافور ہو جاتا ہے اور موٹے موٹے مسلمہ اخلاقی تقاضوں تک کا کوئی احترام باقی نہیں رہتا۔ نشہ جب نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے تو آدمی ہر لباسِ تہذیب سے عاری ہو کر بھوت بن جاتا ہے۔ یہی شراب تھی جس سے برعظیم ہند کی ہندو آبادی نے اپنے بیکدے آباد کیے اور اس کے بالمقابل مسلمان بھی بجائے اس کے کہ ایک اصولی و مقصدی سیاست کی مئے طہور لے کے اٹھتے، اسی صہبائے ہوش رُبا کے متوالے بنے۔ دونوں طرف کے لیڈر، دونوں طرف کے اخبار نویس، دونوں طرف کے ادیب، دونوں طرف کے ذہین اور بااثر لوگ اپنی اپنی قوم کو ایک دوسرے کے مقابلے کی اسپرٹ کے ساتھ مغربی نیشنلزم کے ڈونگے درپے پلا رہے تھے اور متواتر چند سال سے پلا رہے تھے۔ آخر عوام "دُھت" ہونا شروع ہوئے۔ انھوں نے ساقی نامۂ فساد پڑھ پڑھ کر ناچنا شروع کیا۔ انھوں نے خنجر اور برچھیاں لے کے بچوں کے پیٹ پھاڑ ڈالے اور بوڑھوں کی ٹانگیں کاٹ دیں۔ انھوں نے ماؤں بہنوں کے ناموس کو لہولہان کر دیا۔ انھوں نے مذہب کے چہرے پر زخم لگائے۔ انھوں نے اخلاق کو سُولی دی، انھوں نے شرافت کا جنازہ نکالا، انھوں نے انسانیت کو تڑپا دیا، انھوں نے تہذیب کے گھر کو آگ لگا دی، انھوں نے جمہوریت کی متاعِ حیات لوٹ لی اور امن کو دیس نکالا دے دیا۔ شہری

زندگی بھوتوں کے ہتھے چڑھ گئی۔

کلکتہ، نواکھلی، بہار اور شمالی ہند کے فسادات اپنا خونی پرچم اُڑاتے پیش آہنگ بن کر آزادی کی نیلم پری کے آگے آگے چلے جو سرزمین ہند پر قدم رکھنے والی تھی، جلد ہی آزادی کے نزولِ اجلال کی ساعت سعید آپہنچی۔

## کھچاؤ

۱۹۴۷ء نمودار ہوا تو اس کے چہرے اور سینے پر گھاؤ تھے ـــــ مگر خون میں لتھڑے ہونے کے باوجود آہستہ آہستہ آزادی کا جھنڈا بلند کر رہا تھا۔ لوگ حالات کی تیز تیز کروٹوں کو سانس روکے دیکھ رہے تھے۔ مختلف مشن، مختلف منصوبے یکے بعد دیگرے جلد جلد سامنے آہی چکے تھے۔ ان میں سے اگرچہ کوئی بھی فریقین کے لیے پوری طرح وجہ اطمینان نہیں بن سکا تھا، لیکن ان چیزوں نے اُمیدوں کو مضبوط کر دیا امیدوں کو انھوں نے مضبوط کر دیا، مگر دونوں قوموں کے درمیان کھچاؤ بہت بڑھ گیا۔ ۱۹۴۷ء کے آتے آتے یہ حقیقت نمایاں ہو گئی کہ ان دونوں قوموں کا اب ایک نظام میں مل کر رہنا غیر ممکن ہے۔ تقسیم ہند کا امکان آہستہ آہستہ نمایاں ہو رہا تھا، لیکن ایک طرف پچھلے فسادات کے چرکے تھے جو دونوں قوموں کے لیے موجب کرب و اضطراب تھے اور دوسری طرف آنے والی تشویشناک صورت حالات تفکر انگیز تھی جو تقسیم کے واقع ہونے پر اُمڈنے والی تھی۔ اس سے کھچاؤ بڑھ رہا تھا۔

۱۹۴۷ء کے اوائل کے "ترجمان القرآن" کا فائل دیکھیں تو فسادات اور دو قومی کھچاؤ کا مسئلہ کئی شماروں میں وقت کے ایک اہم مسئلے کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کا پورا حلقۂ اثر اس مسئلے میں مرکز سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہے۔ یہ رہنمائی دے کر جو پالیسی ان کے سامنے رکھی گئی "ترجمان القرآن" کے ذریعے معلوم کی جا سکتی ہے۔ مارچ، اپریل، مئی میں جماعت کے حلقہ وار اجتماعات ہوتے ہیں تو ان میں بھی یہ مسئلہ پوری پوری توجہ کا

مستحق بنا نظر آتا ہے۔

چنانچہ ۱۹۴۷ء کی دوسری سہ ماہی میں وہ کھچاؤ ہمیں اپنی آس پاس کی فضا میں بھی محسوس ہونے لگا جو اب تک اخبارات اور جماعت کی رپورٹوں کے ذریعے ہمارے سامنے آ رہا تھا۔ امرتسر میں فساد ہو جانے کی وجہ سے قدرتی طور پر اس کے ملحقہ علاقوں پر اثر پڑنا چاہیے تھا، اور وہ پڑا۔ مئی ۱۹۴۷ء میں جب شمالی ہند کا حلقہ واری اجتماع دارالاسلام میں منعقد ہوا، تو اس وقت ضلع گورداس پور کی فضا خراب ہو چکی تھی۔ دو دو بار قتل اور بلوے ہونے کے واقعات ہونے لگ گئے تھے، ضلع بھر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ اس اجتماع میں ہم نے علاقے کے ہندوؤں کو بھی دعوت دی تھی اور وہ لوگ خاصی تعداد میں آکر شریک ہوئے مگر چہروں سے تشویش برس رہی تھی!!

۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے بعد تو جگہ جگہ اس طرح فسادات شروع ہو گئے گویا بارود کے ذخیرے بھک سے اڑ رہے ہوں۔ اس زمانے میں اپنے حلقے سے متعلق سلطان پور (کپور تھلہ) کے ایک مردِ بزرگ مستری محمد صدیق پر حملے کی اطلاع ملی۔ یہ بہت ہی فقیرانہ مزاج کے متحمل مزاج بزرگ تھے اور بلا امتیاز سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ مگر ہندو نیشنلزم کی تیز شراب کے بدمستوں نے ان کو بھی نشانہ بنایا۔ اطلاع ملنے پر میاں طفیل محمد سلطان پور روانہ ہو گئے اور وہاں ہندوؤں مسلمانوں سب سے ملاقاتیں کیں، اور فضا کے تکدر میں کچھ کمی پیدا کی، مگر اس واقعہ سے اندازہ ہو گیا کہ اور چیزیں تو رہیں الگ، اب انسانی اقدار کی سرزمین ہند پر خیر نہیں!

## اپنے علاقے میں کام

اس صورتِ حالات کے تحت بستی کے ہفتہ وار اجتماع میں طے پایا کہ معمولاً آس پاس کی آبادیوں میں دعوت کا جو کام ہوتا تھا، اب اس کے بجائے خاص طور پر علاقے کے امن کو بچانے، ہندو مسلم کھچاؤ کو کم کرنے اور مسلمانوں کو سہارا دینے کے لیے مہم جاری کر دی جائے۔ بلکہ نسبتاً زیادہ لوگ نکلیں اور زیادہ وقت صرف کریں؛ چنانچہ حسبِ قرارداد

یہ کام شروع ہو گیا اور ہر روز اس کی رپورٹ براہِ راست امیرِ جماعت کو دی جانے لگی۔ دو دو تین تین آدمیوں کے وفود چاروں طرف نکل جاتے۔ دو ایک بستیوں میں پہنچتے۔ حالات کا عام جائزہ لیتے۔ رابطہ پیدا کرتے اور چلے آتے۔

پہلے مرحلے میں کارکنوں کے دو گروپ بنائے گئے جن کے ذمے یہ کام لگا کر وہ علاقے کے حالات کا جائزہ لیں۔ ایک گروپ میں میاں طفیل محمد اور مراد علی شاہ صاحب کے ساتھ راقم کا نام شامل تھا، دوسرا گروپ ملک غلام علی صاحب، سید محمد ہاشم صاحب اور محمد یحییٰ صاحب پر مشتمل تھا۔

بعد میں خرابیٔ احوال کی روک تھام کے لیے حسب ذیل پانچ گروپ ترتیب دیے گئے:

(۱) اعظم ہاشمی (مرحوم)، عرفان غازی صاحب، محمد ہاشم صاحب اور نعیم صدیقی۔

(۲) میاں طفیل محمد صاحب، عبدالغفار خاں صاحب (خوشنویس) محمد حامد صاحب اور مراد علی شاہ صاحب۔

(۳) ملک غلام علی صاحب، محمد یحییٰ صاحب، راجہ احسان الحق صاحب اور ابو صالح اصلاحی (مرحوم)

(۴) سیّد نقی علی (مرحوم)، عبدالوحید خاں صاحب، عبدالرحیم صاحب۔

(۵) چراغ دین صاحب، حافظ عطاء الرحمٰن صاحب۔

ان وفود کی گشت کے لیے امیرِ جماعت نے لاہور سے سائیکلیں بھی منگوا لیں۔ وفود کی ترسیل کے وقت ان کو مولانا خود ہدایات دیتے اور ان کی رپورٹوں پر اجتماعی طور پر غور و خوض کیا جاتا۔

جماعت کی ایک مجلسِ شوریٰ میں مولانا نے یہ فرمایا تھا کہ غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلم قیادت ختم ہو جانے کی صورت میں وہاں کے مسلمانوں میں بدنظمی، مایوسی اور بددلی پیدا ہو جائے گی، ان کو سہارا دینے کے لیے جماعت کے کارکنوں کو ابھی سے تیار ہو جانا چاہیے۔

اس دوران میں یہ راز کھلا کہ علاقے میں سیوک سنگھی کارکن بہت ہی محتاط اور خفیہ طریق سے آتے ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں۔ کبھی وہ ہم سے پہلے جاتے، کبھی بعد میں — ! ان کے بارے میں کچھ معلومات ملنے لگیں۔ سرنا گاؤں میں یہ معلوم ہوا کہ ایک سیوک سنگھی

ہر روز علی الصباح آتا ہے اور ہندوؤں کو جمع کر کے اُنھیں کچھ تلقین بھی کرتا ہے اور کچھ شتیں بھی کراتا ہے۔ اس معاملے کی تحقیق کے لیے میں اپنے کسی دوسرے رفیق (غالباً یحییٰ صاحب) کے ساتھ علی الصباح وہاں پہنچا۔ اِدھر اُدھر سے معلوم کیا۔ پھر "موقع" کا کھوج لگایا اور دونوں وہاں جا پہنچے۔ بیوک سنگھی انسٹرکٹر واقعی موجود تھا اور لوگ اس کے گرد حلقہ زن بیٹھے کچھ درس لے رہے تھے۔ ہم نے آداب سلام کیے۔ وہ ٹھٹک گئے۔ ان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ پوچھا کہ یہاں آپ جو کچھ مفید باتیں سناتے ہیں ان سے ہم بھی فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، لیکن وہ رام نہ ہوئے۔ اُنھوں نے بتایا کہ یہ مذہبی باتیں ہیں اور سنسکرت میں کی جاتی ہیں۔ پھر ہم نے اُن سے یہ بھی کہا کہ ہم علاقے میں ہندو مسلمانوں کے درمیان بہتر فضا پیدا کرنے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ آپ بھی ہم سے تعاون کریں، لیکن بات کچھ بنی نہیں۔ بس اتنا ہی ہوا کہ اس "درس" کی حقیقت معلوم ہو گئی۔

اسی گشت میں دو بڑے شبہات ہمارے سامنے آئے جو علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک یہ کہ ہمیں مسلم لیگ کا جاسوس قرار دیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ دارالاسلام میں ہم نے سرحدی پٹھانوں کی ایک خاصی تعداد منگا کر رکھی ہوئی ہے۔ [1]

---

[1] بستیوں کی گردش اور رابطۂ عام کے تذکرہ تجربے کی روشنی میں میری پختہ رائے یہ ہے کہ کسی بھی تحریک، خصوصاً اسلامی تحریک کے کارکنوں کیلیے رابطۂ عام لازمی پروگرام ہونا چاہیے۔ اس طریق کار سے نہ صرف عام آدمیوں تک دعوت پہنچانے کا کام تیزی سے بڑھتا ہے بلکہ آدمی کے اپنے ذہن و کردار کی بھی بہتر تعمیر ہوتی ہے۔ کہیں اہل علم سے گفتگو، کہیں اَن پڑھ افراد سے بات چیت، کہیں موافقت کی فضا، کہیں مخالفت کا ماحول، کہیں مقامِ احترام اور کہیں موقعِ شفقت، کہیں معترفین کی حق خراشی اور کہیں مغلیین کی غفلت کوشی، اس طرح کے مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے مختلف جذبات کی آبیاری ہوتی ہے۔ کارکن معاشرے کو بالمشافہ جانتا ہے اور ہر اُس رَواور رسم کو سمجھتا ہے جو فروغ پاتی ہو۔ دعوت کے لیے سفر کرتے ہوئے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نکلے ہیں، نیز اس طرح مل کر نکلنے والوں میں رابطۂ محبت زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ اس طریق کار کے ترک کی تلافی محض جلسوں

(باقی حاشیہ ص ۳۲۲ پر)

## دارالاسلام میں "ہنگامی حالات"

کھچاؤ بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ۳ جون کے اعلان کے بعد علاقے کی فضا میں گھٹیا جذبات کی سڑاند محسوس ہونے لگی۔ امیر جماعت نے حکم دیا کہ اب دفتری کام بند کر کے لوگ زیادہ سے زیادہ وقت باہر بستیوں میں صرف کریں۔ گویا بستی میں ہنگامی حالات کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

ہم وفود کی صورت میں اپنی اپنی مقررہ بستیوں میں جاتے۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے سرکردہ آدمیوں کا پتہ چلاتے۔ اُن سے گھروں یا کھیتوں پر جا کر ملتے، وقت لیتے اور تفصیل سے گفتگو کرتے۔ ان کو توجہ دلاتے کہ مذاہب میں کوئی بھی اُس انسانی پستی کی طرف رہنمائی نہیں کرتا جس کا مظاہرہ فساد زدہ علاقوں میں کیا گیا ہے۔ یہ ہمارے لیڈروں اور اخبار نویسوں کے ذہن کا بگاڑ ہے جو ملک اور اس کی قوموں کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ ان کے اندر کی مذہبی حس کو چونکاتے، ان کے ضمیر کو بیدار کرتے، ان کے شریفانہ جذبات کو اپیل کرتے۔ پہلے کچھ تکلف رہتا، پھر وہ لوگ کھلنے لگتے تو اپنے شکوک و شبہات پیش کرتے۔ مثلاً ہندو عناصر یہ کہتے کہ ہم آج تک یہ محسوس کرتے ہیں کہ دارالاسلام ایک مسلم لیگی اڈّہ ہے۔ اس کے جواب میں ہم ان کو بتاتے کہ ہم پارٹیوں کی کش مکش سے الگ رہ کر اسلام کے اُن پاکیزہ اصولوں کو مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کر رہے ہیں جو انسانی زندگی کی فلاح کے لیے روشنی اور پانی اور ہوا کی طرح ضروری ہیں۔ ہم جن اصولوں کی طرف دعوت دیتے ہیں ان کے خلاف اگر ہمارے عمل کا کوئی بھی پہلو آپ کے سامنے آئے تو آپ لوگ ہم پر گرفت کر سکتے ہیں۔ ہم نیکی اور سچائی میں مسلمانوں کے بھی ساتھ ہیں اور غیر مسلم بھی اگر نیکی اور سچائی پر کاربند

---

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲۱ کا)

اور تقریروں اور نعروں سے نہیں ہو سکتی۔ اجتماعی وسائلِ دعوت کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ انفرادی سطح پر دعوت دینے کا کام ہر قسم کے حالات میں جاری رہنا چاہیے۔

ہوں تو ہم ان سے تعاون کر سکتے ہیں۔ ہم ظلم میں نہ غیر مسلموں کے ساتھی ہیں۔ نہ ظلم کے کاموں میں مسلمانوں کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ آپ لوگ اپنی قوم کے اندر یہی دعوت لے کے کام کریں تو علاقے کو فساد کی آگ سے بچایا جا سکتا ہے۔ پھر وہ کہتے کہ ہم نے سُنا ہے کہ آپ لوگ علاقے پر حملہ کی اندر ہی اندر تیاریاں کر رہے ہیں۔ ہم ان کو صاف صاف کہتے کہ اس حد تک تو بات ٹھیک ہے کہ ہم اپنی بستی کے بچاؤ کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھیں گے، اور آپ کو بھی یہ حق دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر ہر بستی کے لوگ اپنے آپ کو تیار رکھیں ــــــ مگر یہ تیاری کسی پر حملہ کرنے کے لیے نہ ہو۔ نیز ایک قوم کے لوگوں کا دوسری قوم کے لوگوں سے الگ انتظام نہ ہو بلکہ دونوں طرف کے سرکردہ لوگ ہر اُس طاقت کے دفاع کے لیے مشترکہ تیاری کریں جو حملہ آور ہو کے آئے۔

مسلمانوں سے ملتے تو محسوس کرتے کہ مالی اور معاشی اعتبار سے کمزور اور تعلیمی لحاظ سے پست ہونے اور زیادہ تر مزارع اور کمیں ہونے کی وجہ سے ہمارے یہ بھائی بالکل خوفزدہ، سہمے ہوئے، ذلت اور جمود میں مبتلا ہیں۔ غیر مسلموں سے ان کا تعلق خوشامدانہ اور مطیعانہ قسم کا ہے۔ ان کے لیے یہ بھی مشکل ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ان سے بالا بالا کوئی گفتگو کرنے کی پوزیشن بھی اختیار کریں۔ وہ ہماری باتیں پتھر کے مجسموں کی طرح سُنتے اور اپنے چہروں کی کیفیت سے یہ کہتے معلوم ہوتے کہ کیا ایسی باتیں بھی کی جا سکتی ہیں۔ ہم ان کو اطمینان دلاتے کہ ہم چند پردیسی اور مسافر قسم کے لوگ یہاں تمہارے سامنے جنگل میں پڑے ہیں۔ خدا پر ایمان، خودداری کے احساس، معاملات کو سمجھنے کی بصیرت اور اسلامی جذبات و اخلاق کے سوا ہمارا کوئی سامانِ دفاع نہیں ہے۔ تم بھی کمزوری کا احساس دلوں سے نکالو۔ خدا پر ایمان مضبوط رکھو اور اسلامی اصولوں پر قائم ہو کر اپنے دین اور جان و مال اور عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے مر مٹنے کا جذبہ پیدا کرو۔ جب کوئی خطرہ ہو ہمیں اطلاع کرو، ہم انشاء اللہ مدد کو پہنچیں گے۔ جب کوئی شکوک و شبہات ہوں تو ہم تمہاری طرف سے غیر مسلم قوم کے ذمہ دار لوگوں سے بات چیت کریں گے۔ ہم ساری بستیوں کو منظم کر کے امن کے لیے ایک مضبوط طاقت پیدا کریں گے، تم کمزور نہ پڑو!

وفود واپس آتے تو رپورٹیں پیش ہوتیں۔ ان پر بحث و تبصرہ ہوتا۔ نئی ہدایات دی جاتیں اور اگلے دن کا پروگرام بن جاتا۔ دوسری طرف ہمارے دو سابق فوجی ساتھی پریڈ اور دفاعی تربیت کا کام سنبھالے ہوئے تھے۔ ایک ہوائی بندوق لے کر نشانہ کی مشق کی جاتی، رات کو پہرے کا وسیع انتظام رہتا۔ پہرے کا انتظام پہلے سے تھا، دو دو آدمیوں کی تین چار پارٹیاں رات کے اوقات کو تقسیم کر کے پہرہ دیتیں، ایک پارٹی کا ٹائم جب پورا ہو چکتا تو دوسری پارٹی کو جگا کر فارغ ہو جاتی۔ ایک آدمی مسجد کے بغلی برآمدے میں لٹکے ہوئے گھنٹے کے قریب رہتا۔ دوسرا گشت کرتا اور دونوں وسل بجا بجا کر ایک دوسرے کو اپنے بارے میں آگاہ رکھتے۔ وسل کی علاماتی آوازیں مقرر تھیں کہ بوقت ضرورت ان سے کام لیا جا سکے۔ اب یہ انتظام زیادہ وسیع اور مضبوط کر دیا گیا۔ چھ چھ آٹھ آٹھ آدمیوں کی پارٹیاں بیک وقت گشت کرتیں۔ یہاں تک کہ خود مولانا مودودی بھی پہرے کے اس نظام میں ڈیوٹی دیتے۔ خوب یاد ہے کہ مولانا شب بیداری کے لیے پان اور برف کا خاصا انتظام رکھتے۔ کبھی کام زیادہ ہوتا تو پہرے کے مرکزی مقام پر لیمپ جلا کر اپنا کام بھی کرتے رہتے اور جاگنے والوں کے ساتھ حصہ دار بھی رہتے۔ اس پہرے کے کڑے پن کا حال یہ تھا کہ ریلوے لائن پر سے بھی رات کو اگر کوئی شخص گزرتا (اور رات کی گاڑی سے اترنے والے مسافر بڑی دیر دیر میں جاتے رہتے تھے) تو پہرے دار کی کڑکتی ہوئی آواز کسی جھاڑی میں سے گونجتی "کون ہے؟ ٹھہرو!" اور پھر نفسیاتِ انسانی کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو جاتے۔ بعد میں ان لوگوں کو معذرتی انداز میں آگاہ کر دیا جاتا کہ خطرے کے ماحول میں انتظام ناگزیر ہے۔

## ۱۵ اگست کے بعد

۱۵ اگست کو آخری طور پر خطِ تقسیم کھنچ گیا۔ آزادی کے جھنڈے دہلی اور کراچی میں لہرا دیے گئے۔ دونوں طرف جشن کے شادیانے بجنے لگے۔ اور "آزادی" کی نیلم پری خون میں نہائی ہوئی لاشوں پر قدم رکھتی ہوئی بڑے بڑے جلوسوں کے ساتھ مارچ

کرنے لگی۔ ان جلوسوں کے نعروں کی گونج ان لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی جن کی جانوں پر بنی ہوئی تھی اور جن کے لیڈر بچاؤ کا نہ کوئی انتظام کر سکے تھے نہ بروقت انھیں آگاہ کر سکے تھے کہ پس پردہ سیاست کیا تیاریاں ہیں۔ ان لوگوں نے آنسوؤں کے ساتھ آزادی کا خیر مقدم کیا۔

ایک قیاس یہ تھا کہ ضلع گورداسپور کا زیادہ تر حصہ پاکستان میں جائے گا۔ دوسرا اندیشہ یہ تھا کہ ہندوستان میں شامل ہوگا۔ اسی معلق حالت کی وجہ سے دو قومی کش مکش کے جذبات کا لاوا ابھی بہہ نہیں رہا تھا۔ یہ اعلان جس دن ہونے والا تھا وہ جمعتہ الوداع سے ٹھیک قبل کا دن تھا۔ اس روز میری اہلیہ اچانک ایک ایسی تکلیف میں مبتلا ہوگئی کہ لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جا کر ایک مختصر سا آپریشن کرانا ناگزیر ہوگیا۔ میں نے تانگہ لیا اور تقریباً عصر کے وقت پٹھان کوٹ جا پہنچا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ بازار بند ہو رہا ہے اور ہندوؤں سکھوں کی ٹولیاں ادھر ادھر حرکت کر رہی ہیں۔ مسلمانوں کے چہرے اداس اداس دکھائی دیے۔ پوچھا کہ کیا بات ہے؟ معلوم ہوا کہ ہونے والا اعلان ہوگیا ہے اور گورداس پور کا ضلع بھارت میں شامل کر دیا گیا ہے۔ خبر سن کر شاق ہوا۔ ساتھ ہی یہ تشویش کہ ہندو اکثریت کے اس شہر میں اس حالت میں میں اپنی بیوی کو ساتھ لیے گھوم رہا ہوں اور جانا بھی ایک سکھ لیڈی ڈاکٹر کے پاس ہے، لیکن چارہ کوئی نہ تھا۔ اس لیے خدا پر بھروسہ کر کے آگے بڑھا۔ لیڈی ڈاکٹر کو بلوایا۔ وہ آئیں اور کہنے لگیں کہ فوری طور پر ایک میٹنگ میں جانا ہے، ابھی آتی ہوں۔ اس کے دروازے کے سامنے میں سر راہ اور میری بیوی دونوں انتظار کی گھڑیاں کاٹنے لگے۔ بازار اور تیزی سے بند ہونے لگا۔ غیر مسلموں کی ٹولیوں کی رو اور بڑھ گئی، مگر یوں ابھی ہر کوئی چپ چپ تھا۔ خدا خدا کر کے لیڈی ڈاکٹر آئیں۔ وہ ہمیں بازار میں اپنی دکان پر لائیں۔ دکان کھولی آپریشن کیا۔ دوا دی اور ہم سر مغرب فارغ ہوئے۔ تانگہ والا انتظار کر رہا تھا۔ تانگہ پر بیٹھے اور اس نے کہا کہ "شہر کی فضا خراب ہوگئی ہے اور وقت بھی تشویشناک سا ہے، ذرا جلدی نکل چلو" ——— اور ساتھ ہی خیال ادھر گیا کہ اس وقت ہمارا اکہ بان بھی ہندو

ہے۔ خدا ہی اپنے سایہ حفاظت میں رکھے۔ خیر وہ چلا۔ پٹھان کوٹ کی حدود سے نکلے تو یہ تشویش کہ اس تاریکی میں نہ جانے راستے کا کیا حال ہے۔ راستے میں جگہ جگہ ہندو آبادیاں ہیں۔ اتنا تو دیکھا کہ ہر اہم موڑ پر کچھ لٹھ بند لوگ موجود ہیں، مگر ابھی کوئی "پروگرام" نہیں تھا۔ خیریت سے بستی پہنچنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

## وہ خوفناک کوٹھڑی

مَیں اور طفیل صاحب جس علاقے کے انچارج تھے اس میں ایک اہم آبادی۔ ۔ ۔ ۔ کے نام سے موسوم تھی۔ یہ ہندو راجپوتوں کا خاص گاؤں تھا اور یہاں ان کا پُرانا زور چلتا تھا۔ مسلمان بالکل ان کے انگوٹھے کے نیچے تھے۔ بعض کا حال تو یہ تھا کہ وہ "نیم مسلم، نیم غیر مسلم" کی پوزیشن اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہ بات نہ بھولے گی کہ وہاں ایک مسلمان حکیم صاحب رہتے تھے جن کے گھر میں ہم اپنی مہم کے سلسلے میں چند بار گئے۔ ان کا حال یہ تھا کہ دیواروں پر ہندوانہ بُتوں کی تصاویر موجود تھیں۔ ان سے بات ہوئی تو کہنے لگے کہ ہمارے آباؤاجداد ہندو تھے اور اب بھی ہم اُن سے کٹ نہیں سکتے۔ ہندو راجپوتوں نے ان سے کہہ بھی دیا تھا کہ تمھیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں، تم ہمارے اپنے ہو۔ اور مجھے حکیم صاحب کی اُس نوجوان لڑکی پر رحم آیا جس کی عزت اس ماحول میں خطرے کی زد پر تھی۔ نہیں بھولتا وہاں کا ایک دھوبی جو ہمارا کام کرتا تھا اور اس واقفیت کی بنا پر ہم اس سے ملتے تھے۔ اُس کی کمزوری کا عالم بھی بڑا رحم طلب تھا۔

ایک دن مَیں اور طفیل صاحب گئے تو بستی کے باہر وہی دھوبی ہمیں ملا۔ اس سے ہم نے دریافت کیا کہ کون کون لوگ ہمیں آج مل سکیں گے۔ اس نے راجپوت سردار کا نام لیا۔ پھر ہم نے پوچھا کہ مسلمانوں میں سے کون لوگ ملیں گے؟ اس نے کچھ بتایا۔ اور ہم بستی کے اندر چلے گئے۔ ملتے ملاتے جب بازار سے گزرے تو دیکھا کہ ہندو حضرات ایک جگہ جمع ہیں اور لاٹھیاں وغیرہ پڑی ہیں۔ ہم نے آداب سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ بات شروع ہوئی ہی تھی کہ فوراً ہم سے سوال کیا گیا کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ ہم نے تفصیل سے اپنا پروگرام

بیان کیا اور ان لوگوں سے ملاقاتوں کا حوالہ دیا جو موقع پر موجود تھے۔ اُنھوں نے شکایت کی کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ مسلمانوں سے مل کر ان کو کچھ سکھاتے پڑھاتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم دونوں فریقوں کے نمایاں افراد سے ایک ہی پروگرام کے تحت یکساں ملتے ہیں۔ اگر کوئی خاص اطلاع ہمارے کسی اقدام کو مشتبہ کرنے والی ہو تو راوی کو سامنے لائیے؛ چنانچہ اُنھوں نے آدمی بھیج کر رپورٹر کو بلوایا۔ تھوڑی دیر میں وہی دھوبی ہمارے سامنے تھا اور اس نے رپورٹ یہ کی تھی کہ یہ لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ مسلمانوں کے گھروں کا پتہ بتاؤ۔ ہم ان کو کچھ باتیں سمجھانا چاہتے ہیں۔ ہم نے جرح کی اولینے کیے ہوئے سوالات کو اس کے سامنے رکھ دیا تو وہ چپ سادھ گیا۔ اس پر محفل کا رنگ بدل گیا اور فوراً ہمارے لیے شربت کے گلاس منگوائے گئے۔ موقع پا کر ان سے کھل کر باتیں کی گئیں اور ان کے شریفانہ جذبات کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس طرح ہم آپ سے ملتے ہیں، مسلمانوں سے بھی ملیں گے اور اپنا پیغام ہر فریق کو سنائیں گے۔ جس کے دل میں کھوٹ نہیں ہوتا اس کی جرأت اور صداقت اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی۔

اب یہ لوگ کہنے لگے کہ آپ اپنی بات کرنے کے لیے ہمارے سردار کے پاس چلیں۔ ہم نے کہا کہ ہم تو ان کے گھر پر گئے تھے۔ ایک عورت ملی اور اس نے کہا کہ وہ اطلاع کرتی ہے۔ لیکن جواب ملا تو یہ ملا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ دوسری جگہ ہیں۔ چنانچہ ایک سرکردہ آدمی رہبر بن کے چلا۔ محلے میں سے گزرے تو گلیاں سنسان دیکھیں۔ ایک گلی میں داخل ہوئے تو وہاں پہرے کا انتظام تھا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی ایک بچے نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا موٹر کا ہارن بجایا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ علامتی اشارہ ہے۔ ہمیں آگے لے جایا گیا۔ ایک ڈیوڑھی پر ہم رُکے۔ اندر سے آدمی آیا اور ہمیں لے گیا۔ ڈیوڑھی، پھر ایک کمرہ، پھر ایک صحن، پھر اندر ایک کوٹھڑی! —— یہاں کیا دیکھتے ہیں کہ کوٹھڑی میں کئی آدمی بیٹھے ہیں۔ ہندو بھی، سکھ بھی! بعد میں معلوم ہوا کہ ایک بہوک سنگھی لیڈر بھی تشریف رکھتے ہیں۔ ایک سرکاری عہدیدار بھی ہیں۔ کونوں میں برچھیاں پڑی تھیں۔

کرپانیں دیوار سے لٹک رہی تھیں۔ پستول بھی دو ایک اصحاب کی کمر سے آویزاں تھے۔ ماحول ڈراؤنا ہونے کے لحاظ سے کافی سنگین تھا۔ مجھے محسوس بھی ہوا کہ ہم ایک خطرے کے مقام پر لے آئے گئے ہیں۔

لیکن طفیل صاحب نے تلواروں اور برچھیوں کے سائے میں جب تقریر شروع کی تو خود وہ لوگ دنگ رہ گئے اور چپ چاپ سنتے رہے۔ آخر میں انھوں نے شکوک و شبہات پیش کرنے شروع کیے۔ ایک تو وہی کہ تم لوگ درحقیقت مسلم لیگی ہو۔ ہم نے پوزیشن بتائی۔ انھوں نے اس کی تردید میں دلیل یہ دی کہ چودھری نیاز علی خاں صاحب نے جب آپ کو لا کے اپنی عمارتوں میں رکھا ہے اور وہی آپ کی کفالت کرتے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ آپ کچھ اور ہوں۔ ہم نے بتایا کہ ہم نہ کانگریسی ہیں نہ مسلم لیگی۔ ہم تو خدا کے دین کے اصولوں پر کام کرنے کے لیے منظم ہوئے ہیں۔ ہمارے نزدیک ملک ایک رہے تو بھی ہمارا کام وہی ہے، اور ملک تقسیم ہو جائے تو بھی ہمارا فرض ویسا ہی ہے چودھری نیاز علی خاں صاحب کی عمارات خالی پڑی تھیں وہ انھوں نے کچھ شرائط کے تحت ہمیں اسی طرح دی ہیں جیسے کرایہ دار کو کوئی عمارت دی جاتی ہے۔ وہ ہمیں وظائف نہیں دیتے۔ ہم اپنے طور پہ خود انتظام چلاتے ہیں۔ یہ معلومات سن کر وہ ہکا بکا رہ گئے۔ پھر طفیل صاحب نے اپیل کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی اختلافات کو کیوں نہ ٹھنڈے دل سے سوچا جائے۔ ان معاملات میں نفرت اور دشمنی اور فساد کی کیا وجہ جواز ہے۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرا شبہ بیان کیا کہ سنا ہے کہ پچھلے دنوں آپ نے سرحد سے پٹھان بلوائے تھے اور وہ خفیہ رکھے ہوئے ہیں تاکہ علاقے پر حملہ کریں۔ اس پر طفیل صاحب ہنس پڑے اور انھوں نے حقیقت واضح کر دی کہ وہ تو ہمارا ایک اجتماع ہوا تھا جس میں شمالی ہند کے ارکان اور کارکن جمع ہوئے تھے۔ اس میں علاقے کے جو غیر مسلم اصحاب بھی شریک ہوتے رہے ہیں ان سے پوچھیے کہ یہ کیسا اجتماع تھا اور اس میں کیا باتیں پیش کی گئیں۔ پھر اپنے اجتماعات اور ان کی نوعیت کو تفصیل سے بیان کیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ تو ہم نے بھی سنا ہے کہ اجتماع میں نہایت اچھی باتیں پیش کی گئی

تھیں، اور اسلام واقعی اچھی چیز ہے۔ لیکن کروڑوں مسلمان اسی اسلام کو ماننے والے ہمارے سامنے موجود ہیں، ان کا عمل تو ویسا نہیں ہے۔ آخر پنڈی اور نواکھلی میں اسلام کے ماننے والوں نے کیا کچھ کیا۔ طفیل صاحب نے ان کو بتایا کہ ہم اسی لحاظ سے مختلف ہیں کہ ہم اسلام کو باتوں کا دین نہیں عمل کا دین بنانے کی دعوت لے کر آئے ہیں۔ پھر یہ بھی بتایا کہ جو فسادات ہو رہے ہیں وہ اسلام کی تعلیم کا نتیجہ نہیں "نیشنلزم" کے جنون کا نتیجہ ہیں، اور نیشنلزم کے اس جنون سے ہم مسلمانوں کو بھی اور آپ کو بھی بچنا چاہیئے۔ پھر جب ان کو یہ بتایا گیا کہ ہم لوگ بستی بستی میں گھومتے پھرتے ہیں اور قلم تراشنے کا ایک چاقو اور ہاتھ میں رکھنے کا ایک سرکنڈا بھی ہمارے پاس نہیں ہوتا ــــــ اور خود آپ کی اس تاریک کوٹھڑی تک ہم اسی حال میں آ پہنچے ہیں ــــــ تو سوچیے کہ جس کے دل میں چور ہوتا ہے اس کا انداز کیا یہی ہوتا ہے؟ اس پر وہ لوگ کچھ مبہوت اور نادم سے ہو کر رہ گئے!

اور ہم ان سے یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ ہم اب جا کر مسلمان بھائیوں سے ملیں گے۔ اگر آپ کو کوئی شبہات ہوں تو اپنا کوئی آدمی ہمارے ساتھ کر دیجیے؛ چنانچہ ہم بے کھٹکے آگر مسلمان افراد سے ملے۔ ان کی ہمت بندھائی اور واپس چلے آئے۔

اگر اطلاع ملتی کہ کسی مسلمان سے کسی نے کوئی بات زیادتی کی ہے یا کسی کو اندیشہ لاحق ہوا ہے تو ہم فوراً دوسرے فریق کے سرکردہ لوگوں کو مل کر آگاہ کرتے اور ان سے مطالبہ کرتے کہ اس زیادتی کا ازالہ کرائیے اور اندیشہ دور کرائیے؛ چنانچہ ایک مقام کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہاں مسجد جلا دی گئی ہے تو ہم نے اسی راجپوت بستی کے سرکردہ افراد کو وہاں بھیجا کہ حالات کو جا کے درست کریں۔ ورنہ ایک چنگاری سارے علاقے میں آگ پھیلا دے گی اور اس کوشش سے بہت فائدہ ہوا۔

## باؤنڈری کمیشن کا اعلان

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ضلع گورداسپور کی قسمت بالکل معلق تھی۔ رات کو مجلس عام

میں نئی صورتحال کے متعلق گفتگو ہوئی۔ گورداسپور کے بارے میں جو فیصلہ ہوا یہ بالکل غیر متوقع تھا۔ چوہدری ظفر اللہ خاں کے "وکیلانہ کمالات" کی داد دی گئی۔ آج سے بالکل نئی صورتِ حالات کا آغاز ہوا۔

## اداس عید

جمعتہ الوداع کی نماز کا ماحول بھی بوجھل تھا، پھر اٹھائیسویں کی عید بھی بڑی اداس تھی۔ ہم نے عید منائی اور اللہ کا حکم پورا کرنے کے لیے اسی انداز سے منائی جیسے ہمیشہ منائی جاتی تھی۔ اس مرتبہ باہر کی بستیوں سے نمازی بڑی کم تعداد میں آئے۔ بعض کے لباس بالکل میلے تھے۔ معلوم ہوا کہ سارے علاقے میں عید نہیں منائی گئی بلکہ دل اداسیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

خطبۂ عید میں موقع کے لحاظ سے لوگوں کی ڈھارس بندھانے کا اہتمام کیا گیا۔ نماز کے بعد باہر کے لوگوں سے باتیں کی گئیں اور نئے حالات کے مطابق ان کو مشورے دیے گئے۔ ان کو تاکید کی گئی کہ وہ کسی خطرے پر یا تو ڈھول وغیرہ سے الارم کر دیں یا آدمی بھیج دیں۔ ہم اگرچہ تعداد میں تھوڑے ہیں مگر خود امداد کو آئیں گے اور دوسری بستیوں سے مدد طلب کریں گے۔

## تبادلۂ آبادی ہونے لگا

کئی روز قبل سے ہم دیکھ رہے تھے کہ امرتسر کی طرف سے دھڑا دھڑ لاریاں اور ٹرک غیر مسلم آبادی کو ساز و سامان سمیت لا رہے تھے۔ یہ مغربی پنجاب سے آنے والے پناہ گزین تھے۔ یہ چیز بھی اپنا اثر حالات پر ڈال رہی تھی۔ اِدھر سے موٹی موٹی مسلمان اسامیاں بھی نکلنا شروع ہو گئیں۔ کانگڑہ کی طرف سے کھاتے پیتے مسلمان چلے آ رہے تھے، لیکن مغربی پنجاب سے آنے والے غیر مسلموں کی تعداد بہت زیادہ اور رفتار بہت تیز تھی۔

## دفاعی انتظامات

بستی کے ڈیفنس کے انتظامات اوائل اگست میں کر لیے گئے تھے۔ مورچے کھد گئے تھے، مختلف افراد کو بتا دیا گیا کہ خطرے کے وقت اس کی ڈیوٹی کہاں ہوگی اور حملہ ہونے کی صورت میں کیا پوزیشن اختیار کرنی ہے۔ [1]

ابھی حالات کی خرابی اوجِ کمال تک نہیں پہنچی تھی کہ ایک دن یکایک دارالاسلام کی بستی میں خطرے کا الارم بجا اور فضا میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ایک آدمی ریلوے لائن (جو بستی سے ذرا بلند تھی) کے کنارے دوڑتا ہوا پکار رہا تھا کہ حملہ آور جتھا آرہا ہے۔ اپنے بچاؤ کا انتظام کر لو۔ اس پکار کے ساتھ سرنا اسٹیشن کی جانب سے نعروں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ اس پر جو اصحاب ڈیوٹی پر تھے انھوں نے کسی مجاز شخصیت سے اجازت لے کر الارم بجا دیا۔

پروگرام پہلے سے طے تھا کہ خطرے کی صورت میں کیا کرنا ہے، چنانچہ ایک دو منٹ میں مختلف رفقا کے گروہ مقررہ ناکوں پر اُس طریق سے جا کر کھڑے ہو گئے جو پہلے سے طے کر دیا گیا تھا۔ ہمارے پاس صرف برچھیاں تھیں۔ ہر شخص ڈھاٹا باندھے برچھی لیے، دم سادھے کسی مؤقف پر کھڑا تھا۔ یہ برچھیاں جو ہمارے پاس تھیں، اُن کے پھل امرتسر میں تیار ہوئے تھے اور دل چسپ تاریخی واقعہ ہے کہ ان کو امرتسر سے پٹھانکوٹ تک لانے والا بھی میں ہی تھا۔ یہ سب کپڑے میں اس طرح پیک کی گئی تھیں کہ ٹکرا کر بجیں نہیں،

---

[1] نہایت ہی غیر معمولی قسم کی سنگین صورتِ حالات اور قانون اور معاشرے کی طرف سے تحفظ کے کلی خاتمے کے پیشِ نظر یہ انتظام کیا گیا تھا۔ ہمارا خیال کسی پر حملے کا نہیں تھا، فقط دفاعی ضرورت سامنے تھی ورنہ اپنے کارِ دعوت کے لیے ہم قوت کے استعمال کے قائل نہ تھے ـــ دہشت انگیزی (Terrorism) کو ہمارے تحریکی کام سے دور کا بھی تعلق نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ وہ بلا ہے جو کسی بھی دعوتی، تبلیغی اور اخلاقی کام کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ ہم لوگوں کو ڈرانے دھمکانے والے نہ تھے، انھیں محبت سے ہدایت کا راستہ دکھانے والے اور بشارت سنانے والے تھے۔

پھر ان کو ایک تھیلے میں ڈالا گیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ آج جب میں اس موقع کا تصور کرتا ہوں تو ہزار اندیشے ذہن میں آتے ہیں کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" مگر اس وقت کوئی اندیشہ نہ ہوا تھا کیوں کہ ایک جذبۂ بے تاب کام کر رہا تھا۔ آئیے اس جملۂ معترضہ سے آگے نکلیں۔ جب الارم ہوا تو مولانائے محترم مع بعض رفقا کے بستی سے باہر تھے۔ وہ حسبِ عادت سیر کے لیے نہر کے کنارے چلے گئے تھے۔ اب جو الارم ہوا تو دیکھا کہ مولانا رفقا کے ساتھ لپکے چلے آرہے ہیں، اُدھر حافظ عطاء الرحمٰن (مرحوم) نابینا ہونے کی وجہ سے ایک نوجوان کے سہارے جلد جلد بستی کی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔ سب حضرات کے آتے آتے دوسری اطلاع یہ آگئی کہ حملہ وملہ کچھ نہیں، جتھا کسی اور طرف چلا گیا ہے۔ اب امن وسلامتی کا الارم ہوا۔

بعد میں، غالباً اگلی صبح کو جب فضا بہت پُرسکون تھی، اپنے یہاں سے دو ایک افراد معلوم کرنے گئے کہ قصہ کیا تھا۔ سرنا اسٹیشن اور گاؤں کی آبادی میں لوگوں سے پوچھا۔ یہی معلوم ہوا کہ ہندوؤں کا کوئی جلسہ وغیرہ تھا اور اُنھوں نے نعرے ضرور لگائے تھے مگر حملے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔

آہستہ آہستہ ہماری بستی بیرونی دُنیا سے کٹتی چلی گئی۔ ٹرینیں آنا بند ہو گئیں، بسوں کی دوڑ ختم ہو گئی، کوئی مہمان نہیں آتا تھا، پٹھان کوٹ کے قصبے سے رشتہ منقطع تھا، کسی دوسری بستی سے رابطہ نہ رہا تھا، ڈاک آنا بند ہو گئی، اخبارات عنقا ہو گئے، لے دے کے ایک ریڈیو تھا جس کے ذریعے کچھ اندازہ ہوتا کہ آزادی کس شان سے آرہی ہے، انگریز کی پالیسی کیا ہے، ہندو کیا چالیں چل رہے ہیں، خون ریزی کا سلسلہ کیسے بڑھ رہا ہے، لوگ اُجڑ رہے ہیں، کیمپ قائم ہو رہے ہیں اور قافلے چل رہے ہیں۔ تفصیل اگرچہ نہیں ہوتی تھی مگر جو کچھ نشر ہوتا اس سے نتیجے نکالے جاتے اور ایک بات کی کڑیاں دوسری خبر سے جوڑی جاتیں۔ کبھی ایسا ہوتا کہ چودھری نیاز علی خاں صاحب کے قلعے میں (ان کی کوٹھی اور باغ کا مشہور نام) کوئی افسر یا ملازم کسی مقام سے جان بچا کر آیا ہوتا تو اس کے سُنائے ہوئے حالات پہنچتے یا ہمارے ہاں کسی بستی کے لوگ یا کسی دُور کی جگہ کا

کوئی شخص پہنچ جاتا تو کچھ نئی خبریں سامنے آتیں۔ ہوتے ہوتے خبروں کا دائرہ آس پاس کی بستیوں کے متعلق محدود ہو گیا جہاں سے نکل کے آنے والے لوگ اپنے احوال سُناتے۔

اب بستی کا پورا دروبست فوجی نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ مقررہ ناکوں پر چوبیس گھنٹے پہرا رہتا، خصوصاً رات کو شدید اہتمام ہوتا۔ راجہ احسان الحق بستی کے باہمت اصحاب اور آس پاس سے آنے والے پناہ گزینوں میں سے بعض لوگوں کو چھانٹ کر پریڈ کراتے۔ ہمارے پناہ گزین دراصل ہندو سکھ زمینداروں کے تشدد کے نیچے مدتوں سے ایسے دبے چلے آ رہے تھے کہ ان کے دلوں سے ان کا خوف دُور نہیں ہوتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اگر خدانخواستہ کوئی حملہ ہو جائے تو یہ خود آگے بڑھ کے اپنے آپ کو پیش کر دیں گے کہ شوق سے مار ڈالو ہمیں۔ ایسی بے جان مخلوق کے اندر جان پیدا کرنے کے لیے احسان الحق صاحب ان کے سامنے جوشیلی تقریریں کرتے اور ان کو احساس دلاتے کہ ہمیں دیکھو، ہم کتنی تھوڑی سی تعداد میں یہاں مخالف علاقے میں گھرے ہوئے ہیں، مگر کسی کے دل میں پستی نہیں۔ جو اِدھر کا رُخ کرے گا، ہم سب کا جذبہ یہی ہے کہ اس کا منہ پھیر دیں گے۔ تم بھی اسی طرح سوچو، ورنہ ڈر ڈر میں خواہ مخواہ مارے جاؤ گے، بلکہ ہمیں بھی ساتھ لے ڈوبو گے۔

پہرے کا ایک دلچسپ واقعہ بھی سُنئے۔ دارالاسلام کی طرف پختہ سڑک سے جو بڑا راستہ آتا تھا وہ ریلوے لائن کے ایک چھوٹے سے پل کے نیچے سے گزرتا تھا۔ اس پل کے عین سامنے جہاں سے راستہ دارالاسلام کی جانب موڑ لیتا تھا، وہاں ایک پہرہ دار برچھی تھامے کھڑا تھا۔[1] اچانک تھانیدار کی سواری (غالباً کار تھی) پل کے نیچے نمودار ہوئی۔ جب وہ پہرہ دار کے سامنے پہنچی تو اُس نے برچھی آگے کر کے بڑے زور سے

---

[1] یہ پہرہ دار ایک نوجوان مستری تھا جس کا نام غالباً رشید تھا۔ اس شخص نے اپنے بچوں سمیت بڑا کام کیا اور بڑی دلیری دکھائی۔

کہا ربالٹ" (یا کوئی دوسرا لفظ) تھانیدار صاحب گاڑی سے اُترے اسے شاباش دی اور پوچھا کہ ہم مولانا مودودی سے ملنا چاہتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ اجازت لینی ہوگی بغیر اجازت آپ آگے نہیں جا سکتے، چنانچہ پہرہ دار کا نائب قاصد وہاں سے پیغام لے کر مولانا کے پاس آیا اور مولانا نے اجازت دے دی۔ تب تھانیدار صاحب کے سامنے سے پہرہ دار نے اپنی برچھی ہٹائی۔

غالباً تھانیدار صاحب یہاں کے حالات کا جائزہ لینے اور فضا کو سونگھنے کے لیے آئے تھے۔ جب وہ شخص مولانا کی طرف چلا تو اس سے قبل مولانا کے مکان کے سامنے کھڑے ہونے والے دستے نے اپنی برچھیاں بالکل متصل کھیت کی تیار فصل میں ڈال دیں تاکہ خواہ مخواہ سامنے نہ آئیں۔ خیر تھانیدار مولانا سے ملا اور رسمی سی باتیں کر کے چلا گیا۔

اب لوگ دارالاسلام کی چھوٹی سی بستی میں اِردگرد کے علاقے سے اس تیزی سے آنے لگے کہ چند روز میں وہاں جگہ نہ رہی۔ یہ سلسلہ یوں تو اوائل اگست ہی سے شروع ہوا مگر وسط اگست کے بعد لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ پناہ گزینوں کا باقاعدہ ایک کیمپ بن گیا۔ اس کیمپ کی کثیر آبادی کی خدمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے نئی صلاحیتیں عطا کیں جس کی وجہ سے آج خدمتِ خلق جماعت کا ایک بڑا شعبہ بن گیا ہے۔ مرد، عورتیں، بچے اور ان کے بے حساب مسائل تھے۔ ہمارے ہاں سال بھر کے غلے کا جو ذخیرہ تھا وہ سارا مشترک قرار دیا گیا۔ پناہ گزینوں میں سے جو لوگ راشن ساتھ لائے، مثلاً بعض لوگ بیل گاڑیوں پہ گندم کی بوریاں ہی ساتھ لائے۔ وہ بھی آنے والوں کی رضامندی سے سارا کچھ اس ذخیرے میں جمع کر دیا جاتا۔ ہر شخص اور کنبے کے لیے باقاعدہ راشن مقرر ہو گیا اور ہر روز وہ راشن ملتا۔ پانی کنوئیں کا بھی تھا، نہر کا بھی۔ لکڑی سے جنگل بھرا تھا۔ لہٰذا روٹی کی حد تک خاصی دیر تک کے لیے مسئلہ حل تھا۔ ہمارے کچھ رفیق کیمپ کی دیکھ بھال، راشن کا انتظام، صفائی کا انتظام، جگہوں کی الاٹمنٹ، علاج معالجے کی ڈیوٹیاں سنبھالے ہوئے تھے۔ یعنی ایک طرف شعبۂ دفاع اور دوسری طرف شعبۂ بحالی و انتظامِ پناہ گزیناں دوہرا کام تھا اور کڑی محنت تھی۔ تھوڑے سے آدمیوں پہ کام کا بوجھ زیادہ تھا۔ دو دو گھنٹے بمشکل سونے

کو ملتے تھے، وہ بھی کسی مورچے پر۔ خدا کا کرم یہ ہوا کہ کارکنوں کی خوراک کا انتظام بہت اچھا رہا ورنہ پس جاتے۔ آزمائش کے دنوں میں تمام گھروں سے گھی، چینی، مرغیوں، دالوں وغیرہ کا اسٹاک یکجا کر لیا گیا۔ مسلسل مرغیاں پکتی رہیں، بہترین مصالحے اور گھی کے ساتھ۔ چائے چار بار مورچوں پر ملتی رہی۔ غالباً ایک مدراسی باورچی تھا جس نے ایسی بے جگری سے کام کیا کہ ہر چیز وقت پر تیار ملتی۔

کیمپ میں ایک ایسا شخص داخل ہوا جس کے پاس کچھ کھانے پینے کی اشیاء تھیں اور وہ ان کو پناہ گزینوں میں مہنگے داموں بیچ کر چور بازاری کرتا تھا۔ (افسوس کہ اس کا نام اب مجھے یاد نہیں) اس کے متعلق معلومات حاصل کی گئیں تو رپورٹیں یہی ملیں کہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ پہلے تو تقریروں میں بات کہی گئی کہ کوئی شخص غذائی اشیاء دوسروں سے الگ کر کے نہ رکھے اور نہ دوسروں میں فروخت کرے بلکہ سب کچھ خدمت کے طور پر پیش کر دے۔ مگر اس شخص پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس کے متعلق شکایات بڑھتی گئیں۔ آخر اسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا اور اس سے دو ٹوک بات کی گئی کہ میاں! اگر اس جگہ رہنا ہے تو جو قاعدے مقرر ہو چکے ہیں ان کے مطابق سب کے ساتھ مل کر رہو اور مصیبت کی گھڑی میں نفع اندوزی نہ کرو۔ اس نے جواب دیا کہ جو چیزیں میری اپنی ہیں ان کو میں جس طرح چاہوں رکھوں یا بیچوں، کسی کو کیا مطلب۔ تب راجہ احسان الحق کے سپاہی اٹن شن ہو گئے اور راجہ صاحب نے کہا کہ میاں اٹھاؤ اپنا بستر اور سامان اور اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ، ہمارے پاس تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ بات جب یہاں پہنچی تو بے چارے نے ڈگیں ڈال دیں اور اس کا آٹا دانہ بھی اجتماعی راشن اسٹور میں جمع کر دیا گیا۔

## بابا رحمت اور اس کا حقہ

ہماری بڑی گہری دوستی ایک بابا سے ہوئی۔ غالباً اسے بابا رحمت کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ یوں کہ پہلے تو اپنے حقے نے خوب ساتھ دیا۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ تمباکو ختم ہو گیا۔ بابا رحمت حقہ گڑگڑاتا پاس آیا اور ہمیں دعوت دی۔ اس کے دیہاتی حقے سے لطف اندوز

ہوتے۔ پھر تو یہ معمول ہوگیا کہ بابا حقہ تین چار بار تازہ کرتا، تیار کرتا اور پیش کرتا۔ یہاں تک کہ اگر کسی مورچے پر ڈیوٹی ہوتی تو وہاں جا پہنچتا۔ مگر پھر ایک دن آیا کہ بابا کے پاس بھی تمباکو ختم ہوگیا۔ اب کیا ہو؟ کچھ نہیں۔ کوئی آزمائش سی آزمائش تھی۔

## دارالاسلام کا واحد شہید

ماحول کی خوف ناکی کا تصور کرنا کچھ مشکل نہیں، کیوں کہ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں سارے پہلو آگئے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی مصیبت اور تباہی کا مسئلہ چین نہیں لینے دیتا تھا اور ان کی امداد کے لیے اس آتشیں ماحول میں بھی خدا کے بندوں نے بعض نمایاں کام کیے۔ اصل میں بہت سے کمزور مسلمان ایسے تھے جن کو غیر مسلم نکلنے نہیں دے رہے تھے، اور بعض جگہ طے تھا کہ ان کو دوبارہ ہندو بنا لیا جائے گا۔ بعض جگہ سے مسلمان اپنا غلہ، مویشی، پارچات سب کچھ چھوڑ کے آگئے تھے۔ سو اس سلسلے میں مولانا کی اسکیم کے مطابق کچھ کام ہوا۔

۲۳ اگست ۱۹۴۷ء کو جنوبی دیہات کے مسلمانوں کے متعلق ایسی اطلاعات ملیں، چنانچہ ماجد احسان الحق اور ان کے بھائی محمد اسلم کو ان کی طرف بھیجا گیا کہ ان کا حوصلہ بندھائیں اور اپنے ساتھ لے آئیں یا کسی مدد کی ضرورت ہو تو بتائیں۔ یہ حضرات دیر تک نہ آئے تو سب کو پریشانی ہوئی مگر قبل اس کے کہ کوئی دوسری پارٹی بھیجی جاتی دونوں مع اپنی رپورٹ کے واپس آگئے۔

۲۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن سخت ترین دن تھا اور اس کے بعد کی رات خوفناک ترین رات۔ شروع سے بستی کے پہرے کے لیے ایک رفیق عبدالرحمٰن بہاولپوری مامور تھے۔ مضبوط تن و توش کے ساتھ جرأت و شجاعت رکھتے تھے۔ صبح صبح ایک عورت[۱] ان کے سامنے آکر روئی کہ ساتھ چل کر میرا سامان نکلوا دیں، وہاں سکھوں کا غلبہ ہے۔ مقررہ طریق کار پر عمل ہوتا تو یہ معاملہ مولانا کے سامنے جاتا، پھر ضرورت ہوتی تو مجلس میں پیش ہوتا، دو یا تین افراد کی پارٹی ترتیب دی جاتی اور باقاعدہ کارروائی کی جاتی مگر اللہ کو یہی منظور تھا کہ عبدالرحمٰن مرحوم اس عورت کی فریاد سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ گاؤں چلے گئے۔ دوپہر کو ان کی

---

[۱] عجب بات یہ کہ یہ عورت بہت اچھا لباس اور زیور پہنے ہوئے تھی جیسے ایکٹنگ کر رہی ہو۔

شہادت کی خبر آگئی۔ اس خبر کو اشاعت عام سے روکا گیا، تاکہ کمزور دل پناہ گزینوں میں زیادہ گھبراہٹ نہ پھیلے۔ پھر مولانا نے ایک پارٹی ترتیب دی جس کے ذمے یہ لگایا کہ وہ ہر حال میں ان کی میت کو حاصل کرے اور کچھ اور دوستوں کو مامور کیا کہ وہ دارالاسلام کی بستی سے ذرا ہٹ کر بستی ہی کی زمینوں میں قبر کھود کر جنازہ و تدفین کا انتظام باہر ہی باہر کریں۔

میت لانے والوں نے بتایا کہ میت جس جگہ پڑی تھی وہاں زمین پر کشمکش کرنے کے بہت نشانات موجود تھے۔ نشانات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ عبدالرحمٰن پر حملہ کرنے والے متعدد افراد تھے جن کے ساتھ عبدالرحمٰن نے شہادت سے پہلے خاصی کشمکش کی۔ عبدالرحمٰن کو جتنے زخم آئے تھے، ان کے متعلق پارٹی نے بتایا کہ سب سر و سینہ پر تھے اور پشت صاف تھی۔ بعد میں ایسی اشتباہ انگیز باتیں سننے میں آئیں جن کا مدعا یہ تھا کہ خود وہ عورت غلط کردار کی مالک تھی۔ لوگوں کے اندازے یہ تھے کہ ادھر اس نے عبدالرحمٰن صاحب کو پھانسا اور ساتھ لے گئی اور ادھر ان کو بستی سے باہر (جائے واردات پر) کھڑا کر کے سکھوں کو بتانے گئی کہ دارالاسلام کا ایک آدمی مجھے اور میرے سامان کو ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ عورت کے بجائے سکھ عبدالرحمٰن مرحوم کو مارنے کے لیے باہر آئے۔ اشتباہ اس لحاظ سے بھی بڑھا کہ وہ عورت پھر اسی گاؤں میں رہ گئی۔ اس عورت کا دھندلا سا نقشہ مجھے بھی یاد آتا ہے، اس کے چہرے پر آنسو تھے مگر بناؤ سنگھار بھی کیا ہوا تھا۔ بعد کے حادثہ نے یہی تصور دلایا کہ وہ اچھی خاصی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ اگر میری یہ یادداشتیں غلط ہیں تو خدا مجھے معاف کرے اور ان یادداشتوں کو میرے ذہن سے محو کر دے۔ قرائن کے علاوہ کوئی قطعی شہادتیں تو میرے سامنے نہیں ہیں۔

## وہ بھاری رات

اس دردناک واقعہ والے دن کے بعد کی رات بڑی بھاری اور بہت مہیب تھی جو دن کے حادثہ کے غم کے بوجھ تلے ہانپ رہی تھی۔ اندیشۂ غالب یہ تھا کہ جن سکھوں نے شرارت کا آغاز کامیابی سے کیا ہے وہ کوئی اور بڑا قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔ اس شام کو دفاعی پروگرام کی پوری تفاصیل از سر نو طے کی

گئیں۔ تمام خواتین اور بچوں کو مولانا مودودیؒ کے مکان میں جمع کیا گیا جو وسطی مقام پر تھا۔ مولانا نے خواتین سے خطاب کیا اور ان میں جذبۂ جہاد ابھارتے ہوئے کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں اس وقت تک ان شاء اللہ آپ تک کسی دشمن کی رسائی نہ ہو سکے گی، لیکن اگر ہم کام آجائیں اور ذمہ داری آپ کے سر آن پڑے تو مٹی کے تیل کے کنستر جمع کر دیے گئے ہیں، ان میں کپڑے کے گولے بھگو بھگو کر آگ لگائیں اور دشمن پر پھینکیں۔ اینٹوں اور پتھروں کا ایک ڈھیر چھت پر لگا دیا گیا کہ پہلے ان سے کام لیں اور ایسی سنگباری کریں کہ کوئی آگے نہ بڑھ سکے۔

ہم نے یہ رات جاگتے ہوئے گزاری، ہر آدمی اپنے مورچے کے ناکے پر چوکس تھا اور آس پاس کی ہر حرکت، گولوں کے دھماکوں اور ہر قسم کی آوازوں پر متوجہ تھا۔ اللہ کا کرم ہوا کہ خیر و عافیت سے یہ رات گزر گئی اور اجالا پھیل گیا۔

## پرچہ رسانی کا نظام

ضمناً مجھے یاد آیا کہ دفاعی مورچوں اور ناکوں پر ایک کمانڈر کے ساتھ دو چار رفیق ہوتے اور ایک آدمی پرچہ رساں ہوتا، یعنی اگر کوئی قابلِ توجہ بات سامنے آتی تو کمانڈر پرچہ لکھ کر ہیڈ کوارٹر کو روانہ کرتا۔ پرچہ رساں تیزی سے پرچہ پہنچا کر جواب لاتے۔ ہیڈ کوارٹر کی کمان خود مولانا کے ہاتھ میں تھی اور ان کے ساتھ بھی معاونین اور پرچہ رساں تھے۔[1]

---

[1] مثلاً ایک بار مغرب کے قریب ایک ناکے سے پرچہ مرکز کو ملا کہ ایک آدمی بندوق لیے آرہا ہے اور آس پاس کچھ لوگ جھاڑیوں میں دبکے ہوئے ہیں، اس پر کیا کارروائی کی جائے؟ مولانا کو پہلے سے شاید اطلاع تھی کہ ایک سرکاری ملازم بندوق لیے ہندوؤں کے نرغے سے بچتا بچاتا آنے والا ہے۔ مولانا نے فوراً چند افراد کی پارٹی کو بھجوایا کہ وہ جھاڑیوں میں چھپے ہوئے شرپسندوں پر نگاہ رکھیں اور آنے والے کو بحفاظت لے آئیں۔ خدا نے کامیابی دی۔ اس رات کے لیے ایک بندوق کا اضافہ ہو گیا۔ بعد میں وہ صاحب چودھری نیاز علی خاں صاحب کے قلعہ جمال پور میں چلے گئے۔

اُس دور کی دو باتیں بڑی قابلِ توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا نہ خود مغموم اور بددل اور ناامید ہوئے اور نہ یہ کیفیت کسی دوسرے میں پیدا ہونے دی۔ دوسری یہ کہ نئے اور نادیدہ حالات کے لیے فوری طور پر ایک قابلِ عمل سسٹم بنا کر اسے چلا دکھانا بھی ایک ایسی صلاحیت تھی جو مولانا کے کردار کا ایک رُخ تھی۔ ان چیزوں نے رفقا میں یہ اعتماد پیدا کر دیا کہ یہ شخص ہر قسم کے حالات اور مراحل میں اپنے منصبِ قیادت کا حق ادا کر سکتا ہے۔

## بال بال بچے

سرنا اسٹیشن پر ایک مسلمان اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ اکثر آتے اور ملتے رہتے۔ پہلے سے ان کو مشورہ دیا جا رہا کہ آپ یہاں آ جائیں مگر وہ بعض ملازمانہ مصالح کے تحت ہچکچاتے رہے۔ آخر وہ وقت آیا کہ خود انھوں نے مولانا سے درخواست کی کہ ان کے گھر کو منتقل کرنے کا انتظام کیا جائے۔ مولانا کے حکم سے ۲۵ اگست کو سید نقی علی صاحب کے ساتھ مجھے اور عبدالرحیم کو اس کام کے لیے بھیجا گیا۔

اسٹیشن پر ہم پہنچے تو ساری جگہ سنسان پڑی تھی۔ پھر یکایک ایک طرف سے ایک شخص نمودار ہوا، دوسری طرف سے دوسرا، حتیٰ کہ اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ میں برابر ان کے چہروں اور نفسیاتی کیفیات کا مطالعہ کرتا رہا۔ مجھے یکایک محسوس ہوا کہ ان کی نیتیں درست نہیں ہیں۔ ان کی باتیں بڑی بناوٹی تھیں، وہ ہنستے تھے تو ٹھٹھا کرنے کے انداز میں۔ پھر آہستہ آہستہ نقشہ یہ بنا کہ سید نقی (مرحوم) کے گرد ہندوؤں سکھوں کا ایک حلقہ سا بننے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے گھیرے میں لیا جا رہا ہے۔ سید نقی علی (مرحوم) بڑے صاف دل ہونے کے ساتھ ساتھ خاصے "متکلم" بھی تھے اور ان کا تحریکی جنون ہم سے زیادہ زوردار تھا۔ وہ ان سے رواں دواں باتیں کر رہے تھے۔ پھر جب مجھے خطرے کی بُو صاف محسوس ہونے لگی تو میں نے تھوڑے سے فاصلے سے نقی علی صاحب کو پکار کر کہا کہ جلدی کیجیے، ہمیں واپس چل کر وہاں سے ریڑھیاں لانی چاہئیں جن کے بغیر سامان نہیں لے جایا جا سکتا۔ پھر میں نے اور عبدالرحیم

نے دو قدم چل کر ایک بار اور زور سے آواز دی۔ خدا خدا کر کے وہ وہاں سے چلے اور لپک کر ہم سے آن ملے۔ اصل میں ہم نے حریف کو یہ اُمید دلا دی تھی کہ ہم ابھی پھر آنے والے ہیں۔ وہ لوگ بحث یہ کر رہے تھے کہ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب اِدھر ہی رہیں گے اور ہماری طرف سے ان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ بات یکسر جھوٹ تھی۔ وہ ان کو شکار بنانا چاہتے تھے۔ غالباً پھر زیادہ بڑی پارٹی بھیج کر اُن کے گھر کو منتقل کیا گیا۔ اگلے روز ایک سکھ پولیس افسر نے مولانا کے سامنے پیش کش کی کہ اگر آپ چاہیں تو اس جگہ کو کیمپ قرار دے کر سرکاری تحویل میں لے لیا جائے اور آپ کی حفاظت کے لیے پولیس متعین کر دی جائے۔ مولانا نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

میرے ذہن میں یہ اُلجھن ہے کہ جس پولیس آفیسر کی آمد کا پہلے ذکر کیا گیا تھا، یہ وہی تھا، یا وہ الگ قصہ تھا۔

## ایک نیا منصوبہ

پھر یوں ہوا کہ ایک دن مولانائے محترم نے ایک تجویز پیش کی۔ مولانا برابر معاملات کو سوچتے رہتے اور سوچ کر کسی بات کا فیصلہ کرتے۔ مثلاً تھانیدار کی آمد والے دن، بعد کی کسی گفتگو میں فرمایا کہ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اب ہم سے اگر کوئی ہتھیار طلب کرتا ہے تو گویا وہ ہمیں نہتا کر کے بلوائیوں سے مروانا چاہتا ہے، لہٰذا یہ طے ہے کہ ہم ہتھیار نہیں دیں گے اگر کوئی زبردستی حاصل کرنا چاہے گا تو پہلے اسی کو نشانہ بنائیں گے۔ اسی طرح ایک دن اُنھوں نے یہ تجویز بڑے عزم کے ساتھ پیش کی کہ اب جبکہ چاروں طرف کی آبادیاں بلکہ اضلاع تک مسلمانوں سے خالی ہو رہے ہیں، ہم ایک جزیرہ بن کر یہاں نہیں رہ سکتے؛ لہٰذا میرا پروگرام اب یہ ہے کہ تمام پناہ گزینوں سمیت ایک قافلہ بنا کر یہاں سے مارچ کرایا جائے اور پھر جو اور قافلے ساتھ ملتے چلے جائیں ان کو بھی شریک کیا جائے اور اگر کوئی قوت مزاحم ہو تو اس سے جذبۂ جہاد سے لڑا جائے۔ اس تجویز کو بیان کرتے وقت مولانا

کے اندر سے وہ جرنیل بول رہا تھا جس کی نشوونما الجہاد فی الاسلام کی تالیف وتدوین کے دوران میں ہوئی تھی۔

## پاکستانی کانوائے

۲۹ اگست کو جمعہ تھا، صلوٰۃ الخوف ادا کی گئی اور اس نماز کی نوعیت اور معنویت سمجھ میں آئی۔ اسی روز پچھلے پہر اچانک ریلوے پھاٹک کے پیچھے سے پاکستان کی فوجی گاڑیاں دارالاسلام کی طرف بڑھیں، سب لوگ دیکھنے لگے کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ ان کے ساتھ دو لبیں تھیں، یا ٹرک ایک کو انھوں نے دارالاسلام میں چھوڑا اور تاکید کی کہ جن لوگوں کو بھیجنا ہو ان کو جلد سے جلد تیار کرادیں، کیونکہ ہمیں صبح صبح واپس جانا ہے۔ ہماری "کونسل" میں فیصلہ ہوا کہ فی الحال صرف عورتوں اور بچوں کا قافلہ جائے گا اور ان کے ساتھ اشد ضروری قسم کی اشیاء۔ چنانچہ قافلہ نسواں کو جلد جلد تیار کرایا گیا اور یہ لوگ ۳۰ اگست کی صبح کو روانہ ہوگئے اور شام کو لاہور جا پہنچے۔ اس طرح چودھری نیاز علی خاں صاحب کی اقامت گاہ سے بھی جن لوگوں کو بھیجا جانا تھا وہ بھی چلے گئے۔ اب دارالاسلام کی دفاعی فورس پہلے سے مضبوط ہوگئی تھی۔ کیونکہ گھروں کی کوئی ذمہ داری باقی نہ تھی، ہر ایک کا معاملہ جان ہی جان تک محدود تھا۔

## کہانی کا آخری باب

اُدھر دارالاسلام سے عبدالجبار غازی مرحوم نئی صورتحال سے پہلے پٹنہ کی تربیت گاہ کو چلانے کے لیے بہار جا چکے تھے۔ حالات بگڑے تو وہ کسی نہ کسی طرح سیدھے لاہور پہنچ گئے۔ وہاں سرکاری اور فوجی حلقوں میں نفوذ کر کے انھوں نے دارالاسلام کے لیے بسوں اور کانوائے کا انتظام کرایا۔ اس کوشش میں بڑا حصہ چودھری محمد علی مرحوم کا تھا۔ اس بار مولانا مودودیؒ خود اور ان کے ساتھ بعض رفقاء لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے پیچھے راجہ احسان الحق کے ساتھ تین چار رفقاء کا ایک گروپ اس لیے چھوڑا کہ مناسب انتظام ہونے تک وہ موجود رہیں۔ پھر عملاً یہ ہوا کہ دارالاسلام کو سرکاری کیمپ بنا دیا گیا اور ادھر

کوششیں کر کے اسپیشل ٹرین بھجوائی گئی جو کیمپ کی پوری آبادی کو مع ہمارے رفقاء کے پاکستان لائی۔ جہاں تک اس وقت کی اطلاعات کی یادداشت کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ تمام لوگ صحیح سلامت پاکستان آ گئے اور شاید گاڑی پر سوار یہ قافلہ ان خال خال مستثنیٰ قافلوں میں سے تھا جو ہر قسم کے حملۂ دشمناں سے بچ کر آ گیا۔

تمام لوگوں کا بیشتر سامان وہیں رہا، دینی کتابوں کی ضروری تعداد بچائی جا سکی، مگر پھر بھی خاصی کتابیں اور کاغذات اور فائل پیچھے رہ گئے۔ ان چیزوں کو راجہ احسان الحق صاحب نے روانگی سے قبل دارالاسلام کے کنوئیں میں ڈلوا دیا تاکہ دشمن کے ہتھے نہ چڑھیں اور کسی دینی نوشتے کی توہین نہ ہو۔

## تجزیۂ مہاجرت

اپنا حال دلچسپ ہے۔ میں شروع سے غریبانہ زندگی رکھتا تھا۔ ہجرت سے مہینہ سوا مہینہ قبل بچوں کے سیلئے کوئی ایک سو گز چھپا ہوا کھدر (جس کا رواج تھا) لے گیا تھا اور سب کے کپڑے بنے تھے، یہ وہیں رہے۔ کچھ کپڑے جو دھلنے کو دھوبی لے گیا تھا وہ پھر واپس نہ آ سکے۔ چارپائیاں، بستر سب چھوڑے۔ دارالاسلام میں قمرالدین خان صاحب کا جہیز کے ساتھ آیا ہوا فرنیچر برائے فروخت پڑا تھا۔ اس کا نصف حصہ تقریباً اڑھائی صد روپیہ میں (اور ذرا اس وقت کے اڑھائی صد کی مالیت کا اندازہ کیجیے) خریدا۔ اس طرح گھر باقاعدہ گھر بنا۔ وہ بھی کچھ مقامی بھارتیوں کے لیے اور کچھ شرنارتھیوں کے سیلئے چھوڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک ہاتھ لوگوں کے اچھے اچھے فرنیچر پر تھانیدار صاحب نے مارا۔ پھر آ گئے جس کے جو ہاتھ آیا ہو گا، تقسیم ہوتی رہی ہو گی۔

یہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ نہ جاننے والوں کو اندازہ رہے کہ ہم لوگ بھی پوری طرح مہاجرین کے آئے اور بے سروسامانی سے زندگی کے نئے دور کا آغاز کیا، جبکہ نہ الاٹمنٹوں کا سلسلہ تھا، نہ لوٹ مار کے اموال کا، لیکن خدا نے اپنی نوازشات سے مسلسل بہرہ مند کیا۔

فانی دنیوی زندگی کے متعلق یہ بہترین تجربہ ہے کہ وہ چیزیں جن میں سے ایک ایک کیلئے انسان لڑتا جھگڑتا ہے اور اکثر لوگ تو ناجائز طور پر مال ہتھیانے میں لگے رہتے ہیں، موت کے وقت صحیح پیمانے پر تجربہ پیش آئے گا کہ سب کچھ چھوٹ جائے گا اور صرف ایمان و کردار باقی رہے گا۔

## سفر بسوئے پاکستان

پٹھانکوٹ سے جس بس یا ٹرک میں آنا ہوا اس میں مولانا نے محترم کے علاوہ مشہور جرمن نومسلم علامہ اسد بھی ہمارے ہم سفر تھے۔ صرف اسد صاحب ہی ایک ایسے شخص تھے جن کے پاس سگریٹ تھے۔ حافظ عطاء الرحمٰن سے دیرینہ بے تکلفی کی بنا پر انھوں نے حافظ صاحب کو شریکِ تدخین رکھا۔ مگر اپنا یہ حال کہ روانگی سے پہلے ہی تمباکو کا فاقہ چل رہا تھا ــــــ "اڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا" ــــــ اور اب اعصاب شکن سفر جس کا ماحول بہرحال خوف کا ماحول تھا، تمباکو کی پیاس کو بڑھا رہا تھا، مگر اپنی روش یہ رہی کہ نہ کبھی حقے کے لیے منت کشی کی، نہ سگریٹ کا کسی سے سوال کیا۔ وقت تھا کہ گزر گیا۔

راستے بھر میں فوجی محافظین گاڑیوں پر سوار کبھی آگے سے پیچھے کو آتے اور کبھی پیچھے سے چکر لگا کر آگے ہو جاتے، دائیں جانب کی بھی نگرانی کرتے اور بائیں جانب کی بھی۔ اس موقع پر پورے مسلمان مہاجرین کے لیے جس بے جگری اور جانفشانی سے ہمارے فوجی جوانوں نے بھولور خدمت انجام دی ہیں، اس کا اعتراف دلوں سے کبھی مٹ نہیں سکتا۔

سڑک کے اردگرد جگہ جگہ لاشیں پڑی دکھائی دیتیں، کہیں سکھ گھوڑیوں پر سوار برچھیاں کاندھوں پر لیے کوئی صندوق یا گٹھڑی سنے جاتے دکھائی دیتے، یہ گویا ہم ہی لٹ رہے تھے۔ ــــــ اور کئی دنوں سے قتل و غارت اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری تھا بلکہ بعد میں بھی جاری رہا۔

امرتسر شہر میں سے جب ہماری گاڑی گزر رہی تھی تو مراد علی شاہ صاحب کے توجہ دلانے پر یہ منظر دیکھا کہ ایک بالاخانے کی کھڑکی سے ایک سکھ نوجوان رائفل آگے بڑھائے ہماری گاڑی پر فائر کرنا چاہتا ہے اور پیچھے اس کا کوئی بھائی یا باپ اس کی رائفل کو کھینچ

اور اسے بار بار نشانے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ظاہر تھا کہ اگر خدانخواستہ کوئی فائر ہو جاتا تو پاکستان کے فوجی جوان بھی سٹین گنوں یا مشین گنوں کے دہانے کھول دیتے، لیکن بہر حال یہ اللہ کا کرم ہوا کہ کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہوئی۔

آخر جب ہم لوگ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے تو واقعی یہی احساس تھا کہ ایک جہنم سے نکل کر چمن زارِ حیات میں داخل ہو رہے ہیں۔

ہماری عارضی فرودگاہ گوالمنڈی کی ایک متروکہ عمارت تھی، جہاں خواتین اور بچے پہلے سے جمع تھے۔ ہندو جائنٹ فیملی سسٹم کے مطابق یہ ایک بڑا دو منزلہ گھر تھا۔ اس میں بڑا سامان ہوگا مگر لُٹ چکا تھا۔ بڑی بڑی پیٹیاں تھیں جو خالی پڑی تھیں، سیف ٹوٹا پڑا تھا۔ اس میں دو ایک دن ہم نے گزارے۔

## سوہن لال کالج

اس دوران میں کچھ اصحاب نے تگ و دو کی اور دارالاسلام کے ادارے کے جواب میں سوہن لال کالج کی عمارت الاٹ کرائی۔ یہ واحد الاٹ منٹ تھی جس کے تلخ تجربے کے بعد مولانا مودودیؒ نے اصولاً یہ طے کر دیا کہ کوئی الاٹ منٹ نہ کرائی جائے اور یہ فیصلہ ہمارے لیے ہزار جھمیلوں سے بچنے کا ذریعہ بنا۔

سوہن لال کالج میں ہم اور ہمارے اہل و عیال صرف چند روز رہ سکے۔ مجھے اور نقی علی صاحب کو وہ دو منزلہ کوارٹر الاٹ ہوا جو لیک روڈ پر کھلنے والے شمالی گیٹ سے متصل تھا۔ نچلی منزل ان کو ملی اور اُوپر کی مجھے۔ اس وقت کے معیار کے لحاظ سے عمارت بہت نفیس تھی۔ اگرچہ ہم معمولی درجے کے کوارٹر میں تھے، مگر سب کچھ پختہ اور صاف ستھرا اور خوبی سے ڈیزائن کیا ہوا تھا۔

انھی دنوں مدرسۃ البنات جالندھر کے مولانا عبدالحق مرحوم اور ان کے کچھ افراد آئے اور مشکل حالات میں تھوڑا سا تعاون چاہا، یعنی جب تک مدرسہ کے لیے کوئی جگہ الاٹ ہوتی ہمیں وہاں ٹھہرنے کی گنجائش دی جائے۔ مولانا نے بڑی خوشی سے دروازے کھول

دیے۔ مگر کچھ ہی دنوں میں یہی کالج مدرسۃ البنات کو الاٹ کر دیا گیا اور ہمیں یہ آرڈر دیا گیا کہ ۴۸ گھنٹے میں عمارت خالی کر دی جائے۔ اس پر مولانا نے احتجاجاً یہ فیصلہ کیا کہ ۴۸ کے بجائے ۲۴ گھنٹوں میں اسے خالی کر دیا جائے اور آئندہ کبھی کوئی الاٹ منٹ نہ کرائی جائے کیونکہ اس طرح رگِ جاں تو وزارتوں اور بیورو کریسی کے پنجے ہی میں رہے گی۔

## ایک یادگار واقعہ

اس زمانے کا ایک یادگار واقعہ یہ ہے کہ سوہن لال کالج کے سامنے واقع یونیورسٹی گراؤنڈ میں قائدِ اعظم کی تقریر ہوئی۔ حاضری بہت زور کی تھی۔ پورا گراؤنڈ بھرا ہوا تھا۔ سڑک پر گاڑیوں کی قطاریں تھیں۔ اس جلسے کے لیے میرے والا کوارٹر تو گویا خاص طور پر دزیٹرس گیلری ثابت ہوا۔ پورا جلسہ آنکھوں کے سامنے تھا اور قائدِ اعظم اسٹیج سے تقریر کر رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر آواز پہنچا رہے تھے۔ یہ اوائل ستمبر کا زمانہ تھا۔

## جماعت کا نیا میدانِ کار

آگے کی بات بیان کرنے سے قبل ایک اور قصہ!

سوہن لال کالج کے زمانے میں ایک طرف تو مولانا نے نواب ممدوٹ صاحب سے مل کر کہا کہ اب وقت ہے کہ آپ حضرات فوجی قوت سے کٹھوعہ روڈ کاٹ دیں، ورنہ کشمیر ہاتھ سے جاتا رہے گا، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

دوسری طرف مولانا نے جماعت لاہور کا اجتماع طلب کیا اور اس میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ہم آرام کرنے نہیں آئے ہیں، اور نہ اس وقت دعوتی کام اس نہج اور رفتار سے ہو سکتا ہے جس سے اب تک ہوتا رہا ہے۔ اس وقت مصیبت زدہ مہاجرین سب سے زیادہ قابلِ توجہ مسئلہ ہیں۔ اس کام کا نقشہ طے ہوا۔ دو پارٹیاں والٹن کیمپ اور بادلی کیمپ کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے مقرر کی گئیں۔ پھر دونوں جگہوں کے لیے ٹیمیں بنا کر خدمتِ مہاجرین کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ کھانا اور کمبل تقسیم کرنے سے لے کر علاج معالجے تک بلکہ مرنے والوں

کی تجہیز و تکفین تک کے سارے کام کارکنانِ جماعت کی مختصر پارٹیاں انجام دیتیں۔ ان کی ڈیوٹیاں بدلتی رہتیں۔ اس گروہ کے کام کے پہلو واضح تھے: ایک یہ کہ اس میں اپنے لیے فائدے اٹھانے والا کوئی نہ تھا بلکہ اپنے خرچ پر آتے اور اپنا کھاتے اور کام کرتے۔ دوسرے یہ لوگ تقسیم ہونے والی اشیاء کو کسی بھیڑ میں شور ہنگامے کے ساتھ تقسیم کرنے کے بجائے، پہلے مہاجرین میں گھوم پھر کر ہر ایک کی ضرورت کو نوٹ کرتے، اس کے نام کی پرچی جاری کرتے اور ایک مرکز سے غذائی یا استعمالی سامان تقسیم کرتے، بصورتِ دیگر خود ہر مہاجر ڈیرے یا فرد تک جا کر اسے اس کا حق پہنچا دیتے۔ افراتفری کے بجائے یہ منظم کام تھا۔

خدمت پارٹیوں کا ایک حصہ وہ تھا جو سیدھا واہگہ بارڈر پر پہنچتا۔ وہاں پاکستان آنے والے مسلمانوں کو پانی پلانے، ان کے کھانے کے انتظامات میں مدد دینے اور ان میں سے جو بیمار ہو کر پہنچتے ان کا علاج کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ حکیم شیر محمد مرحوم نے بہ حیثیت معالج اس محاذ پر فرض انجام دیا تھا۔[1]

بعض لوگ ساتھیوں کی لاشیں ساتھ لاتے اور بعض مہاجر بارڈر پار کرنے کے بعد جاں بحق ہو جاتے۔ ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام بھی کیا جاتا۔

ہر گروپ کی رپورٹیں مسلسل مولانا کو موصول ہوتیں اور ان پر غور و خوض کر کے راہِ عمل طے کی جاتی۔ ان رپورٹوں میں ایسی شکایات کا بھی ذکر ہوتا کہ دودھ یا دوسری غذائی اشیاء وہاں کام کرنے والے سرکاری کارکن خود اپنے لیے بہ حصہ وافر حاصل کرتے ہیں۔ نیز کارکنوں نے ایسے مناظر بھی دیکھے کہ شہر کے لوگ مہاجر لڑکیوں کو جا جا کر گھورتے۔

---

[1] حکیم شیر محمد صاحب کی ایک بات مجھے یاد ہے جسے میں یہاں نوٹ کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ فرماتے تھے کہ ہیضے کے مریضوں کا بہت ہی کامیاب علاج یہ زیرِ تجربہ آیا کہ سالم سرخ مرچ کڑوے تیل میں بھگو کر نگلوا دی جاتی۔ عموماً ایک ہی خوراک میں آرام ہو جاتا۔ تفصیل مجھے یاد نہیں۔ اگر جدید ڈاکٹر صاحبان اس پر تحقیق کریں تو اچھا ہو۔

بعد میں لاہور سے باہر کے کارکنان کو بھی بلا کر اس خدمت میں لگایا گیا۔ اس کام کے کرنے سے نہ صرف کارکنانِ جماعت میں وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنے کا شعور پیدا ہوا بلکہ ان کے کردار کی نشو و نما ہوئی۔

آپ خیال کریں کہ ہیضے سے مرنے والوں کی لاشوں کے قریب تک لوگ نہیں جاتے تھے، ایسے میں ان کو اٹھوانا، سنبھالنا اور تجہیز و تکفین کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ یہی خدا پرستی اور اسلامی اخوت اور انسان دوستی کے بغیر اسے انجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

متوازی طور پر خدمت کا ایک دوسرا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ اس زمانے میں لاہور شہر میں غلاظت کے جا بجا انبار لگے تھے۔ خاکروب غائب ہو گئے تھے۔ کارپوریشن کا نظام معطل تھا۔ عوام میں شہریت کا پختہ شعور موجود نہیں تھا (اور نہ اب ہے)۔ اس لیے طے پایا کہ دو ایک پارٹیاں شہر کے مختلف حصوں سے گندگی ہٹانے کا کام کریں۔ کدالیں آہنی تسلے اور ٹوکریاں حاصل کی گئیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک گروپ وہ تھا جس کی ڈیوٹی غالباً عبدالجبار غازی صاحب کی سرکردگی میں اندرون موچی دروازہ کے کسی علاقے میں لگی تھی۔ اس گروپ میں شمولیت کی تھوڑی سی سعادت مجھے بھی ملی۔ کچھ لوگ کدالیں لیے گندگی اور کوڑے سے تسلے یا بالٹیاں بھرتے، کچھ اُٹھا کر آگے لے جاتے، کچھ انھیں کسی مناسب گڑھے میں پھینک کر خالی تسلے واپس کر دیتے۔

لوگ جو گزرتے وہ تماشا دیکھ کر حیران ہوتے کہ صاف ستھرے لباسوں میں (اور غالباً غازی صاحب شیروانی بھی پہنے ہوئے تھے) پڑھے لکھے لوگ عجیب کام میں لگے ہیں۔ کچھ لوگ ریمارک پاس کرتے کہ انھوں نے کارپوریشن کے ساتھ کوئی ٹھیکہ وغیرہ کیا ہوگا؟ کچھ کہتے کہ کوئی بڑا پُراسرار کھیل ہے، کچھ تحسین کے کلمات کہتے اور اکا دکا افراد ایسے بھی نکلے جو کام میں شریک ہو گئے۔

اس تجربے کی روشنی میں میں یہ کہتا ہوں۔ دعوتی لحاظ سے بھی نہ صرف اس طرح کے کام رابطۂ عوام کا نہایت موزوں ذریعہ ہو سکتے ہیں، بلکہ دعوتِ حق اس قسم کی محسوس مگر بے لوث خدمات کے ساتھ سامنے آتی ہے تو اس کا اثر بڑھ جاتا ہے۔

## خیمہ بستی

سوہن لال کالج کو چھوڑ کر ہم لوگ اسلامیہ پارک جا پہنچے۔ اُس زمانے میں ڈاکٹر ریاض قدیر صاحب کے مکان کے قریب ایک خالی میدانی قطعۂ زمین تھا اُس میں خیمے لگوالئے گئے۔ درمیان میں ایک بڑے خیمے میں مولانا اور قیم جماعت کے دفاتر وغیرہ تھے۔ زمانہ برسات کا تھا۔ ایک مرتبہ زور کی بارش ہوئی خیموں کے اندر بھی پانی بھر گیا۔ خواتین اور بچوں کو ساتھ ہی ایک مستری صاحب کے مکان میں منتقل کیا گیا۔ بعد میں جو رات بھی وہاں گزاری، کم سے کم مجھے یہ محسوس ہوا کہ فرش پر لیٹے ہوئے ہڈیوں کے دُکھنے کے ساتھ ٹھنڈی سیلن بدن پر حملہ آور ہے مجھے شدید سردی لگتی۔ میری اہلیہ بچوں کو کپڑوں میں لپیٹنے کے علاوہ مجھے بھی بطورِ خاص کھیس وغیرہ فراہم کرتیں[1]

اس بستی کے دورانِ قیام کا یہ منظر نہیں بھولتا کہ ہمارے سامنے ہی آدھے فرلانگ یا کم فاصلے پر مہاجرین کی لاشوں کے بھرے ہوئے ٹرک آتے، ان لاشوں کو زمین پر ڈالا جاتا اور اوپر سے مزدور ٹیلے کھود کھود کر کافی مٹی گرا دیتے۔ اس منظر کو دیکھ کر طبیعت بہت خراب ہوتی۔ تحریکِ پاکستان کے لیے کام کرنے والوں کی قربانیوں کی یہ ایک چھوٹی سی جھلک کپکپی طاری کر دیتی تھی۔ ان قربانیوں ہی نے پاکستان کی قدر و قیمت بڑھائی اور ہر کسی سے منوائی۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی قیمت دے کر جو کچھ حاصل کیا گیا ہے اس کا نقصان کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس گوارا نہیں کر سکتا۔[2]

---

[1] واضح رہے کہ لاہور آنے کے کچھ ہی بعد اس طرف کے رفقاء نے اپنی طرف سے ہماری ضروریات پورا کرنے کے لیے بہت کچھ کیا۔ جلد ہی ہمیں ایک ایک دو دو بستر اور کھیس وغیرہ مل گئے۔ مگر ٹھنڈی سیلن توشک کو بھی عبور کر آتی تھی۔

[2] مدعا یہ کہ پاکستان کا نقصان جہاں یہ ہے کہ اس کی ایک انچ زمین بھی خدانخواستہ ہمارے

(بقیہ ص ۳۴۹ پر)

خیمہ بستی کے زمانے میں مہاجرین کی خدمت کا کام جاری رہا۔ فی سبیل اللہ کام کرنے کے اس جذبے نے کسی کو یہ مہلت ہی نہ دی کہ وہ ذاتی مشکلات کی طرف توجہ کر سکے اور مفاد حاصل کرنے کی کشمکش کے میدان میں اترنے کا خیال بھی دل میں لائے۔ یہ کام اس وقت تک جاری رہا جب تک مہاجرین کے قافلے آتے رہے اور کیمپوں میں ہجوم رہا۔ بعد میں جب کام قدرے سمٹ گیا تو سرکاری عملے نے پوری طرح اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یوں بھی کچھ اچھا نہ لگتا تھا کہ ایسے لوگ ان کے ساتھ کام کریں جن کا احساسِ وجود ان کے حسبِ منشا کام چلانے میں حائل ہو جاتا ہو۔

خیمہ بستی کو اگرچہ ڈاکٹر ریاض قدیر اور ان کے برادر بزرگ اور پڑوس کے مستری صاحب کے علاوہ محلے کے تمام شریف گھرانوں کا تعاون حاصل تھا مگر ستمبر کی بارشیں جن کے ساتھ ٹھنڈی ہواؤں کے جھکڑ ہوتے، ان کی وجہ سے خیموں میں راتیں گزارنا آسان نہ تھا۔

آخر تگ و دو کر کے کرائے کی ایک کوٹھی اچھرہ میں حاصل کی گئی جو ۵۔ اے ذیلدار پارک کے نام سے تاریخ کا ایک باب بن گئی۔

شروع میں سارے گھروں کیلئے کرایوں کے مکانوں کا انتظام مشکل تھا، لہٰذا ایک

---

(صـ ۳۴۶ کا بقیہ)

ہاتھوں سے جائے یا اس کی وحدت و سالمیت پر آنچ آئے، وہاں پاکستان کے مقصدِ وجود کے لحاظ سے یہ بھی بڑی تباہی ہے کہ اسے اس کی نظریاتی بنیادوں سے اکھیڑ دیا جائے اور اس پر کوئی غیر اسلامی نظام مسلط کر دیا جائے۔ اسی طرح پاکستان کے اندر اس کے کسی باشندے کا ظلم کا شکار ہونا یا خوف میں گرفتار ہونا بھی پاکستان کا نقصان ہے۔ اسی لیے ہم لوگوں نے اپنی بنیادِ فکر یہ اختیار کی کہ یہ خطۂ زمین ایک وقف مسجد کی طرح ہے اور اس کے وجود اور حرمت کا تحفظ ہم پر فرض ہے۔ اس کے اندر اگر اقامتِ صلوٰۃ کے بجائے لہو و لعب کے ہنگامے ہونے لگیں تو انھیں روکنا اور معاملات کو صحیح راستے پر ڈالنا بھی ہر محبِ پاکستان کا فرض ہے۔ اس کے ساتھ یہ تصور بھی ابھرتا ہے کہ پاکستان کے باشندوں کا جمہوریت اور انسانی حقوق سے محروم ہو کر کسی جبریت کا شکار ہو جانا مقصدِ پاکستان اور منشائے آزادی کے خلاف ہے۔

گروپ کو راولپنڈی میں ذیلی مرکز قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ جس میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا مسعود عالم ندوی (مرحوم) اور عبدالجبار غازی صاحب کے علاوہ بھی دو تین ساتھی تھے۔ مجھے ذاتی طور پر مشکل پیش آئی، کیونکہ ایک تو میرے پاس کوئی کام نہ تھا، نہ جماعت کا اور نہ جریدہ نگاری کا۔ تمام نظام درہم برہم تھا۔ اس لیے میں نے اپنا بار یوں ہلکا کیا کہ اہل وعیال کو غالباً پنڈی جانے والے گروپ کے ساتھ ہی اپنے قریبی عزیزوں کے ہاں بھجوا دیا۔ اُنھوں نے کئی دن مختلف گھروں میں اور مختلف مقامات پر گھومتے گھماتے اور ملتے ملاتے گزارے۔ اقربا میں قرابت داری کا جذبہ بھی موجود تھا اور پھر یہ تو لُٹا پٹا مہاجر قافلہ تھا، بہت اچھا سلوک کیا گیا۔ اِدھر میں اس تگ ودو میں لگ گیا کہ کام کی بیل بنے۔ آخر ملک نصراللہ خاں (مرحوم) کا اخبار جس سے میرا قلمی رابطہ مسلسل چلا آرہا تھا، بحال ہوا تو اُنھوں نے مجھے ساتھ لے لیا۔ اب مکان کی تلاش شروع ہوئی، کرایہ ادا کرنے کے لیے آمدنی کافی نہ تھی، سوچا کہ کچھ عرصے کے لیے الاٹ منٹ کی کوئی جائز صورت نکالی جائے، کیونکہ میری تعبیر کے مطابق بظاہر الاٹ منٹ کرانے پر جماعتی پابندی افراد کے لیے نہیں تھی۔ پوچھتے پاچھتے معلوم ہوا کہ ایک پکے مسلم لیگی الاٹ منٹ افسر کنور شفیق اللہ صاحب کا دفتر پاس ہی ہے جو جماعت کے لوگوں کے لیے مسلم لیگیوں والا تلخ نقطۂ نظر نہیں رکھتے بلکہ اچھی رائے رکھتے ہیں۔ ان کے پاس پہنچا۔ میں نے کہا کہ کوئی خالی مکان ہو تو الاٹ کر دیجیے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ دفتر کے قابو سے تمام معاملہ باہر ہے۔ ہم کسی خالی مکان کا پتہ نہیں بتا سکتے، آپ کوئی خالی مکان تلاش کرکے اس پر قبضہ کریں اور چِٹ حاصل کر لیں۔ میں اس کشمکش کا آدمی تھا نہیں، میں نے خیال چھوڑ دیا۔ آج میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس چکر سے بچ نکلا، ورنہ بعد میں مشکلات پیش آتیں۔ اس طرح کی ہر آزمائش (جس کی جائز صورتیں بھی تھیں) سے اپنے دامن کو اب پاک دیکھ کر بڑا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس زمانے میں میں جماعت کے مہمان خانے میں رہا۔

کچھ ہفتوں بعد ذیلدار پارک ہی میں بڑے مہنگے کرائے پر سر چھپانے کی ایک جگہ لی تو میں نے اہل وعیال کو بلوا لیا۔ پھر آہستہ آہستہ دوسرے رفقا نے بھی آس پاس کے علاقوں

میں مکان کرائے پر لے لیے۔ اسی دوران میں ایک موقع پیدا ہوا کہ میاں طفیل محمد صاحب اور عبدالوحید خاں صاحب کے ساتھ میرا گھر بھی "۱۲ شاہ جمال" میں جا آباد ہوا۔ یہاں ہمارا خاصا دور گزرا، تقریباً دس سال۔ یہیں سے ۱۹۵۲ء میں میاں صاحب، عبدالوحید خاں صاحب اور میری گرفتاری عمل میں آئی۔

# اچھرہ میں نئی پھیلی ہوئی بستی

آہستہ آہستہ اندرونِ اچھرہ، ذیلدار پارک، شاہ جمال اور ملحقہ علاقوں میں مختلف رفقاء اور ہمدرد جمع ہو گئے۔ ایک اجتماعی ماحول پیدا ہو گیا، ۵۔ اے ذیلدار پارک میں درس بھی ہونے لگا اور حکومت نے جو جہادِ کشمیر ہمارے خلاف لڑا اسے ہم نے یہاں کی اجتماعیت کے بل پر بخوبی بھگتا۔ اپنے اوپر آنے والے وار ہم نے حریف قوت پر اُلٹ دیے۔ اچھرہ میں مختلف معزز لوگوں اور عوام اور دکانداروں سے ہمارے مراسم بڑھتے گئے اور بحیثیت مجموعی لوگ ہماری عزت کرتے۔ مخالفت کے بڑے بڑے ہنگامے اُٹھتے اور گالیوں کے طوفان آتے مگر کچھ عرصہ زور دکھا کر سروں سے گزر جاتے۔ مسجد رسول پورہ میں مولانا مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ نمازیں ادا کرتے جہاں مخالفت کا ایک بڑا اڈا تھا۔ مرحوم ملک میران بخش ؎ (خدا انھیں معاف کرے) اور مولوی طارق صاحب خاص طور پر بہت

---

؎ ملک میران بخش کی وفات پر ہمیں واقعی رنج ہوا اور ہم اُن کے جنازے میں شریک ہوئے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ ایک دلچسپ سلسلۂ نوازشات رُک گیا بلکہ اس لیے بھی کہ ان کی مخالفانہ باتیں بزرگانہ بھولپن کی آئینہ دار تھیں۔ میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ وہ اپنے خاص احساسات کے چکر میں اس طرح آ گئے تھے کہ کسی گہری ٹھنڈی سوچ بچار کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک ریکارڈ بج رہا ہے اور اس کی سوئی ایک جگہ پھنس گئی ہے۔ چونکہ ان کا ذہن شر پسندانہ نہیں تھا اس لیے ہمیں اُن کی باتوں پر غصہ نہیں آتا تھا۔ بعض دوسرے اصحاب کا رویہ مختلف تھا۔

تنگ و ترش ہوتے اور مولانا اور جماعت کے خلاف چہ میگوئیاں کیا کرتے اور پھر ان کی باتیں وعظ و درس میں منعکس ہوتی رہتیں۔ خاص طور پہ ملک صاحب بعدِ نماز کی دُعا کے وقت بطورِ خاص امام و خطیب سے باآوازِ بلند کہتے کہ غداروں کے خلاف دُعا کریں۔ اور ان کا اشارہ جلی طور پہ ہماری طرف ہوتا، مگر عام نمازیوں میں ہمارے ہمدردوں کی تعداد خاصی بڑھی۔

اس طرح مولوی محمد عمر اچھروی (مرحوم) لاہور کے باہر بھی جابجا ہمارے خلاف زبردست مواعظ اور تقاریر کرتے پھرتے، انہی کا مقولہ ہے کہ ان لوگوں کو دو دو لاکھ روپے کے منی آرڈر بھارت سے آتے ہیں۔ ایک بار انھوں نے اچھرہ کے مین بازار کے سرے پر جلسہ کیا اور تقریر میں لوگوں کو سخت اکسایا کہ یہ لوگ جو تبلیغ کے لیے آتے ہیں ان کی بات نہ سنیں، ان کی خواتین کو دھکے دے کر نکال دیں۔ یہ باتیں ایک دینی آدمی کے شایانِ شان نہ تھیں۔ چنانچہ ان کا اثر بھی کچھ زیادہ نہیں ہوا بلکہ وعظ کے بعد ہم نے ان کی مغالطہ انگیزیوں کے جواب میں خاص خاص پمفلٹ لوگوں میں تقسیم کیے جنھیں پڑھ کر عوام نے محسوس کیا کہ وعظ میں غلط تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس طرح کی ہر مخالفانہ کوشش کے نتیجے میں کام کا میدان پیدا ہو جاتا اور ہم سہم کر بیٹھ رہنے کے بجائے لوگوں میں جاجا کر اور زیادہ دعوت پھیلاتے۔

۵۰ اے ذیلدار پارک میں درسِ عصر کے بعد محفل لگنے کا سلسلہ اُسی زمانے میں شروع ہوا۔ یہ ایک نئی طرز کا تجربہ تھا اور خوب کامیاب رہا۔ کسی آدمی کا ہر روز قسم قسم کے مخالف و موافق آدمیوں کے درمیان بیٹھنا اور ان کے رنگارنگ سوالات کے فی البدیہہ جواب دینا کوئی آسان چیز نہیں ہے۔ سوالات دینی بھی ہوتے، فقہی بھی اور سیاسی و معاشی بھی، نیز ذاتی قسم کے مسائل سے متعلق بھی۔ ساتھ ہی مخالفین کی نکتہ طرازیوں کا تذکرہ بھی۔ یہ محفل ایک ایسی کسوٹی تھی کہ اگر کوئی کھوٹا یا کمزور آدمی ہوتا تو چار دن میں ٹاٹ لپیٹ لیتا۔ یہ محفل خود مولانا کی عظمت کی ایک دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس طرح کے تجربے کو نبھا سکیں، خواہ وہ کیسے ہی عالم و مفکر کیوں نہ ہوں۔ مولانا نے اس پسندیدہ مشغلے کو ساری عمر جاری رکھا۔ یہ مشغلہ نہ تھا بلکہ دعوت ہی کے کام کا ایک حصہ تھا۔

## ایک عارضی بستی ماچھی گوٹھ

ماچھی گوٹھ ریاست بہاول پور میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کراچی جاتے ہوئے صادق آباد سے آگے کا پہلا چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ مسافر گاڑیاں دو ایک منٹ کے لیے ٹھہرتی ہیں، لیکن پاکستان کے نقشے میں یہ نقطۂ نامعلوم یکایک اُبھر آیا ہے اور اسے ایک تاریخی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ نام اخباروں میں نمایاں ہوا، سی آئی ڈی کی رپورٹوں میں درج ہو گیا، اور ہمارے جماعتی لٹریچر میں اب اس کے لیے ایک اہم جگہ پیدا ہو گئی ہے۔
اور برسوں تک ہم اور ہمارے بعد میں آنے والے لوگ ماچھی گوٹھ کے اجلاس کا حوالہ دیا کریں گے کہ وہاں یہ اور یہ فیصلے ہوئے تھے۔ اصل میں ماچھیوں اور مچھیروں سے تحریک اسلامی کا تعلق بڑا پرانا ہے۔ یہ تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قائم فرمایا تھا۔ آپ نے معاشرے کے اُونچے طبقوں کو بنجر پاکر دعوت کا رُخ ماہی گیروں کی طرف پھیر دیا اور اُن کو پکار کر کہا کہ آؤ تم کو آدمیوں کا شکار کرنا سکھاؤں۔ یہ تعلق کم از کم ذہنی طور پر ایک بار پھر تازہ ہو گیا ہے۔

اس مقام پر ایانی فیکٹری (جس کے مالک مشہور لغاری خاندان کی ممتاز ترین شاخ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ایانی کہلاتے ہیں) کے احاطے میں جماعت اسلامی کے ارکان کا کل پاکستان اجلاس ۱۷ تا ۲۱ فروری ۱۹۵۷ء منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں تحریک اسلامی کی پچھلی پندرہ برس کی تاریخ کا جائزہ لے کر آئندہ کے لیے

---

[1] چونکہ ماچھی گوٹھ نامی چھوٹی سی بستی میں تحریک ایک نازک موڑ سے گزری تھی، اس لیے ریکارڈ کو واضح کرنے کے لیے اس کا تذکرہ بھی کیا جا رہا ہے۔

خطوطِ کار متعین کیے گئے۔ یہ تاریخی اجلاس حسبِ ذیل امتیازات کی بنا پر غیر معمولی نوعیت رکھتا ہے:

——— یہ اجلاس ارکان کے والہانہ جذبہ کا ایک روشن ثبوت ہے کیونکہ حاضری کا تناسب دوسری جماعتوں کے مقابلے میں ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مالی مشکلات کے باوجود (مشرقی پاکستان کے لیے شرکتِ اجلاس کی غیر معمولی مشکلات بھی پیشِ نظر رہیں) کثیر تعداد میں ارکانِ جماعت حاضر ہوئے جن میں خواتین بھی تھیں، کچھ لوگ بیمار اور ضعیف تھے اور ایک دو رفقاء تو بالکل نابینا تھے۔

——— یہ اجلاس ایسے عالم میں ہوا جبکہ ارکانِ جماعت بعض وجوہ سے سخت ذہنی اضطراب میں مبتلا تھے، مگر اس کے باوجود صبر و سکون، ضبط و نظم کی حدود میں رہتے ہوئے بڑی خوبی سے اہم ترین فیصلے کیے گئے۔

——— اس اجلاس میں جماعت کی پالیسی ایک چار نکاتی لائحہ عمل ——— دعوت الی اللہ، توسیع و تنظیم، اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ ادارۂ حکومت ——— کی شکل میں صرف پندرہ آراء کے اختلاف کے ساتھ طے پائی۔ ارکان نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ بھی دے دیا کہ پالیسی کے ان چار اجزاء میں سے کسی کو بھی ساقط، معطل یا مؤخر نہیں کیا جا سکے گا۔ خصوصاً انتخابات کے بارے میں پوری طرح صراحت کر دی کہ جماعتِ اسلامی ان سے بے تعلق بہرحال نہیں رہ سکتی، اسے بالواسطہ یا بلاواسطہ، یا دونوں طرح حصہ ضرور لینا ہوگا البتہ ہر انتخاب کے موقع پر اس امر کا تعین کہ تینوں میں سے کس صورت کو اختیار کیا جائے، جماعت کی مجلسِ شوریٰ کی ذمہ داری ہوگی۔ اس فیصلے سے جماعت تذبذب سے نکل کر یکسوئی و یک جہتی کے مقام پر آگئی۔ اس قرارداد نے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے کر دیا ہے کہ جماعتِ اسلامی محدود معنوں میں مذہبیت ن علمبردار نہیں بلکہ وہ تحریکی پیمانے پر نظریۂ اسلامی کو لے کر اٹھی ہے اور

نظامِ حیات کو اس کے تمام شعبوں سمیت عملاً بدلنا چاہتی ہے ——

اس اجلاس میں امیرِ جماعت اور مجلسِ شوریٰ سے اختلاف کرنے والے رفقاء کو اظہارِ رائے کا جو آزادانہ موقع حاصل رہا، اس نے ہماری جمہوری روایات کو مستحکم کر دیا ہے۔

—— گزشتہ چند ماہ سے جماعت کے اندر اختلاف و انتشار پائے جانے اور گروہ بن جانے کے چرچے مخالف حلقوں میں ہو رہے تھے، اس اجلاس کے فیصلوں نے ان کو بالکل یاوہ بنا دیا ہے۔

—— جماعت کے دستوری ڈھانچے میں تغیر کرنے والی قرار دادیں بہت ہی مختصر بحث کے بعد جس درجے کے اتفاقِ رائے سے نہایت خوشگوار فضا میں ارکان نے طے کی ہیں وہ گواہ ہے کہ اس جماعت کا اجتماعی ذہن پیشِ نظر مسائل و معاملات کو کیسی یک جہتی سے سوچتا ہے اور نئی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کتنا وسیع اجتہادی ظرف رکھتا ہے۔ ہماری جماعتی ذہنیت نہ تو جمود کا شکار ہوئی ہے نہ انتشارِ فکر کی!

—— امیرِ جماعت کے استعفیٰ کو زیرِ غور لاتے ہوئے صد فی صد اتفاقِ رائے سے امیرِ جماعت پر اعتماد کا اظہار کیا گیا اور موصوف کو استعفیٰ واپس لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس طرح جماعت اور اس کا قائد باہم دگر پہلے سے زیادہ قریب ہو گئے اور مخالفین کی پھیلائی ہوئی غلط افواہوں کا بالکل صفایا ہو گیا۔

—— امیرِ جماعت نے چھ گھنٹے کی تقریر میں تحریک کی تاریخ اور جماعت کے طے کردہ سفر کی رُوداد شرح و بسط سے بیان کر کے منزلِ مقصود کو اور زیادہ متعین اور اس کی طرف جانے والے راستے کے نقوش کو اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے۔ اس تقریر نے ماضی اور مستقبل کو ایسا مربوط کیا ہے کہ اب نئے آنے والے شرکائے سفر بھی یہ محسوس کریں گے کہ گویا وہ پچھلے سارے

سفر میں خود شریک رہے ہیں۔

——اس اجلاس نے جماعت کے اندر یہ اعتماد بھی پیدا کر دیا کہ خدا کے فضل سے یہ جماعت کسی دورِ اضطراب کو پار کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

——یہ جو کچھ ہوا اس میں جتنا بھی خیر ہے وہ اللہ کی مہربانی ہے اور اس میں جو کچھ بھی نقص رہا وہ ہماری خطاؤں اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔ ہم پچھلی نوازشات پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے آئندہ کے لیے اُس سے رہنمائی کی دُعا کرتے ہیں۔

## تازہ بستیاں آباد

یہ تمنا تو مولانا مودودیؒ اور تمام حلقۂ جماعت میں شروع سے موجود رہی ہے کہ تحریکِ اسلامی کا ایک مرکز ہو جہاں ضروری دفاتر کی جگہ بھی ہو اور مرکزی اسٹاف کے لیے رہنے کے کوارٹر بھی ہوں۔

شروع میں دارالاسلام پٹھان کوٹ کے بارے میں ایسی توقعات تھیں، مگر بعد میں ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی دوسری جگہ انتظام ہونا چاہیے۔ چنانچہ مشوروں اور تگ و دو کے بعد کیمبل پور میں ایک قطعۂ زمین اس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا۔ بعد میں گوجرانوالہ کے قریب ایک جگہ دیکھی گئی، لیکن جماعت ایسی نئی صورتِ حالات کی طرف آگے ہی آگے بڑھتی گئی کہ لاہور کو چھوڑنا ممکن نہ رہا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ذہن میں اب زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہوئی کہ جماعت کے سیکرٹری اور ناظمین جو مختلف محلوں میں متفرق طور پر بُرے بھلے مکانوں میں پڑے ہیں اور بسا اوقات ان کے بھاری کرائے دے رہے ہیں کسی طرح ان کے لیے یکجائی اقامت کا انتظام ہو

جائے اور دفاتر بھی وہیں ہوں۔ خود مولانا اور ان کے اہلِ خانہ کے لیے ۵ اے ذیلدار پارک کی کوٹھی کا نصف حصّہ کافی بھی نہ تھا، کیونکہ اس کے بیرونی نصف حصے میں دفاتر تھے۔ سب کی خواہش یہ رہی کہ کوئی صاحب خیر ساتھی کسی جگہ ۷، ۸ کوارٹر بنا کر سستے کرائے پر مہیا کر دیں تو مشکلات کا بوجھ کم ہو جائے۔ عرصہ تک اس کی کوئی سبیل پیدا نہ ہو سکی۔ تا آنکہ ایک صاحب خیر نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے پاس کچھ رقم ہے، اسے آپ جماعت کے کسی مناسب مصرف میں لائیں۔ مولانا نے ان سے دفاتر اور اصحاب دفاتر کی ضرورتوں کا اظہار کیا اور کہا کہ بہت دنوں سے یہ ضرورت سامنے تھی، اگر مالی لحاظ سے کوئی سبیل نہ تھی۔ اب آپ اپنا مال اس مصرف میں صرف کریں کہ زمین حاصل کر کے اس میں ضرورت کی عمارت بنوائی جائیں؛ چنانچہ متذکرہ صاحب خیر نے اپنی رقم دارالاسلام سوسائٹی ٹرسٹ کے حوالے کر کے اس سے یہ چاہا کہ اس رقم سے زمین اور عمارات کا انتظام کیا جائے؛ چنانچہ دارالاسلام سوسائٹی نے اس فنڈ سے منصورہ کی زمین خریدی اور اس پر عمارات بنا کر اسے کرائے پر دفاتر اور کارکنوں کی رہائش کیلیے دیدیا۔ زائد خریدکردہ زمین مختلف افراد کے ہاتھ بیچ دی گئی۔ اس طرح منصورہ کا وہ خواب پورا ہوا جسے مولانا عرصے سے دیکھتے رہے تھے۔

منصورہ کی نوآبادی کا اصل تصوّر مولانائے مرحوم و مغفور ہی کا دیا ہوا ہے اور سارا کام ان کی مرضی اور مشورے کے مطابق ہوتا رہا ہے۔

ابتدا میں سوچے ہوئے منصوبے کے مطابق ایک بڑی مسجد بن گئی ہے (تکمیلی کام جاری ہے)، دینی مدرسہ بھی قائم ہو گیا، بلکہ اب تو سیّد مودودی انٹرنیشنل ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ بھی قائم ہو گیا ہے جس کا مقصد غیر ملکی طلبہ کو اسلامی اور جدید علوم کی تعلیم دینا ہے۔ دینی مدرسہ میں حفظِ قرآن کا سلسلہ بھی جاری ہے اس وقت منصورہ میں ادارۂ معارف اسلامی (موسّس مولانا سیّد ابوالاعلیٰ

مودودیؒ) کے تحت تحقیق، تدوین اور ترجمہ کے کام ہو رہے ہیں۔ ایک لائبریری کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ دوسری جانب بہت بڑا ہسپتال ہے جہاں ان دنوں افغانستان کے زخمی مہاجرین کی خدمت کے لیے عملہ اور ضروری سامان مہیا ہے۔ اوسطاً ۵۰ تا ۱۰۰ مریض یہاں زیرِ علاج ہیں۔

یہاں چھوٹا سا ایک پریس (انگریزی عربی ٹائپ کا) موجود ہے ٹیلیفون کے علاوہ ٹیلیکس سروس قائم ہے۔

شروع شروع میں اکثر رفیق یہاں آتے تو ان کے ذہنوں میں "دارالاسلام" کا عمارتی معیار سامنے ہوتا یعنی دارالاسلام (پٹھانکوٹ) کے چند چھوٹے چھوٹے کوارٹر اور مکتب کے ایک چھپر کا تصور۔ منصورہ میں دفتروں اور اقامت گاہوں کی تعمیر کو یوں محسوس کرتے جیسے تحریک اپنے راستے سے ہٹ رہی ہو۔ حالانکہ سادگی اور پختگی کے ساتھ اگر کام کرنے کے لیے عمارات یا دیگر وسائل مہیا ہوں تو اسلام ہی کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے لیے انھیں استعمال کیا جائے۔ آہستہ آہستہ ذہن صاف ہو گئے اور محسوس کیا جانے لگا کہ صاف ستھرے دفاتر اور اقامتی انتظامات کا ہونا دین کے کسی تقاضے کے خلاف نہیں ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ ذمہ دار حضرات (امیرِ جماعت ہوں یا قیم ہوں یا ناظمین و ارکانِ شعبہ جات) سادہ انداز میں برادرانہ اطوار کے ساتھ خدمتِ دین اور فروغِ تحریک کے لیے سرگرم ہوں۔

آج اس بستی کا شاندار ترین منظر وہ ہوتا ہے جب سب لوگ سویرے اٹھ کر فجر کی نماز میں، یا دفتری کام چھوڑ کر یکایک ظہر کی نماز کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور اسی طرح دوسری نمازیں مل کر ادا کرتے ہیں۔

سال بھر میں تھوڑے تھوڑے وقفے پر تربیت گاہیں منعقد ہوتی ہیں جن میں ملک کے ہر حصے سے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ دو سال سے ماہِ رمضان

ہیں مولانا گوہر رحمٰن صاحب دورہ تفسیر قرآن مکمل کرتے ہیں جس میں تقریباً ۵ گھنٹے روزانہ صرف کرکے وہ قرآنی مباحث کے متعلق بے شمار معلومات اور حوالے سامنے لاتے ہیں۔ اس دورہ سے مستفید ہونے کیلئے بھی نہ صرف آس پاس کے تعلیم یافتہ لوگ، بلکہ ملک کے مختلف حصوں سے محبتِ قرآن رکھنے والے شہری اور دیہاتی آ آکر شریک ہوتے ہیں۔

آج کل صبح ۹ بجے بطور خاص کارکنان دفاتر کے لیے آدھ گھنٹے کا درس قرآن مولانا خلیل حامدی دیتے ہیں۔ وہ آسان انداز سے الفاظ کے مطالب، ان کے مادے اور صیغے وغیرہ بیان کرکے آیت بہ آیت حاصل مدعا کو واضح کرتے ہیں۔

خصوصی کانفرنسیں اور مجالس بھی منعقد ہوتی ہیں۔ مثلاً کچھ ہی عرصہ پہلے اہلِ کاروبار کا ایک کنونشن منصورہ میں منعقد ہوا۔ اسی سال ایک بڑی قرآن کانفرنس یہاں منعقد ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں وکلا کے کنونشن، مزدوروں اور خواتین کی تربیت گاہیں اور اجتماعات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ درسوں اور تقاریر کا سلسلہ بھی چلتا ہے۔ حلقۂ خواتین اور اسلامی جمعیت طالبات کے دفاتر بھی منصورہ میں موجود ہیں۔

منصورہ بستی کی سرزمین اور تعمیرات نے بہت سے ایسے کاموں کے لیے آسانیاں پیدا کردی جن کو سابق حالات میں مشکل ہی سے کیا جا سکتا تھا۔

اس بستی میں ایک ہسپتال کی عمارت بھی ہے اور کام شروع ہے۔ لیکن فی الحال ساری توجہ زخمی افغان مہاجرین کی طرف ہے اور دو ڈاکٹر ان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ عام مریضوں کے لیے ایک ڈسپنسری الگ قائم ہے۔

اس بستی کے دو مسئلے اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی آبادی ایسی منظم اور با اخلاق رہے کہ یہ ایک مثال بن سکے۔ یہ کام کسی قدر مشکل یوں ہے کہ مرکزی

دفاتر کے اسٹاف اور کارپردازوں کے علاوہ یہاں دوسرے لوگ بھی آباد ہیں جو اگرچہ بیشتر ہم خیال ہیں مگر بستی کو مثالی معیار تک پہنچانے کے لیے جس جذبے کی ضرورت ہے وہ سب میں برابر حد تک کارفرما نہیں ہو سکتا۔

دوسرا مسئلہ گھروں اور نئی نسلوں کا ہے۔ تحریک کے انتہائی مصروف اصحاب کو اپنے گھروں پر پوری توجہ کرنے کا پچھلے دور میں بھی موقع نہیں ملا اور اب بھی یہ کام کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بچوں اور بچیوں کا مسئلہ ہے جن کے بڑا ہونے کے ساتھ وہ ذوق، رجحانات، نظریات اور معاشرتی اثرات بھی پروان چڑھتے رہتے ہیں جن کی تخم ریزی نوخیز ذہنوں میں ماحول کی مؤثر قوتیں کرتی ہیں۔ ان حالات میں ابتدا ہی سے دین کے پختہ شعور کے نشوونما پانے کی ضرورت بنیادی ہے۔ پھر دولت پرستی، آسائش پسندی، موسیقی اور تصاویر اور سینما اور ٹیلی ویژن سے دلچسپی دلوں میں نصب ہو جانے والا غلط پیمانۂ عزت، معاشرتی روابط کی مروجہ بنیادیں، شادی بیاہ کے غیر دینی معیارات، بڑوں اور چھوٹوں کے لیے صحیح آداب کا برقرار نہ رہنا اور ایک دوسرے کے حقوق کا نہ پہچاننا اور معاشرے سے طرزِ معاملہ کے اسلامی آداب سے غفلت، یہ ساری دبائیں جو ماحول میں پھیلی ہوئی ہیں ان سے ہماری ازواج و اولاد کا تحفظ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ ابتدا سے ہی گھروں میں ایسی تعلیم و تربیت دی جائے کہ ہمارے نواحقین خود اپنی ہی نگاہ سے ہدایت کا راستہ پہچان سکیں۔

ہمارا طریقہ چونکہ پیری مریدی کے اسلوب پر مبنی نہیں ہے بلکہ تعلیم اور علمی نمونے کے ذریعے پختہ شعور پیدا کرنے سے عبارت ہے اس وجہ سے ہمارا کام دوگونہ مشکل ہے، مگر کچھ نہ کچھ یہ کام ہوتا رہا ہے اور اب مزید توجہ اس پر ہونی چاہیے۔ خصوصاً منصورہ بستی کو تو ملک بھر کے لیے ماڈل بننا چاہیے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے کارپرداز کبھی اس ذمہ داری سے یکسر غافل نہیں ہوئے اور آئندہ کے لیے ہم ان سے اور بھی اچھی اُمیدیں وابستہ کرتے ہیں۔

بہرحال ہمیں منصورہ کو اسلامی تاریخ کا ایک زریں باب بنانا ہے۔ یہاں کے ماحول میں محبتِ دین اور روشنی و نیکی کا اتنا غلبہ ہونا چاہیے کہ کسی مختلف ساخت کے فرد یا گھرانے کو یہاں رہنا بار معلوم ہو۔

## جماعت کی قیادت میں تبدیلی

مولانا مودودیؒ نے اپنی زندگی میں ہی بیماری کی وجہ سے امارت کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کیا اور جماعت نے میاں طفیل محمد صاحب کو اپنے ووٹوں سے امارت کے لیے منتخب کر لیا۔ ۲۱۔ نومبر ۱۹۷۲ء کو نتیجہ انتخابات کا اعلان ہوا۔ ۲۔ نومبر کو میاں صاحب کی حلف برداری کی تقریب ۵، اے ذیلدار پارک میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جو مختصر خطاب کیا، اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

> "تیس سال تک چونکہ میں ہی اس جماعت کے نظام کو چلاتا رہا اور اس کی قیادت کرتا رہا اس لیے جماعت کے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی تھی کہ شاید میری ذات اور جماعت کی امارت ایک دوسرے کے ساتھ ایسی وابستہ ہیں کہ میرے بعد کوئی شخص جماعت کو نہیں چلا سکتا۔"

مولانا نے بھارت اور کشمیر کی جماعتوں (جماعت اسلامی) کی مثالیں دیں کہ دونوں جگہ لوگوں نے اپنے اندر سے امیر منتخب کر لیے اور میرے ان کے درمیان موجود نہ ہونے کے باوجود بخوبی کام چل رہا ہے۔

پھر فرمایا:

> "جس وقت میری بیماری نے شدت پکڑی اور میں نے محسوس

کیا کریں اب ذمہ داری کو نہیں اُٹھا سکتا تو میں نے اپنے رفقا کو کہہ دیا تھا کہ میں اب اس کو بددیانتی سمجھتا ہوں کہ جس ذمہ داری کو میں نہیں سنبھال سکتا، اسے اٹھائے رکھوں۔ اس وجہ سے پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ استعفیٰ دے دوں تاکہ نئے سرے سے انتخاب ہو سکیں۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں استعفیٰ سے غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں، میں نے قائم مقام امیرِ جماعت مقرر کر دیا اور خُدا کا شکر ہے کہ قائم مقام امیر میاں طفیل محمد صاحب بہت خوبی کے ساتھ کام چلاتے رہے۔"

آگے کی بات:

"چنانچہ جب میری مُدّت امارت ختم ہونے پر آئی تو میں نے جماعت کے قاعدے کے خلاف ارکانِ جماعت سے اپیل کی آئندہ انتخاب میں مجھے ووٹ نہ دیں۔ ۔ ۔ خُدا کا شکر ہے کہ میرے رفقائے جماعت نے میری بیماری کو جان کر میرے اُوپر رحم کھایا اور میری اپیل کو قبول کر لیا اور ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جو جماعت اسلامی کا انتہائی وفادار کارکن ہے۔ ۔ ۔ میں نے بہت کم آدمی ایسے دیکھے ہیں جنھوں نے اس اخلاص کے ساتھ، اس وفاداری کے ساتھ اور اس قدر جاں نثاری کے ساتھ جماعت کا کام کیا ہو اور جماعت کے لیے اتنی تکلیفیں اور مصیبتیں اُٹھائی ہوں۔ میں پہلے ہی یہ توقع کر رہا تھا کہ جماعت کی نگاہ انھی پر پڑے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ میری یہ توقع پوری ہوئی اور جماعت نے انھیں اکثریت کے ساتھ منتخب کر لیا۔"

یعنی نظمِ امارت کی یہ ساری تبدیلی مولانا کی مرضی سے ان کے سامنے واقع ہوئی اور اس کی اُنھوں نے تحسین کی اور میاں طفیل محمد صاحب کو مولانا کا مکمل

اعتماد حاصل ہوا۔

## منصورہ اور مولانا مودودیؒ

اس موقع پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منصورہ بستی کے تصور اور اس کی تعمیر کی سکیم سے لے کر آخر تک مولانا کی دعائیں اس کو حاصل رہیں اور متعدد موقعوں پر انھوں نے اس کو بعض تقاریب کے سلسلے میں بطورِ خاص مشرف فرمایا۔ اس سلسلے میں بعض قابلِ یادگار باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

## مسجدِ منصورہ کا سنگِ بنیاد

حلف برداری کی کارروائی کے بعد اعلان ہوا کہ ۲۷ رمضان المبارک (۴ نومبر ۱۹۷۲ء) کو قائد تحریکِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ منصورہ کی اسکیم کا افتتاح اُس زمین پر مسجد کا سنگِ بنیاد رکھ کر کریں گے۔ خاصا مجمع جمع ہوا مگر ۲۶ رمضان کو مولانا پر بخار اور انفلوئنزا کا حملہ ہو گیا۔ ۲۷ کو کچھ افاقہ نہیں ہوا، لہٰذا بنیادیں شروع کرنے کی ذمہ داری مولانا نے میاں طفیل محمد صاحب امیرِ جماعتِ اسلامی کو تفویض کی۔ ۱۱ نومبر کو عید ملاپ اجتماع کا انتظام رشید پارک میں کیا گیا۔ اس میں شرکت سے بھی مولانا کی علالت (خصوصاً کمزوری) مانع ہوئی۔

۲۸ رمضان المبارک ۱۳۹۳ھ (۲۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء) بروز جمعۃ الوداع مولانا مودودیؒ مسجد کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں تشریف لائے۔ اس کا یادگاری پتھر مسجد کی ڈیوڑھی میں نصب ہے اور اس پر لکھا ہے کہ ۲۸ رمضان ۱۳۹۳ھ کو تعمیر کا آغاز مولانا نے اپنے دستِ مبارک سے فرمایا۔ بعد ازاں میاں طفیل محمد، چودھری رحمت الٰہی اور مولانا خلیل حامدی نے باری باری پھاوڑا چلایا۔ (ایشیا۔ ۴ نومبر ۱۹۷۳ء)

## سالانہ اجتماع ارکان ۱۹۷۴ء

۱۹۷۴ء میں ارکانِ جماعت کا سالانہ اجتماع ۲۹ تا ۳۱ مارچ کو ہونا طے پایا۔ اس اجتماع کا مقام منصورہ ہی رکھا گیا جہاں اس وقت تک تعمیرات نہیں تھیں، ایک ٹیوب ویل تھا، ٹیوب ویل کے ساتھ ایک آدھ کمرہ، کچھ درخت اور جھاڑیاں، اور کھیت جن میں کاشت کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اس جنگل میں منگل

منانے کا فیصلہ ہُوا اور کارکنانِ جماعت کی محنتوں کے نتیجے میں تحریک کے سرگشتگانِ شوق کا قافلہ اس بیابان میں تھوڑی دیر کے لیے رُکا اور پھراپنی منزل کو روانہ ہو گیا ؎

کیش ما مانندِ موجِ تیز گام اختیارِ جادہ و ترکِ مقام

اس اجتماع میں جس کی فلم بھی لی گئی تھی، ۳۱ تاریخ کو اجلاسِ عام (۳ بجے تا دوپہر) میں خطاب کے لیے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تشریف لائے۔ پروفیسر عبدالغفور صاحب کی تقریر ہو رہی تھی۔ یکایک "مودودی مرحبا مرحبا" اور "قائدِ تحریکِ اسلامی زندہ باد" کے نعرے ملتان روڈ سے سُنائی دیے۔ نوجوانوں کا ایک جلوس مولانا کے ساتھ تھا جس میں بنگالی نوجوانوں کا خاص حصّہ تھا اور ان کے بنگالی نعرے بھی گونج رہے تھے۔ مولانا کے آگے سکوٹر سوار نوجوانوں کا دستہ جماعت اسلامی کا پرچم اُٹھائے ہوئے چل رہا تھا۔

مولانا کو پہلے سیدھا زیرِ تعمیر مسجد کی طرف لے جایا گیا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں ایک سال پہلے مسجد کا سنگِ اساس رکھا گیا تھا۔ اس مقام پر جماعت کا بڑا پرچم پول کے ساتھ لپٹا ہُوا تھا۔ مولانا نے اپنے دستِ مبارک سے اسے لہرایا اور اسلام کی سربلندی اور غلبے کی دُعا کی۔

پھر مولانا جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر وہی نعروں کا شور ہا۔ جس کی وجہ سے اجتماع میں اس وقت تک خاصی ہل چل ہوئی جب تک کہ مولانا اسٹیج پر بیٹھ نہ گئے۔ سکون ہونے کے بعد پروفیسر عبدالغفور صاحب نے اپنی تقریر کا سلسلہ پھر شروع کیا، مگر مولانا کے لیے لوگوں کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے اُنھوں نے اپنی تقریر مختصر کر دی۔ پھر میاں صاحب (امیر جماعت) نے مختصر سا خطاب کیا۔

چودھری محمد اسلم سلیمی نے اعلان کیا کہ اب اسلامی تحریک کے داعی اور [جما]عت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی خطاب کریں گے۔ جلسہ گاہ

میں پھر جوش و جذبے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ نوجوانوں نے پھر پورے زور سے نعرے لگائے۔

مولانا نے دھیمی اور پُرسوز آواز میں اپنی تقریر شروع کی۔ لہجہ آہستہ آہستہ پُرزور اور آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ اس تقریر کو نقل کرنا تو کجا، یہاں اس کی تلخیص بھی نہیں دی جا سکتی، کیونکہ یہ ہمارے موضوع کا تقاضا نہیں ہے۔ تاہم ایک اقتباس حاضر ہے:

"جب یہ خیالات ملک کے اندر پوری طرح مضبوطی سے جم جاتے ہیں اور قوم کے اندر پورا ارادہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر کوئی طاقت انقلاب کو آنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ ہر راستے سے آتا ہے۔ ایسے راستے سے آتا ہے کہ جس کو بند کرنے کا خیال کوئی سوچ تک نہیں سکتا۔ آپ اس بات کی فکر نہ کریں کہ انقلاب کس راستے سے آئے گا۔ آپ صرف کام کریں اور یہ کام آپ اس وقت تک انجام نہیں دے سکتے جب تک آپ اپنے اخلاق، اپنے کردار اور اپنی سیرت کو درست نہ کر لیں۔"

اس تقریر کا ایک اور اہم اقتباس جو تقریر کے ابتدائی حصے سے متعلق ہے:

"جس چیز پر میں اللہ تعالیٰ کا انتہائی شکر گزار ہوں وہ یہ ہے کہ میری زندگی ہی میں آزمودہ کارکنوں کی ایک ٹیم نے جماعت کی تنظیم اور اس کی قیادت کو سنبھال لیا ہے۔ میں دُنیا سے اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہُوں گا کہ میں بھروسے کے قابل لوگوں کے ہاتھ میں نظام دے کر آیا ہُوں۔"

پھر بڑے درد بھرے انداز سے دُعا کی اور اجلاس اختتام پذیر ہُوا۔

## مرکزی دفاتر کی منتقلی کی تقریب

مارچ ۱۹۷۹ء میں منصورہ کی نوآبادی میں اتنی تعمیرات ہو چکی تھیں کہ ۳۰ مارچ

کو تربیت گاہ پنجاب کا انعقاد اسی مقام پر ہوا جس میں سید مودودی نے سوالات کے جوابات دیے۔ (ترجمان القرآن، مئی ۱۹۷۰ء)

پھر ۲۰ جون کی تاریخ وہ آخری تاریخ قرار پاگئی جب کہ ۵ اے ذیلدار پارک اچھرہ سے دفاتر اور کارکنان و عمائدین کی منتقلی منصورہ میں ہو جانی تھی۔ لاہور کے رفقاء کی خواہش پر ۲۰ جون کی شام کو رشید پارک میں اس سلسلے میں ایک تقریب منعقد کی گئی۔ اس میں مولانا مودودیؒ نے شرکت فرمائی۔

## منصورہ میں تربیت گاہ صوبۂ پنجاب

پنجاب کے رفقائے تحریک کی تربیت گاہ مارچ ۱۹۷۵ء کے اواخر میں منعقد ہوئی۔ اس کے دوران سوال و جواب کی ایک نشست میں مولانا نے ۲۹ مارچ کو سوالوں کے جواب دیے۔ سوالات کے صرف عنوانات دیئے جا رہے ہیں جو ترجمان القرآن میں مولانا کی نظرثانی شدہ رپورٹ میں شائع ہوئے ہیں۔

- آئندہ انتخابات میں جماعت اسلامی کی پالیسی کیا ہو؟
- کیا اقامتِ دین کا کام ظہورِ مہدی سے پہلے ہو سکے گا؟
- عوامی رجحانات کو دیکھتے ہوئے ہماری پالیسی کیا ہونی چاہیے؟
- اللہ تعالیٰ ظالموں کو غلبے کا موقع کس حد تک دیتا ہے؟
- اقامتِ دین کے کام کے لیے فارغ کارکن کیوں؟
- ہم جیسے کمزور لوگوں کے ہاتھوں اسلامی نظام کیسے برپا ہو گا؟

پہلے سوال میں جب پوچھا گیا کہ آئندہ انتخابات میں جماعتِ اسلامی کی پالیسی کیا ہونی چاہیے تو بڑا ہی پُرحکمت اور سبق آموز جواب مولانا نے یہ کہہ کر دیا کہ:

"اس سوال کا جواب میں آپ کو یہاں نہیں دے سکتا۔ اس کے متعلق اگر مجھے کچھ کہنا ہوا تو امیرِ جماعت سے کہوں گا یا مجلسِ عاملہ

مجھ سے دریافت کرے گی تو اس کے سامنے بیان کروں گا، یا
مجلسِ شوریٰ مجھ سے پوچھنا چاہے گی تو اس کے اجلاس میں پیش
کروں گا۔ میں ایک عام رکنِ جماعت ہوں۔ نہ امیرِ جماعت ہوں،
نہ مجلسِ عاملہ کا رکن، نہ مجلسِ شوریٰ کا رکن۔ میرا یہ کام نہیں کہ یہاں
بیٹھ کر جماعت کی پالیسی طے کروں۔ پالیسی طے کرنا ان لوگوں کا کام
ہے جو دستور کی رُو سے اس کے مجاز ہیں" (امیٔ ۱۹۷۲ء ص۔ ۱۲۶/۲۳)
اس پر ایک ممتاز رفیق نے کہا "لیکن مولانا! ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آپ
سب کچھ ہیں" اس کا جواب مولانا نے یوں دیا:
"میں اس تصور کی جڑ کاٹ دینا چاہتا ہوں۔ یہ جماعت ایک
دستور اور ایک نظام پر قائم ہے۔ اس میں مجھ سمیت کوئی شخص
بھی اپنی ذاتی حیثیت میں سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ جس دن جماعت
کی تاسیس ہوئی تھی، اسی روز میں نے یہ بات واضح کر دی تھی
کہ دعوت تو بلاشبہ میں نے دی ہے مگر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جو
شخص داعی ہے اُسی کو آپ سے آپ امیرِ جماعت بھی ہونا
چاہیے"
بقیہ سوالات بھی اہم تھے اور ان کے جوابات بھی بڑے اہم ہیں۔

## مولانا کی تقریر عید الاضحیٰ

منصورہ میں ۱۹۷۸ء میں مورخہ ۱۵ دسمبر بروز اتوار عید الاضحیٰ کی نماز پڑھی
گئی۔ مولانا مودودیؒ نے تکلیف اور کمزوری کے باوجود اس میں شرکت کی،
اور شرکت ہی نہیں کی، تقریر بھی فرمائی۔ یہ تقریر حسبِ موقع عید الاضحیٰ ہی کے
پس منظر سے متعلق تھی۔ ہر چند کہ یہ ایک مختصر تقریر ہے مگر جامع بھی ہے۔
اختصار اور جامعیت کو جمع کرنے میں مولانا کو خاص ملکہ تھا۔ یہ تقریر ہفت روزہ

ایشیا، مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کے شمارے میں صفحہ ۸ اور ۹ پر میں نے دیکھی۔

واضح رہے کہ نمازِ عید کی امامت کے فرائض جناب عاصم نعمانی (مولانا کے پرسنل سیکرٹری) نے ادا کیے۔

## خواتین کے اجتماع میں خطاب

، ، اپریل ۱۹۷۶ء کو مولانا نے منصورہ میں منعقدہ اجتماعِ خواتین سے خطاب فرمایا۔ اس کا اقتباس:

"کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا، خواہ وہ باپ ہو، خواہ وہ شوہر ہو کہ وہ کسی عورت سے اللہ اور رسول کی نافرمانی کا مطالبہ کرے۔ ایسا حکم دینے والا حقیقتاً بڑا گناہ گار ہے۔ اتنا ہی بڑا گناہ گار وہ ہے جو کسی کے کہنے پر اپنی عاقبت خراب کرے۔"

اس وقت کے حکمران کے ایک افسوس ناک جملہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یا خلفائے راشدین کے زمانے میں کوئی شخص اس بات کا تصور بھی کر سکتا تھا کہ عورتوں کے پردے کو جیل قرار دے اور انھیں دعوت دے کہ آؤ اور مردوں کے مجمع میں بیٹھ جاؤ۔"

## وکلا کا کنونشن

۱، ۲ مئی ۱۹۷۶ء کو منصورہ میں وکلا کا ایک بڑا کنونشن منعقد ہوا۔ کنونشن کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کو جاری کرنے کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ کنونشن کے آخر میں جناب اے کے بروہی نے بہ حیثیت صدر اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بطور مہمانِ خصوصی خطاب کیا۔ مولانا کے خطاب سے مختصر اقتباسات:

"اس سرزمین میں جہاں آج سے اٹھائیس انتیس سال قبل اگر اس بات کا نام لیا جاتا کہ یہاں اسلامی قانون نافذ کیا جائے تو بہت سے حلقوں کی طرف سے اُس کو سُننا بھی گوارا نہیں کیا جاتا تھا ... لیکن اس اٹھائیس انتیس سال کی مدت میں اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس ملک کا قانون دان طبقہ، اس ملک کے وکلاء اور جج، ان کی عظیم اکثریت اس بات کی قائل ہو چکی ہے کہ یہاں اسلامی قانون ہی نافذ ہونا چاہیے"

"ہمیں تو پوری طرح تجربے نے یہ یقین دلا دیا ہے کہ یہاں جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے وہ اس قانون کو نافذ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے"

"اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے، اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کو منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں، دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں"

"عوام کے خیالات کی تبدیلی سے ملک کا نظام بہت کم بدلا کرتا ہے۔ ملک کا نظام بدلا کرتا ہے ہمیشہ اس وقت جبکہ ملک کو چلانے والے دماغ بدل جائیں۔ اس وجہ سے آپ کو پوری کوشش یہ کرنی چاہیے کہ ملک میں ایک بھی پڑھا لکھا آدمی ایسا نہ چھوڑیں جس کے خیالوں کو آپ تبدیل نہ کر چکے ہوں"

(ہفت روزہ "آئین" ۱۶، جون ۱۹۷۶ء)

آخر میں مولانا نے مختصر دُعا کی۔

## منصورہ میں ضلعی امرا کی تربیت گاہ

مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۷۶ء کو منصورہ میں ایک خصوصی تربیت گاہ برائے امرائے اضلاع منعقد ہوئی۔ جناب صادق حسین صاحب (کراچی) کی سرکردگی میں ایک نصاب کمیٹی مقرر ہوئی جس نے تربیت گاہ کا پورا نصابی پروگرام طے کر دیا۔ اس تربیت گاہ کی مدت دس روز تھی۔ اس دس روزہ تربیت گاہ میں امیر جماعت میاں طفیل محمد صاحب کے علاوہ ۱۶ حضرات نے تربیتی تقاریر اور گفتگوئیں کیں۔

تحریک اسلامی کے داعیٔ اعلیٰ اور جماعتِ اسلامی کے مؤسس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اختتامی خطاب فرمایا۔ یہ چونکہ دورِ آخر کے فرمودات ہیں اس لیے کچھ اقتباس:

"مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس وقت تمام وہ لوگ میرے سامنے ہیں جو پورے ملک میں جماعتِ اسلامی کے نظم کو اور اس کی تحریک کو چلا رہے ہیں۔"

"یہ بات آپ جانتے ہیں کہ جس مقصد کے لیے ہم کھڑے ہوئے ہیں وہ ایک ہمہ گیر اور کلی انقلاب کا مقصد ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ پوری زندگی افراد کی بھی اور قوم کی بھی اور حکومت کی بھی اسلامی نظام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ کلمۃ اللہ بلند ہو اور ہر کلمہ اس کے سامنے دب جائے۔ احکامِ اسلامی ان کی اصل اسپرٹ اور ان کے اصل الفاظ کے مطابق جاری ہوں۔ ملک کے اندر سے برائیاں مٹیں اور بھلائیاں قائم ہوں۔"

"پاکستان بننے کے بعد سے جتنے لوگوں کے ہاتھ میں حکومت آئی وہ سب اس مقصد کی راہ میں مزاحم ہی رہے ہیں۔"

"اس طاقت کے مقابلے میں ہمارے پاس نہ تعداد کی طاقت

ہے، نہ مال کی طاقت ہے، نہ حکومت کی طاقت ہے، نہ اور کسی قسم کی طاقت ہے۔ ۔ ۔ ۔ صرف دو طاقتیں ہیں جن سے ہم اس صورتِ حال کا مقابلہ کر سکتے ہیں، ایک اخلاق' اور دوسرے تنظیم۔ ۔ ۔ ۔ اگر ہماری یہی دونوں طاقتیں کمزور رہیں تو پھر ہم کس بنیاد پر امید کر سکتے ہیں کہ اتنی بڑی منظم طاقتوں کو شکست دے سکتے ہیں؟"

"نظمِ جماعت کی پابندی میں کمزوری ہی شکست کی ابتدا ہوتی ہے۔ قلیل التعداد آدمیوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا نظمِ جماعت اقتدار کی قوت کے مقابلے میں کیسے ٹھہر سکے گا؟"

"جس طرح مجھے کل سورج کے نکلنے کا یقین ہے اتنا ہی مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر آپ نے اس کام کی شرائط پوری کیں تو انشاء اللہ آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔"

"قبل از وقت کسی مقام پر کوئی فعل ایسا کر ڈالنا کہ جس سے پورے ملک میں جماعت کی لڑائی چھڑ جائے، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس چیز پر میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں۔"

تقریر سے پہلے مولانا نے ملک نصر اللہ عزیز کیلئے دعائے مغفرت کی۔ ملک صاحب کا انتقال ۲ جولائی کو ہوا تھا۔

## فتح مبین

۱۹۷۶ء میں منصورہ میں ایک خصوصی درس کا اہتمام ہوا۔ یہ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۶ء کا واقعہ ہے۔ جامع فاروقیہ ڈسکہ نے اپنے ہاں مقامی طور پر ایک درس کا انتظام کر رکھا تھا۔ جب وہ سورۂ توبہ تک پہنچے تو یکایک فیصلہ کیا کہ اس کے آخری رکوع کا درس براہِ راست مولانا مودودیؒ سے سنا جائے؛ چنانچہ انھوں نے اس کی درخواست مولانا سے کی جسے مولانا نے منظور کر لیا۔ وہ لوگ ٹرانسپورٹ

کا اپنا انتظام کر کے آئے۔ جماعت کے مقامی، ضلعی اور آس پاس کے ارکان اور کارکنوں کی بھی خاصی تعداد منصورہ پہنچ گئی۔ منصورہ ہی میں مولانا نے درس دیا۔ اس درس کے لیے ہفت روزہ "آئین" نے "فتح مبین" کا عنوان تجویز کیا۔ تمہید میں مولانا نے صلح حدیبیہ سے لے کر غزوۂ تبوک تک کے حالات پر مشتمل پس منظر بیان کیا۔ آخری رکوع میں منافقین کی روش اور ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں سے گفتگو ہے۔ ان کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اس گفتگو کے خاتمے پر منافقین کو خصوصاً اور اہلِ ایمان کو عموماً یہ بتایا گیا ہے کہ تمہارے سامنے جو رسول مبعوث ہوا ہے، ایک تو وہ خود تم میں سے ہے، دوسرے تمہارا نقصان میں پڑنا اسے شاق گزرتا ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے شفیق اور رحیم ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کا روئے سخن براہِ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ "اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبی! ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہ، اس پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور وہ مالک ہے عرشِ عظیم کا!" ———— صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ!

خوش قسمتی سے میں بھی اس محفلِ درس میں موجود تھا اور اپنے لیے بطورِ خاص اس کا ٹیپ حاصل کیا۔ آخر میں مولانا رحمۃ اللہ نے حسبِ ذیل دعا کی:

"یا اللہ! مسلمانوں کو قرآن مجید پڑھنے کی توفیق عطا فرما کیوں کہ اسی میں ان کی بھلائی ہے۔ جتنا وہ قرآن سے دُور ہوں گے اتنا ہی اپنی بھلائی سے دور ہوں گے۔ جتنا وہ قرآن کے قریب ہوں گے اتنا ہی وہ اپنی بھلائی کے قریب ہوں گے اور یا اللہ جن لوگوں کو کوئی جسمانی بیماری ہے اس کو بھی دُور فرما، اور جو کسی روحانی بیماری میں مبتلا ہیں ان کو بھی شفا بخش۔ آمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمدٍ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

مولانا چاہتے تو بربنائے علالت اس درس کا اہتمام ۵ اے ذیلدار پارک میں بھی کرا سکتے تھے، مگر وہ خود منصورہ کو بطور مرکز جماعت اہمیت دینا چاہتے تھے اور لوگوں کا رجوع اُدھر بڑھانا چاہتے تھے۔ اس لیے تکلیف اٹھا کر یہاں تشریف لائے اور مفصل درس دیا۔ اس مجلس کے بڑے بابرکت اثرات تمام حاضرین میں محسوس ہوتے تھے۔

## نمازِ عید الفطر

۲۵ ستمبر ۱۹۷۶ء کو مولانا مودودی رحمۃ اللہ نے نمازِ عید الفطر منصورہ میں ادا کی۔ اجتماع سے مختصر خطاب بھی کیا جس کے چند جملے درج ذیل ہیں:

— ماہِ صیام کے روزوں اور عید الفطر کے اجتماعات کے ذریعے ہمیں اجتماعی طور پر خدا کی بڑائی بیان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

— پچھلی قوموں کے زوال کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے دین اور دنیا کی تفریق پیدا کی اور کہا کہ دینی کام کرنا راہبوں یا پادریوں اور پروہتوں کا کام ہے، جس طرح انھوں نے دوسرے مذہبی کام پروہتوں کے حوالے کر دیے ویسے ہی ان کے ہاں روزہ رکھنا بھی مذہبی خدمت گاروں کا کام ہی بن کر رہ گیا لیکن اسلام میں عبادات کا فریضہ ایک ایک فرد کا فریضہ ہے اور ہر ہر فرد پر ان کی ادائیگی فرض کی گئی ہے۔ (آئین مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۶ء ص ۷)

## منصورہ میں دوسری نمازِ عید الاضحیٰ

۲ دسمبر ۱۹۷۶ء کو منصورہ میں نمازِ عید الاضحیٰ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے شرکت فرمائی۔ اس موقع پر بہت اچھا خطاب کیا۔ خطاب میں مرکزی زور اس دعوت توحید پر تھا جس کا مرکز حرم پاک کو ٹھیرایا گیا اور جس کے علمبردار اپنے دور میں حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ تھے اور جو حج کی عبادت کی روح ہے۔

مولانا نے تقریر کے اختتامی حصے میں بڑی دردمندی سے کہا کہ یہی توحید پر مبنی ایک مکمل نظامِ حیات اللہ تعالیٰ نے اُمت کو دیا تھا، اس کے علمبرداروں کا اب یہ حال ہے کہ جگہ جگہ تفرقہ بازی اور تکفیر کا سلسلہ جاری ہے۔ اس خرابیٔ احوال کا سبب مولانا نے یہ بیان کیا کہ:

"مختلف لوگوں نے توحید اور دین و شرع میں نئی نئی چیزوں کی آمیزش کی ہے۔ اس دین کے عقائد و احکام میں کچھ بڑھایا اور کچھ گھٹایا ہے، جو چیزیں اہم نہ تھیں اُن کو اہم ترین بنایا ہے اور اس کمی بیشی کو مدارِ ایمان قرار دے دیا ہے۔"

## طالبات کا اجتماع

۲۴، دسمبر ۱۹۷۶ء کو جمعیت طالبات پاکستان کا اجتماع منصورہ میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع کے آخری دن (۲۷، دسمبر ۱۹۷۶ء) کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے منصورہ آکر خطاب فرمایا۔ اس خطاب کا صرف ایک اقتباس:

"آپ کا اپنا عزم اور ارادہ یہ ہونا چاہیے، آپ کی اپنی خواہش یہ ہونی چاہیے کہ آپ کا گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کی پیروی کرے۔ اس بات کا فیصلہ آپ کے دل میں ہونا چاہیے، آپ کے اپنے دماغ کو مطمئن ہونا چاہیئے کہ رسول اللہ جو ہدایت لائے ہیں اس کے سوا کوئی اور ہدایت نہیں ہے جس کی طرف ہمیں رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔ حضورؐ نے جس چیز کو غلط کہا ہے وہ غلط ہے، آپ کو اس چیز پر اطمینان ہونا چاہیے۔ حضورؐ نے جس چیز کو صحیح کہا ہے اس کے صحیح ہونے پر آپ کو پورا پورا یقین اور اعتبار ہونا چاہیے۔ حضورؐ نے جس چیز کے متعلق بتایا ہے کہ یہ چیز اللہ کی رضا کے مطابق ہے، اللہ کی

رضا حاصل کرنی ہو تو اس چیز پر عمل کریں اور آپ کو اطمینان ہونا چاہیے کہ واقعی یہی چیز ہے جس میں اللہ کی رضا ہے۔"

طالبات کی طرف سے بہت سے سوالات کیے گئے۔ مولانا نے ان کے تسلی بخش جواب دیے۔ یہاں صرف آخری سوال اور جواب کو درج کیا جاتا ہے:۔

سوال کیا گیا کہ اگر آپ تحریک سے علیحدہ ہو کر موجودہ حالات سے مطمئن ہیں تو کس حد تک؟ اگر نہیں تو اس کا ازالہ کریں!

—— مولانا محترم نے جواب دیا "میں تحریک سے علیحدہ کہاں ہوں، میں تو تحریک میں شامل ہوں۔ امارت سے الگ ہونے کی میری وجہ تھی میری بیماری، جس کی وجہ سے میں کام نہیں چلا سکتا تھا۔ لیکن امارت کو چھوڑ دینے کے معنی تحریک کو چھوڑ دینے کے نہیں ہیں۔ میں آج بھی تحریک میں ہوں، اسی طرح سے جس طرح سے تھا۔ موجودہ امارت سے مطمئن نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ جماعت کی اکثریت نے جس آدمی کو امیر چنا ہے اور خود جس شخص کو میں ابتدا سے، جب سے یہ تحریک شروع ہوئی ہے جانتا ہوں امیرے ساتھ کام کیا ہے، میرے معتمد ترین رفیقوں میں سے ہے تو آخر میرے مطمئن نہ ہونے کی کیا وجہ ہے۔ اگر کسی چیز پر میں غیر مطمئن ہوا تو صاف صاف کہہ دوں گا کہ اس چیز کی اصلاح کیجیے اور اصلاح سے مجلس شوریٰ کو مشورہ دوں گا اگر امیر جماعت سے متعلق وہ چیز مجلس شوریٰ میں کہنے کی ہو۔

(ہفت روزہ ایشیا۔ جلد ۲۶، شمارہ ۳، مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۷۸ء)

## میاں طفیل محمد صاحب کی دوسری تقریب حلف برداری

مرکزی امارت کے عہدے کے لیے ۱ دا خر ۱۹۷۷ء میں انتخاب ہوا اور

۲۸، اکتوبر کو نتیجے کا اعلان ہو گیا کہ میاں طفیل محمد صاحب کو جماعت نے دوبارہ منتخب کر لیا ہے۔ میاں صاحب کی تقریب حلف برداری میں شرکت کے لیے مرکزی مجلس عاملہ کے ارکان منصورہ پہنچ گئے۔ ۲، نومبر ۱۹۷۷ء کو عاملہ کا اجلاس خاص طور پر اس لیے ۵، اے ذیلدار پارک میں منعقد کیا گیا کہ بانیٔ جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس میں حصہ لے سکیں۔ ۱۱ بجے تقریب کا آغاز ہوا اور اس تقریب نے واضح کر دیا کہ منصورہ اور ۵، اے ذیلدار پارک ایک ہیں۔ حلف برداری کی ساری کارروائی کے بعد بانیٔ جماعت نے اپنی جامع تقریر میں ایک بار پھر میاں طفیل محمد صاحب پر اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"میں اپنے پرانے رفیق اور دست و بازو میاں طفیل محمد صاحب سے اظہار ہمدردی کرتا ہوں کہ جماعت نے ان پر یہ ذمہ داری پھر ڈال دی ہے، حالانکہ انھوں نے پچھلے پانچ سال تک اتنی سخت محنت کی ہے اور دین کی خدمت میں اتنا کچھ برداشت کیا ہے کہ اب حقیقت میں وہ رحم کے مستحق تھے، تاہم میں اس بات پر خوش بھی ہوں کہ جماعت نے اس شخص کو دوبارہ منتخب کیا ہے جو جماعت کے اندر اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا، جو ابتدا سے جماعت کے پورے نظام کو سمجھنے اور تحریک کو چلانے میں میرے ساتھ شریک رہا اور اس قدر جماعت کے نظام کو اور تحریک کو سمجھنے والا شاید ہی کوئی اور ہو۔"

(ہفت روزہ "ایشیا" ۱۳، نومبر ۱۹۷۷ء)

مولانا جیسی ہستی کے الفاظ میاں صاحب کے لیے دنیا و آخرت میں قیمتی سرمایہ ہیں۔

## منصورہ میں تیسری عیدالاضحیٰ

نومبر ۱۹۷۷ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ منصورہ میں نماز عیدالاضحیٰ

میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔ تقریر مولانا گلزار احمد صاحب نے کی۔ نماز و خطبۂ عید کے بعد اعلان ہوا کہ مولانا "تجدید میثاق" کرائیں گے۔ واضح رہے کہ اسلامی کونسل کی تجویز میں خدا سے پیمان وفا باندھنے کی ایک تحریک اٹھائی گئی اور یہ تحریک چونکہ باعث خیر و فلاح تھی اس لیے مولانا مودودیؒ نے اس کو آگے بڑھانے میں حصہ ادا کیا۔ مولانا کی کرسی سامنے لاکر رکھ دی گئی اور مائیکروفون قریب کر دیا گیا۔ مولانا نے میثاق کو جس انداز سے پڑھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کے نزدیک یہ کتنا اہم اور عظیم فرض تھا۔ مولانا میثاق کا ایک ایک فقرہ پڑھتے تھے اور اہلِ اجتماع صدقِ دل سے اسے بآوازِ بلند دوہراتے تھے۔

بعدازاں آپ نے جو تقریر فرمائی اس کا ملخص یہ ہے:

"یہ عہد جو آپ نے کیا ہے اس کی حیثیت یہ نہیں کہ ایک عبارت میں پڑھتا گیا اور آپ اسے دہراتے گئے بلکہ آپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کسی اور سے نہیں، مالکِ کائنات سے عہد ہے اور آخرت میں اس کے متعلق پوچھا جائے گا کہ ہم نے یہ عہد جو کیا تھا اس کو کہاں تک پورا کیا۔"

"اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کا معاملہ ایسا زبردست اور اہم ہے کہ بنی اسرائیل کے سروں پر کوہ طور اٹھا کر ان سے عہد لیا گیا تھا تاکہ انھیں احساس رہے کہ انھوں نے جس عظیم ہستی سے پیمان باندھا ہے وہ پہاڑ کو اٹھا کر ان کے اوپر گرا سکتی ہے۔"

"جن جن لوگوں کو اس عہد نامے کی چھپی ہوئی عبارت ملے وہ کم از کم دس نسخے اپنے ہاتھ سے تیار کر کے دوسروں تک پہنچائیں۔"

"اس کا مدعا صرف اتنا ہی نہیں کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچے اور فرماں برداری کرے، بلکہ اس کا مدعا یہ بھی ہے کہ ساری قوم اللہ سے پیمانِ وفا باندھے اور یہ طے کر لے کہ اب وہ اپنے

معاملات کی باگ ڈور کبھی خدا کی نافرمانی کرنے والوں کے ہاتھوں میں نہیں دے گی۔ خوب سمجھ لیجیے کہ کسی قوم پر ظالم و جابر، تنگ دل و بے رحم، خائن و بددیانت اور فاسق و فاجر لوگوں کا مسلّط ہو جانا اللہ کا عذاب ہے جو اُسی قوم پر نازل ہوتا ہے جو خود اللہ کے راستے سے بھٹک گئی ہو۔"

"خداوند عالم ہمیں عہد شکنی سے اور اس کے بُرے نتائج سے بچائے۔"

ہفت روزہ "ایشیا" مورخہ ۲ر نومبر ۱۹۷۷ء

## دراز تر گفتم

حکایت ہی ایسی تھی کہ بات لمبی ہو گئی۔ اس تحریر میں تاریخِ تحریک کے کئی گوشے شامل ہیں۔ بعض مقامات پر تاریخوں یا ناموں کے متعلق مجھے اپنے حافظے کی کمزوری کی وجہ سے اشتباہ رہا۔ ایسے مقامات پر "غالباً" یا ایسے ہی کسی لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے اصحاب کی تحریروں، یادداشتوں اور تحقیقات سے ایسے مقامات کی کمزوری کی تلافی ہو جائے گی۔

آخر میں مجھے اس قصّے کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ایک خواہش کے ذکر پر ختم کرنا ہے۔

مولانا سے درخواست کی گئی کہ آپ بھی منصورہ کی زمین پر اپنی اقامت گاہ تعمیر کرائیں۔ مولانا نے فرمایا: منصورہ میں مجھے فقط "دو گز زمین" درکار ہے۔ ہماری مرکزی قیادت کے عمائد کے سامنے یہ بات ہوئی اور ہم سب اسے جانتے ہیں۔

دلی صدمہ ہے کہ مولانا کے لیے جہاں دسیوں گز زمین کی پیشکش کی جا رہی تھی، وہاں "دو گز زمین" مقدر نہ ہو سکی۔

مگر مشیتِ الٰہی کے سامنے ہم سب سرنگوں ہیں۔

# دُعا

عمارات اور سازوسامان ضروری چیزیں بھی ہیں اور مفید بھی مگر ذراسی غفلت سے یہ چیزیں کسی مقصدِ اعلیٰ کی راہ میں دیواریں بن جاتی ہیں۔ یہ حقیقت ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ فقر و افلاس اہلِ ایمان کے لیے جتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اس سے زیادہ تباہ کن!

خُدا سے دُعا ہے کہ وہ منصورہ سے وہی کام لے جس کا خواب دارالاسلام میں دیکھا گیا تھا۔

خدا کرے کہ ظاہری عمارات اور اسباب سے کام لیتے ہوئے ہمارے قلوب اسی ذوقِ فقر کی لہروں پر رواں دواں رہیں جس پہ ابتدا میں تھے۔

خدا کرے کہ غلبۂ حق کی تحریک کا تموّج اسی رفتار سے روز افزوں رہے جس رفتار سے ہمارے ابتدائی کارکنوں نے جان ماری کر کے ہر صبح و شام اس میں اضافہ کیا تھا۔

خدا کرے کہ وہ، مؤسسینِ جماعت کا جذبۂ اقامتِ دین ہر دوسری فکر پہ غالب رہے اور ادنیٰ قسم کی سیاسی ضروریات اس پہ برتری حاصل نہ کر سکیں۔

خدا کرے کہ ہم میں ویسا ہی جذبۂ اخوت کار فرما رہے جیسا ۱۹۴۱ء میں تھا۔

خدا کرے کہ ہم لوگ اقامتِ دین اور بندگانِ خدا کی خدمت کے لیے اپنے وسائل میں سے حسبِ مقدرت بصدِ ذوق و شوق انفاق کرتے رہیں۔

خدا کرے کہ کاروانِ بلاکشاں سے جادۂ حق پہ پیشقدمی کرتے ہوئے مخالف قوتیں مشقتوں اور قربانیوں کا جو خراج طلب کریں، ہم اسے بصمیمِ قلب ادا کریں۔

خدا کرے کہ تحریکِ اسلامی فکری، اخلاقی اور تنظیمی لحاظ سے توانا ہو کر جلد سے جلد حصولِ مقصد تک پہنچے۔

اگر ایسا ہُوا تو دارالاسلام کی سچی روح منصورہ کے بھی ذرّے ذرّے میں زندہ رہے گی۔

# رخصت

# اے بزم جہاں

۱۹۔ جون کو لاہور سے اور ۲۰۔ کو کراچی سے روانگی۔ ۲۰۔ کی دوپہر دوبئی کے ہوائی اڈے پر اور رات ایک ہوٹل میں۔ ۲۱۔ کو دوبئی سے فرینکفرٹ اور پیرس ہوتے ہوئے لندن۔ رات یو کے اسلامک مشن کے دفتر میں قیام۔ ۲۳۔ کی شام کو نیویارک، پھر فلوریڈا، ڈیٹرائیٹ، پھر انڈیاناپلس، پھر بالٹی مور، پھر واپس نیویارک، ۱۳۔ جولائی کو نیویارک سے کاسابلانکا اور قاہرہ ہوتے ہوئے جدّہ، ۱۶۔ کو مکّہ معظمہ، ۱۸۔ کو مدینہ منوّرہ، ۱۹۔ کو جدّہ، ۲۰۔ کو پھر مکّہ معظمہ، ۲۱۔ کو واپسی، ۲۲۔ کی صبح کو کراچی اور دوپہر کو لاہور میں "تشریف آوری"!

یوں سمجھئے کہ "بس پھر آنکھ کھل گئی"

ع "جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم تھا خزاں کا"

اور ع "پھر وہی ہم، پھر وہی غم"

مکانی لحاظ سے ہزاروں میل طویل اور زمانی لحاظ سے تقریباً ایک ماہ (۱۹ جون ۱۹۷۹ء تا ۲۲ جولائی ۱۹۷۹ء) میں محدود اس سفر کا بیش قیمت باب یہ تھا کہ محترم مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا لاہور سے ۲۰ مئی کو روانہ ہوئے تھے۔ میں ۱۹ جون کو چلا۔ اواخر جون (غالباً ۲۸ یا ۲۹ کو) ملاقات ہوئی یعنی ایک مہینے کے وقفے سے۔

نیویارک پہنچنے کے تیسرے روز مولانا سے ٹیلیفونی رابطہ قائم کیا۔ سلام و آداب کے بعد عرض کیا کہ میں کسی دن حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ آپ جب چاہیں آجائیں اور اپنے آنے سے قبل ڈاکٹر (یعنی مولانا کے فرزند ڈاکٹر احمد فاروق) کو اطلاع دے دیں تاکہ وہ ایئرپورٹ سے اپنی گاڑی پر لے آئے۔ کیونکہ یہاں تک آنے کا راستہ بہت مشکل ہے۔ بعد میں شامے

سے اس بات کو صحیح پایا۔

پھر ایک دن رختِ سفر باندھا، یعنی اپنا سفری بیگ ساتھ لیا اور ہوائی جہاز کے ذریعے غالباً دو گھنٹے میں بفیلو جا پہنچا۔ ہوائی اڈے سے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا۔ پھر عمارت سے باہر آکر اُن کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب اور اُن کے قریبی عزیز مسعود صاحب دونوں گاڑی میں آپہنچے۔ منزل تک جانے میں سہ پہر کا وقت ہو گیا۔ لہٰذا دن کا کھانا گول کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے میرے حسبِ خواہش چائے کے ساتھ بسکٹ پھل وغیرہ فراہم کر دیے۔ نمازِ عصر کے بعد مولانائے محترم اندرونِ خانہ سے اپنے "واکر" کے سہارے کشادہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ مجھے بلوایا گیا۔ اُوپر کی منزل سے اُتر کر حاضر ہوا۔ مصافحہ کے ساتھ ہی میں نے کہا کہ "مولانا آپ نے تو یہاں بھی کھینچ بلوایا۔ جواباً مولانا نے غالباً کچھ ایسی بات کہی کہ جہاں ہم ہوں گے وہاں آپ کو آنا ہی ہوگا۔ پھر شاید یہ بھی کہ آخر آپ نے امریکہ دیکھ لیا۔ عرض کیا کہ ایسی کوئی خواہش میرے اندر نہ تھی۔ یوں بھی طبیعت سفر گریز ہو گئی ہے۔ پھر بات کا رُخ مولانا کی صحت کے موضوع کی طرف مڑ گیا۔ ایک بات تو از خود ظاہر تھی، یعنی مولانا کی مجموعی ظاہری حالت اچھی تھی، چہرہ شاداب تھا، لہجے میں اُبھار تھا، گفتگو میں بشاشت کا رنگ تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ خوشگوار عمومی تبدیلیاں بڑی حد تک ماحول کے بدلنے، جائے قیام کے پُر فضا ہونے، صاحب حیثیت مگر سلیم الطبع اولاد کی خدمت کیشی، بہترین صاف ستھری غذاؤں کی فراہمی، مولانا کی روایت کے مطابق مکمل پابندیٔ اوقات اور ملاقاتیوں کے ہجوم اور مسائل کی یورش میں کمی کا نتیجہ تھیں۔

البتہ معلوم ہوا کہ جوڑوں کا درد بدستور ہے اور ابھی چند ہی روز پہلے (ایک ہفتے سے زیادہ نہیں) درد کا علاج ایک جدید ترین معالجاتی تکنیک سے شروع ہوا ہے، یعنی مشین کے ذریعے فوق السماعت قسم کی صوتی لہریں پیدا کی جاتی ہیں جو ماؤف جوڑوں اور ہڈیوں تک حرارت کی لہروں میں بدل کر پہنچتی ہیں اور گوشت سے گزر کر براہِ راست مقامات درد پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ اس طرزِ علاج کا جس کا ایک کورس دو ماہ کا ہے اقدیے اچھا ہی اثر ہے۔ مگر اس کے اثرات کا صحیح اندازہ ۲۵۔۲۴ دن کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

مولانا کہہ رہے تھے کہ اگر یہ علاج مفید رہا تو ضروری مشینیں خرید کر واپسی پر لے آؤں گا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بطور علاج مولانا کو ۶، ۷ سیڑھیاں چڑھنے کا تجربہ بھی کرایا جا رہا ہے۔

اس اثنا میں خلیل حامدی صاحب اور نیویارک کے ذکی الدین صاحب بھی آ چکے تھے۔ چائے کا دور بھی چلا اور باتوں کا حلقہ بھی وسیع تر ہو گیا۔ مولانا نے مجھ سے بھی اور خلیل صاحب سے بھی ادھر کے حالات دریافت کیے۔ مختصراً ضروری باتیں بتائیں۔ ذکی الدین صاحب نے اسلامی یونیورسٹی کے بارے میں مولانا سے مشورہ طلب کیا۔ خاصا وقت گزر جانے پر ہم نے مولانا سے خود ہی عرض کیا کہ اب شاید آپ کو بیٹھنے میں زحمت ہو رہی ہے، آپ واپس تشریف لے جائیں۔ اور ہمارا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ مولانا مصافحہ کر کے تشریف لے گئے۔

صحبت روشن دلاں یک دم، دو دم    آں دو دم سرمایۂ بود و عدم

شام کا کھانا ڈاکٹر احمد فاروق ہی کے ساتھ کھایا گیا۔ دستر خوان پر دال کی موجودگی امریکہ میں پاکستانیت کے حلول پر دلالت کر رہی تھی۔ ۱۰، ۱۱ بجے ہم تینوں مسافران بے منزل قریبی قصبہ بفیلو کے لیے روانہ ہو گئے جہاں سے اگلے دن ڈیٹرائیٹ جانا تھا۔

پھر مولانا کی صحت کے سلسلے میں بعد کی تازہ اطلاع یہاں یہ ملی کہ آٹھ دس روز پہلے (۲۳۔ جولائی کو) اُن کو ایک خاص قسم کا انجکشن ریڑھ کی ہڈی میں لگایا گیا جس سے کمر اور گھٹنوں کے درد میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ چہرے کی رنگت بھی بہتر ہو گئی ہے۔

## مولانا کے بڑے بھائی کی رحلت

مولانا سید ابوالخیر مودودی بتاریخ ۲۸ اگست ۱۹۷۹ء (مطابق ۴ شوال ۱۳۹۹ھ) بروز سہ شنبہ بوقت ایک بجے دوپہر انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

مرحوم مولانا سید ابوالاعلیٰ مدظلہ کے بڑے بھائی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صدمہ سب سے بڑھ کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ہی کے لیے ہے، وہ آج وطن سے ہزاروں میل دُور ہیں۔ جب انھیں یہ اطلاع ملے گی، تو احساس کچھ شدید تر ہی ہو گا

اُدھر مولانا ابوالخیر مرحوم کے لیے دُنیائے علم بھی ماتمی ہے۔ مرحوم نے جدید و قدیم علوم کی مہارت کے ساتھ دارالترجمہ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام برصغیر کی ملّتِ اسلامیہ کی قیمتی خدمات انجام دی ہیں۔ اور نہیں تو کم سے کم مرحوم کی ایک خدمت فتوح البلدان کے اُردو ترجمہ سے تو بیشتر اصحابِ مطالعہ واقف ہوں گے۔ "ڈھنڈورے" کے اس دَور میں اُن کی شہرت گریزی ہی تھی کہ اوّل درجے کے ایک مصنّف و محقق، ایک مترجم اور ایک تنقید نگار اور مؤرخ کے قدردان صرف خواص ہیں۔

مولانا ابوالخیر کی شخصیت صرف علمی ہی نہ تھی، وہ دینی لحاظ سے بھی ایک مقام رکھتے تھے، نیز اُن کا مزاج ایک خاص رنگِ تصوف میں رنگا ہوا تھا۔ مولانا ابوالخیر مرحوم نے نہ صرف یہ کہ والدِ گرامی کی وفات کے بعد مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری پوری کی اور تحریکِ اسلامی کے سلسلے میں مولانا پر جو مشکل اَدوار گزرے اُن میں ان کا پورا پورا ساتھ دیا، بلکہ وہ جماعتِ اسلامی سے بھی خیر خواہانہ محبت رکھتے تھے۔ ترجمان القرآن کے وہ کئی برس سے پبلشر بھی تھے۔

## کرب انگیز خلاء

وہ ایک شخص تھا، جس کے ساتھ ۳۸ سال گزر گئے! ـــــ مولانا مودودیؒ!

کتنا سخت لمحہ ہے کہ اُس شخص کے جسد کی امانت کو مٹی کے حوالے کرنے کے بعد میں اُسی کی جدائی کا ذکر چھیڑ رہا ہوں۔ ترجمان القرآن کی ادارت کرنے اور اس کے ذریعے دُور دراز تک ایمان و حکمت کا نور پھیلانے والی ہستی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اُس کی کرسی خالی ہے، وہ اپنے تاریخی کمرے میں بھی موجود نہیں، اور اہلِ خانہ کی مجلس میں بھی شریک نہیں ہے۔ اس کی کتابیں جیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے ڈھونڈ رہی ہیں۔ اس کی میز پر رکھے ہوئے کاغذ اس کا انتظار کر رہے ہیں اور اس کا قلم سوچتا ہے کہ وہ کب آکر اُسے اپنے ہاتھ میں لے گا۔ اُس کی رہنمائی و شفقت کے سائے میں کام کرتے ہوئے بڑی قوت محسوس ہوتی تھی۔ قلم بے باکی سے چلتا تھا اور اربابِ فساد و عناد کے

بڑے بڑے محاذ بے وقعت معلوم ہوتے تھے۔ آج قلب و نظر کی وہ کیفیتیں جوں کی توں کیسے برقرار رہ سکتی ہیں، لیکن اصل سرچشمۂ قوت چونکہ خداوندِ کون و مکان ہے، اس وجہ سے مجھے یقین ہے کہ موجودہ مرحلۂ سخت کے گزرتے ہی وہ پہلے سے بھی زیادہ قوت و اعتماد عطا کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اس کے ساتھ مل کر اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والے رفیقوں کو نئے مراحل میں پہلے سے زیادہ عزم و ہمت کی ضرورت ہوگی۔

میری پہلی ملاقات مولانائے مغفور سے ۱۹۳۸ء میں بمقام دارالاسلام پٹھانکوٹ ہوئی تھی، اور آخری ملاقات بفیلو میں جون ۱۹۷۹ء کو۔

میں اُن چند خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہوں جنھوں نے پاکستان سے ۱۴ ہزار میل دُور، اُس سرزمین پر مولانائے مغفور سے دل خوش کُن ملاقات کی جہاں مولانا کے لیے آخری سانس لینا مقدر تھا۔ وہاں اُن کی عام صحت کو بہتر، چہرے کو شاداب اور گفتگو کو تروتازہ پایا۔ اُس علاج کی افادیت بھی معلوم ہوئی جس کا آغاز چند ہی روز پہلے ہوا تھا۔

پھر جس دن مولانا مودُودی رحمۃ اللہ علیہ کے آپریشن کی خبر آئی تو تشویش تو ہوئی مگر دل کی اُمیدیں جوں کی توں برقرار رہیں۔ اس اطلاع کے ملنے کے بعد مولانا مغفور کے گھر میں ختمِ قرآن اور ذکر و دُعا کا ایسا سلسلہ چلا کہ ۲۲ ستمبر کی خبرِ خدنگ اثر کے آنے تک برقرار رہا۔ سینکڑوں خواتین ہر روز جمع ہوتیں۔ صبح سے رات گئے تک آتی جاتی رہتیں، اور ہر گھڑی ذکر و دُعا کا دور چلتا رہتا۔ متفرق طور پر مختلف محلوں کے کئی کئی گھروں میں بھی یہی صورت تھی۔ ظاہر ہے کہ دوسرے شہروں اور قصبوں کے علاوہ دُور دراز کے دیہات سے بھی دُعاؤں کے ہجوم عرشِ الٰہی تک اُٹھے۔ مولانا کے اپنے گھر کے علاوہ اچھرہ اور لاہور کے دوسرے حصّوں میں محبانِ مودُودی نے بکرے ذبح کرا کے صدقے میں دیے۔ گویا ذکر و دُعا اور صدقہ و انفاق کی ایک خاموش تحریک تھی جو کسی کی ہدایت کے بغیر چل رہی تھی۔ اِن مخلصانہ و دردمندانہ کوششوں سے خُدا کی اٹل تقدیر کو بدلا نہیں جا سکتا تھا، ہونے والا سانحہ اپنے وقتِ مقررہ پر ہو گیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) مگر ذکر و دُعا کی یہ مساعی ضائع تو جا نہیں سکتیں، اُن پر تو وعدۂ الٰہی کے مطابق برگ و بار آنے ہیں۔

۳۸ سالہ دور میں ہم نے نہ صرف دین کا اصل مدعا مولانا سے سمجھا، بلکہ اُن سے لفظاً لفظاً قرآن و حدیث کے درس سُنے، بلا جھجک اُن سے ہر طرح کے سوالات کیے، اُن سے بحثیں کیں، دماغ میں اپنے دَور کے جتنے اثرات بھرے ہوئے تھے اُن کے سامنے اُگل دیئے، اُنھوں نے جس محبت، جس کشادہ دلی اور جس حوصلہ افزائی کے ساتھ ہمارا علمی و ذہنی تزکیہ کیا، وہ اُن کی طرف سے ہم پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کا جواباً کوئی صلہ دینا سوائے دُعاؤں کے ہمارے بس میں نہیں ہے۔ پھر ملکی اور بین الاقوامی سیاسیات، معاشیات، نظریہ ارتقاء، مارکس ازم، جمہوریت، فسطائیت، ہندو امپریلزم وغیرہ وسیع مباحث میں اُنھوں نے جس طرح ذہنوں کی آبیاری کی اور دُنیا کے ہر فتنے کے بالمقابل جس خوبصورتی سے رموزِ دین کو ہم پر آشکار کیا، اس کا بیان کیسے ممکن ہے۔ کہنا یہ چاہیے کہ جیسے ۳۸ برس کا پورا زمانہ ایک کالج یا یونیورسٹی میں گزارا جس میں ایک ہی شخص تمام مضامین کا لیکچرار اور پروفیسر تھا جس کا اصل مرکزی موضوع نظامِ اسلامی کا احیاء تھا۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اگر میں اس سعادت سے محروم رہتا تو ایک دیہاتی نوجوان کی حیثیت میں زیادہ سے زیادہ کلرکی یا مدرّسی یا ایڈیٹری جیسا کوئی کام کر لیتا۔ دوسری طرف اخلاقی حیثیت سے ماحول کا تیز و تند دھارا نہ جانے مجھے کن گردابوں میں جا پھینکتا، میں اب جو کچھ ہوں ـــــ اگرچہ اب بھی خدا کا ایک کوتاہ کار بندہ ہوں ـــــ میرے اندر جو بھی خوبی ہے اُس کا بڑا حصہ اُس مردِ حق کی وجہ سے ہے جس کے قرب کی سعادت میرے لیے مقدر ہوئی۔

اس ۳۸ سال کی مُدّت میں مَیں نے بھی اور بے شمار دوسرے رفقائے مقصد نے بھی اس شخص کی ذاتی زندگی کے ہر پہلو کو بھی دیکھا اور اس کی دعوتی اور سیاسی اور علمی سرگرمیوں کو بھی خوب اچھی طرح چھانا پرکھا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا اور رسولؐ کے لیے گہری محبت کا جو رجحان، خدا کے دین کے لیے جو بے پایاں جذبہ، برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جو گہرا تفکر، پاکستان کے لیے جس طرح کا ولولہ بے تاب اور پورے عالمِ اسلام کے مسائل کے لیے اس کے اندر جو مخلصانہ اضطراب کار فرما دیکھا ہے، اس کی کوئی

دوسری مثال نہ ملے گی۔ پھر ایک شخص نہ کبر وریا سے کام لیتا ہے، نہ انکسارِ بے جا کا مظاہرہ کرتا ہے، نہ دین میں مداہنت کی اور نہ سیاست میں خیانت کی روش اختیار کرتا ہے، دعوت ماننے والوں کو اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی طرح محبت و شفقت سے نوازا، اور گالیاں دینے والوں کو نظر انداز کیا۔ رفقاء میں سے کسی نے اس کے رویے سے اتفاق کیا تو وہ خوش، اور اختلاف کیا، بلکہ تنقید کی تو وہ احسان مند۔ نہ مخالفوں کا تذکرہ کبھی چھیڑ کر کیا، نہ احوالِ ناسازگار کا سامنا کرتے ہوئے گھبراہٹ دکھائی، نہ کبھی وہ غصے سے بے قابو ہو کر کسی پہ برسا، نہ طوفانِ عناد و فساد میں گھر کر اُس نے کبھی مایوسانہ نقطۂ نظر سے کام لیا۔ زبان ہمیشہ معیاری اور پاکیزہ رہی، لہجہ ہمیشہ نرم و لطیف رہا۔ اس کے سامنے الزبخش تڑپ گیا، ڈاکٹر نذیر کی شہادت کی خبر اس کے کانوں تک پہنچی۔ تحریک ۱۹۷۷ء میں محبانِ دین گولیوں کا نشانہ بنے اور پولیس کی لاٹھیوں نے علماء کی بوٹیاں اڑا دیں، اور اس کے چہیتے نوجوان قلعے اور سی آئی اے کے دفتروں اور تھانوں میں غیر انسانی شقاوتوں کا تختۂ مشق بنے تو ایسے عالم میں بھی اُس کا مشہور سلوگن نہ بدلا ــــــ "صبر اور حکمت!"

معاملہ محض ایک فرد کے ذاتی غم کا نہیں ہے، مولانا کے غم جدائی کی وسیع جاگیر کے حصہ دار بے شمار ہیں، مگر سب سے پہلے جس حلقۂ غم زدگان کا احساس ہوتا ہے وہ مرحوم و مغفور کے گھر کے لوگ ہیں۔ ہماری وہ بڑی بہن جو مولانا کی رفیقۂ مقصد حیات رہی ہیں، آج بیوہ ہو گئی ہیں۔ انھوں نے اگرچہ ضبطِ گریہ کی ایک اعلیٰ مثال قائم کی ہے، مگر یقیناً مولانا کے مغفور کی وفات نے اُن کی شخصیت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ وہ پچھلے چند برس سے خدمتِ دین اور درسِ قرآن کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو مولانا کی تیمارداری، پابندیٔ وقت کے ساتھ اُن کے لیے غذا اور دوا کے اہتمام اور اُن کی خبرگیری اور خدمت میں لگی رہتی تھیں، اور امریکہ میں مولانا کے مرض الموت کے دوران جو انتہائی سخت دورِ آزمائش اُنھوں نے گزارا ہے، اس کے بعد مولانا کی جدائی نے اُن سے گھریلو سرگرمیوں کا مرکز چھین لیا ہے۔ خدا اُن کی سعادت مند اولاد کو سلامت رکھے، مگر ایک عظیم شخصیت کی رفاقت و خدمت کا خلا کوئی بھی پُر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مولانا کے نہایت ہی لاڈلے اور حساس بیٹے اور بیٹیاں ہیں اور مجھے اندازہ

ہے کہ ظاہری صبر کے باوجود اُن کے دل اندر سے کس طرح کٹ رہے ہیں۔ ہم سب اُن کے دُکھ درد میں شریک ہیں۔ ہم اس پورے گھر کا احترام کرتے ہیں۔ ہم مولانا کے اہلِ خانہ سے ہر ممکن تعاون کرتے رہیں گے اور اُن کو یہ محسوس نہ ہونے دیں گے کہ بس ہمارا تعلق صرف مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، اور اب مولانا مودودیؒ کے گھر والوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ مولانا مغفور کے ملازموں اور خادموں کا بھی ہمیں لحاظ ہے۔

اس موقع پر میں یہ بھی کہوں گا کہ مولانا اور بیگم صاحبہ کے صاحبزادے اور صاحبزادیاں زیادہ تر دین سے وابستہ اور تحریکِ اسلامی سے متاثر ہیں، مگر اب مولانا کی وفات کا غم لگنے پر اُن کے پگھلے ہوئے دلوں کو میں مائل کرنا چاہتا ہوں کہ وہ سب کے سب اب پوری سرگرمی سے اقامتِ دین کی جدوجہد میں شریک ہوں اور مولانا نے جس کام میں ساری عمر اپنی ہر قوت کو خرچ کیا، اُن کے اخلاف بھی پوری یکسوئی سے اسی کو سرمایۂ دُنیا و آخرت بنالیں۔ اس طرح وہ ایک وسیع برادری میں عزت کا مقام پالیں گے۔ یہ بلند مقام اُن کا ہر لمحے منتظر ہے۔ دولت اور کاروبار اور عہدے اور شہرت اور سامانِ آسائش و آرائش وہ چیزیں نہیں ہیں جن کے لیے مولانا مودودی کا خاندان سرگرداں ہو۔ آپ دُنیا سے بے نیاز ہو کر خدا کے دین کے پیچھے چلنے کا فیصلہ کرلیں۔ دُنیا اپنے سارے مادی اسباب و وسائل لے کر آپ کے پیچھے چلے گی ——— اس طرح چلے گی جس طرح خدم و حشم چلتے ہیں۔ آپ سب اُن بڑوں کو اپنے بزرگ اور اُن چھوٹوں کو اپنے بھائی اور عزیز سمجھیں جن سے مولانا مودودی مغفور صاحب کا عمر بھر کا رویّہ (جو آخر دم تک رہا) آپ کے لیے بجائے خود ایک وصیت ہے، ان کا سارا لٹریچر ایک وصیت ہے۔ ان کا سلسلۂ روابط ایک وصیت ہے۔ ان کی دعوتِ دین اور خدمتِ دین ایک وصیت ہے۔ اس وصیت کا جزو بہ جزو پورا کرنا آپ کی اوّلین ذمہ داری ہے۔ اس کے بغیر تو قیامت کے دن اپنے معزز مگر اصول و مقصد رکھنے والے باپ کے سامنے حقِ فرزندگی و قرابت پورا کر کے دکھانا مشکل ہو جائے گا۔ آپ کے سامنے طغریٰ یہ ہونا چاہیے کہ آنچہ پدر نتواند پسر تمام کند۔ مرحوم و مغفور نے اپنا کام جس مقام پر پہنچا دیا ہے، اُسے اس سے آگے لے کے چلنے والوں میں آپ پیش پیش ہوں ہمارے

لیے کیا ہی مقام مسرت ہو گا کہ آپ نیچے کی مختلف ذمہ داریوں سے گزر کر . . . . زیادہ اہم مناصب تک پہنچیں۔ آپ اگر اپنا فرض صحیح طور پر ادا کرنے لگیں تو مولانا مودودی کی قائم کردہ جماعت کی لیڈر شپ کی صف آپ کے بغیر مکمل نہ ہو سکے گی۔ آپ مصر کے استاد حسن البنا شہید کے معزز صاحب زادے سیف الاسلام کی مثال بنیں اور جب کبھی آپ عالم اسلام کی دنیائے شرق و غرب میں کہیں بھی جائیں تو خواص و عام یہ سُن کر ٹوٹ پڑیں کہ اسلام کے عظیم مفکر مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے تشریف لائے ہیں۔ آپ ادنیٰ مقاصد کی سطح سے بلند ہو کر اپنے تاریخ ساز باپ کے خالی کردہ رتبے تک پہنچنے کے مستحق بنیں۔ وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز۔

مولانا کے وسیع پسماندگان میں وہ تمام خاص و عام شامل ہیں جو اس عقیدے اور نصب العین کے فدائی ہیں۔ ایسے فدائیوں کو برسوں کی محنت سے مرحوم و مغفور نے اپنے گرد سمیٹا، پھر ان کو منظم کیا، ان کی تربیت کی، ان کو کام سونپے، اُن سے مشورے لیے، ان کی عزت کی اور انھیں تاریخ پر اثر ڈالنے والی ایک بڑی قوت بنا کے اپنے پیچھے چھوڑا۔

مولانا کا یہ وہ خاندان ہے اور یہ ایسی برادری ہے کہ مولانا نے جب جس کام کے لیے اُن کو پکارا اُنھوں نے لبیک کہا، اُن میں سے کتنوں نے عہدوں اور ملازمتوں کو تج دیا، کتنوں نے حرام آمدنیوں سے حاصل شدہ جائیدادوں کو الگ کر دیا اور کتنوں نے عزیزوں اور دوستیوں کو چھوڑ دیا۔ پھر خدا کے یہ بندے جیلوں میں گئے، سڑکوں پر لاٹھیوں اور گولیوں کا نشانہ بنے، گالیوں کی بوچھاڑوں سے دوچار ہوئے۔ تھانوں اور حوالاتوں میں خراب ہوئے، لاہور کے شاہی قلعہ اور دوسری عقوبت گاہوں میں اُن کے جسموں اور عضلات کو پیس ڈالا گیا، اور اُن کو اعصاب شکن ذہنی اذیتیں دی گئیں اور اُن کی عزت نفس کے پرزے اُڑائے گئے۔ ان میں سے ہر شخص قربانیوں کی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اور سب کچھ چھوڑ کر آپ اس دیہاتی کارکن کا تصور کیجیے جس کو ضرورت کی پوری آمدنی میسر نہیں، جس کے بدن پر اچھا بلکہ کافی لباس نہیں، جس کے بچے مشکلات سے گزر رہے ہیں لیکن وہ بیس پچیس برس سے ایک عاشق جنون زدہ کی طرح اقامت دین کے لیے صحرا نوردیاں کرتا

ہے، وہ مولانا کی ہدایت پر عوام کو کوئی پیغام پہنچانے کے لیے کوچہ گردیاں کرتا ہے، وہ ایک ایک پمفلٹ کو لے کر ہر دروازے پر دستک دیتا ہے، اجتماعات میں شرکت کے لیے سفر کرتا ہے، تربیت گاہوں کے لیے وقت نکالتا ہے اور غریبی کے باوجود خدا کی راہ میں انفاق کرتا ہے۔ حق یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ کی مقصدی برادری کے اس چھوٹے سے کارکن کے قدموں کی دھول سیم وزر کے انباروں، کوٹھیوں اور کاروں سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کی شخصیت اربابِ دولت وجاہ کی شخصیتوں سے ہزار گنا پاکیزہ اور بلند ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ مولانا کی مقصدی برادری کے ایسے ایک ایک رکن کا دکھ کون بٹائے گا، اس کے آنسو کون پونچھے گا، اس کو کون سہارا دے گا اور اس کے سامنے تعزیت کے لیے کون جائے گا۔

اسی صف کے اُن ہزاروں پیارے بھائیوں کا تصور کرتا ہوں جو چترال اور بلوچستان سے لمبے لمبے سفر کرکے اس لیے لاہور پہنچے کہ مولانا کے جنازے میں شریک ہوں اور بآخری بار اُن کے چہرے کی جھلک دیکھ سکیں۔ کوئی حساب ہے ان لوگوں کے دُکھے ہوئے جذبات کا۔ جن میں سے کتنے بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے رہے، اور زیارت کے لیے میل بھر لمبی قطارِ انتظار میں کئی گھنٹے کھڑے رہے۔

اور مولانائے مرحوم و مغفور کی اس وسیع برادری کی ایک اہم صف اُن بیدار دل اور شاہین نگاہ نوجوانوں کی ہے جنھوں نے درس گاہوں کی مخالفانہ تعلیمی فضا اور معاشرے کے فاسد ماحول کو شکست دے کر مولانا کا پیغامِ انقلاب اپنے اندر جذب کیا اور آج اُن کی جانیں پرچمِ حق کو بلند کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ان نوجوانوں نے اپنے آپ کو الحاد اور مادہ پرستی اور سوشلزم اور جنسی ثقافت سے اس طرح اپنے آپ کو بچا نکالا ہے جیسے کوئی نوخیز بچہ خرکاروں کے چنگل سے نکل بھاگا ہو۔ انھوں نے شدید تعلیمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ایک طرف اپنے آپ کو اسلامی شعور اور اسلامی کردار سے آراستہ کرنے کی مساعی جاری رکھیں، دوسری طرف یونیورسٹیوں کے ماحول میں انھوں نے مخالفِ اسلام نظریات کے جال پھیلانے والوں کا زور توڑ دیا، اور تیسری طرف یہ ملک کی اسلامی تحریک کا سرمایۂ تقویت ہیں۔

مجھے اندازہ ہے کہ عزم و ہمت کے ان پیکروں پر کیا گزری۔ اُن کی روحیں کیسے تڑپ تڑپ گئیں، مگر اُنھوں نے اپنے سینوں کی جراحتوں سے خون نہیں ٹپکنے دیا۔ پھر کمال یہ کہ اپنی تفتہ جگری کے باوجود اُنھوں نے اپنے لیڈروں کی زیر کمان تابوت کی آمد، سید مغفور کے رُخِ پُرنور کی زیارت اور جنازے کی اسٹیڈیم روانگی اور واپسی کے انتظامات منظم سپاہ کی طرح کیے۔ یہ نوجوان جو اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ سید مودودی اور مرشد مودودی کو چاہتے تھے، آج محترمی میاں طفیل محمد سے لے کر مجھ ناچیز تک مولانا کی ساری برادری اپنی اس نوجوان صف کے دُکھ درد کا بہ شدت احساس کرتی ہے۔ مستقبل کے ان مجاہدین تحریکِ اسلامی کے سامنے میں سب کی طرف سے اظہارِ ہمدردی اور تلقینِ صبر کا فریضہ ادا کرتا ہوں، نیز دُعا کرتا ہوں کہ سید مودودی کے یہ لاڈلے بچے اور اسلام کے یہ فدا کار سپاہی آنے والے دَور میں تحریکِ غلبۂ اسلام کو تاریخ کے آخری کناروں تک پہنچا دیں اور دعوتِ حق کے جس عَلَم کو اُنھوں نے تھاما ہے اُسے دُنیائے انسانیت کے ہر اُونچے سے اُونچے مقام پر گاڑ دیں۔ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ!

میں اپنے آپ پر بھی، اور اپنے تمام رفیقوں پر بھی لازم سمجھتا ہوں (اور میرے سارے رفیق بھی لازم سمجھتے ہیں) کہ مولانا کی اپنی بنائی ہوئی اس مقصدی برادری کے ہر رکن سے محبت کی جائے۔ اور اس کو احترام و اعتماد کا مستحق سمجھا جائے۔ اور مولانا کے خونی رشتوں اور خاندان کا بھی یہ فرض ہے کہ مولانا کے ان روحانی رشتہ داروں، بلکہ بیٹوں اور چہیتوں اور لاڈلوں کو ہمیشہ محبت و احترام کا مستحق سمجھیں۔

میں اپنے ادارے کے ذریعے مولانا کی اس پوری برادری کے ہر ہر فرد سے (جو پاکستان میں بھی پھیلی ہوئی ہے اور پاکستان سے باہر بھی دُنیا کے مختلف خطوں میں موجود ہے) تعزیت اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں نیز اُن سے درخواست کرتا ہوں کہ مولانا کے تمام چاہنے والے اس عقیدہ و نصب العین کی سربلندی اور نظامِ اسلامی کے غلبہ کی جدوجہد پہلے سے زیادہ عزم و ہمت کے ساتھ کریں جس کے لیے مولانائے مغفور نے آخر دم تک بھرپور کام کیا۔ اگر یہ نہیں تو محبت یا تو محض جذباتی نوعیت کی رہ گئی یا کہ۔

دُنیوی مفاد کے لیے!

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی اس وسیع برادری ہی کے جذبۂ محبت و احترام نے ہمیں مجبور کر دیا کہ جنازے کی تدفین میں قدرے تاخیر کو گوارا کر لیا جائے۔ ورنہ ہزاروں لاکھوں افراد کا دردِ محرومی ہمیں تڑپا تڑپا دے گا۔ ان کے جذبے مرجھا جائیں گے اور کلیجے مسوس کر رہ جائیں گے۔ مولانا کے زخم خوردہ فدائیوں کے ساتھ ایسا خوف ناک تجربہ کرنے کی ہم میں ہمت نہ تھی۔

بلاشبہ حکم ہے کہ تکفین و تدفین میں عجلت کی جائے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ۔ اسرعوا بالجنازۃ (یعنی جنازے میں جلدی کرو) حُصَیْنُ بن وَحْوَحْ نے حضرت طلحہؓ بن براء کی وفات کے موقع پر حضورؐ کا ارشاد " عَجِّلُوْا بِہٖ " نقل کیا ہے۔ یعنی تجہیز و تکفین اور جنازہ اٹھانے میں جلدی کرو۔

یہ حکم اگر فرضیت و وجوب کی نوعیت رکھتا ہو تو پھر تو کسی بڑے سے بڑے سبب کو بھی اس کی عین مین تعمیل میں مانع نہیں ہونا چاہیے۔ حقیقت میں اس پر عمل کرنا مندوب و مستحب ہے اور اس کی حکمتیں اور مصلحتیں واضح ہیں۔ بروئے سنت مندوب و مستحب تقاضوں کو بالعموم پورا کرنا چاہیے اور عام طور پر تکفین و تدفین میں جلدی کی ہی جاتی ہے۔ لیکن اگر کبھی کوئی بڑی ضرورت سامنے ہو، مثلاً مناسب وقت میں اعزہ و اقرباء کے شریکِ جنازہ ہونے کا امکان ہو، یا وارثِ حقیقی موجود نہ ہو اور اُس کا تھوڑی بہت دیر میں پہنچ جانا متوقع ہو، یا طوفانِ باد و باراں اتنا شدید ہو کہ شامیانہ تان کر بھی قبر تیار کرنا ممکن نہ ہو اور اگر تیار کریں تو اس کے کنارے گرنے لگیں یا پانی اندر بھر جائے یا یک وقت کسی بستی میں یا کسی گھر میں آگے پیچھے موتیں ہو جائیں تو ایسی صورت میں توقف کیا جا سکتا ہے۔ میں اگرچہ فتویٰ دینے کا مقام نہیں رکھتا مگر سرسری حیثیت سے مسئلے کی نوعیت کو سمجھتا ہوں اور جنازے کے سلسلے میں پیش آنے والی عملی صورتوں کا مجھے تجربہ و مشاہدہ ہے۔

جہاں تک دلیل کا تعلق ہے، عملِ صحابہؓ سے بڑی قاطع دلیل ملتی ہے۔ آخر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک کو کم از کم ۲۴ گھنٹے تاخیر سے سپردِ لحد کیا جا سکا۔ اس کی

ایک وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے گروہ تا دیر یکے بعد دیگرے جنازہ پڑھتے رہے۔ گویا ایمانی فدائیوں میں سے اکثر کو محروم رکھنا صحابہؓ نے درست نہیں سمجھا۔

ہم جیسے عامیوں کی موت کے مقابلے میں جن کا تعلق اپنے گھر یا خاندان کے چند افراد سے ہوتا ہے، خدا کے دین کی خدمت کرنے والی مقبولِ خلائق اور محبوبِ عام شخصیتوں کا معاملہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ ایسی ہستیوں کا خاندانِ محبت بڑا وسیع ہوتا ہے اور اس وسیع خاندان کو درکنار رکھ کر محض خونی رشتے کے دو چار ورثاء کا کوئی فیصلہ کر دینا مناسب نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے بھائی بندوں اور بیٹوں بیٹیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے جن کی رعایت اس بنا پر ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ کسی متوفی نے زندگی میں اُن کے جذبات کی رعایت ملحوظ رکھی۔

پس ایک حکمِ مندوب کے ثواب کی کمی، ہزارہا انسانی قلوب کے اطمینان اور اُن کی شرکتِ جنازہ سے پوری ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ جنازوں کا بڑا ہونا جہاں یہ معنی رکھتا ہے کہ انبوہِ کثیر نے ایک شخص کے حق میں دُعا کرنے کے ساتھ ساتھ اچھی شہادت دی اور اپنے لیے ثواب حاصل کیا، وہاں دین کی تاریخی کشمکش میں حصہ لینے والی شخصیتوں کے جنازے دُنیا کے لیے ایک علامتِ ہدایت بھی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ امام احمدؒ بن حنبل اور امام ابنِ تیمیہؒ نے فرمایا تھا کہ یہ تو ہمارے جنازے ہی واضح کریں گے کہ ہم یا ہمارے مخالفین میں سے کون حق پر ہے، چنانچہ اُن کے جنازے کی وسعت و عظمت اُن کے حق میں علامت بن گئی۔ آج مولانا مودودیؒ کا جنازہ بھی اُن کے حق میں ایک دلیل اور علامت کی حیثیت سے سامنے آیا ہے۔

کیا خوب بات کہی اُن کے ایک محبِّ خاص استاذ یوسف القرضاوی نے کہ مولانا مودودیؒ کا جنازہ نہیں، ریفرنڈم تھا۔ اس جنازے نے اسلام اور غیر اسلام کے درمیان لکیر کھینچ دی ہے۔ اس جنازے نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان میں اسلام کے سوا اب کوئی دوسرا نظریہ نافذ نہیں ہو سکتا۔ پاکستان اب اسلام کے لیے وقف ہو گیا ہے۔ سبحان اللہ

اگر مولانا کی بیماری اور وفات کی خبر نہ دی جاتی اور جنازے کے متعلق کسی طرح کا

اعلان کیے بغیر چپکے سے میت لاکر جلدی جلدی دفن کر دی جاتی تو ایک حکمِ مستحب کا ثواب تو اُن کے ورثا کو مل جاتا مگر دین اور محبانِ دین کو وہ عظیم برکات نہ ملتیں جن سے وہ بہرہ مند ہوئے ہیں۔

مولانا کے معاملے میں تو خدا تعالیٰ کا خاص ہی پروگرام تھا۔ ذاتی طور پر اُن کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اُن کا آخری وقت کسی غیر ملک میں آئے (اس کا اظہار انھوں نے میرے روبرو بھی کیا) لیکن مشیتِ الٰہی نے اپنا راستہ خود معین کیا۔ گھر سے ہزاروں میل دُور بفیلو کے ایک ہسپتال میں اُن کی رُوح قبض کی گئی۔ نتیجہ یہ کہ نیویارک اور لندن میں اُن کے جنازے پڑھے گئے۔ بروایت پروفیسر خورشید احمد مجموعی طور پر ایک درجن مرتبہ جنازے پڑھے گئے۔ اور خبری دُنیا میں اُن کا تذکرہ تازہ ہوا۔ اِدھر ملک کے لوگوں کو موقع مل گیا کہ وہ دُور دُور سے جنازے کے لیے آسکیں، اور بے شمار لوگ آئے۔ خدا ان سب کے جذبۂ اخلاص کو قبول کرے۔

یہ طویل گزارشات ختم کرتے ہوئے میں یہ دُعا کرتا ہوں کہ:

اے اللہ! اپنے دینِ مقدس کی بھرپور خدمات انجام دینوالے سید مودودی کی رُوح پر اپنی رحمتوں اور انوار کا نزول فرما، اس پر اپنی بہترین تجلیات کے پھول برسا! اس کی قبر کو اُفق تا اُفق وسعت دے اور اپنے جمال کی کرنوں سے اسے روشن کر دے۔

اے اللہ! تیرے اس بندے نے اقامتِ دین کی مہم کا آغاز کر کے اس کے عروج کے لیے اپنی پوری عمر کھپا دی، اُسے جزائے وافر عطا فرما!

اے اللہ! وہ ہستی جس نے تیرے پیارے آخری رسولؐ سے اور اس رسولؐ کی ستم رسیدہ اُمت کے ساتھ بھرپور محبت کی اور اس اُمت کی بھلائی کیلئے جیل کی سلاخوں اور پھانسی کے تختے تک کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا، اُسے اپنے رسولؐ کی شفاعت خاص سے نواز، اور اُسے حوضِ کوثر کے مشربِ مقدس سے سیراب فرما۔

اے اللہ! وہ عالمِ اسلام کے ہر دُکھ پر تڑپا ہے، جس نے مسلمانوں کے ہر زخم کی ٹیس اپنے کلیجے میں محسوس کی ہے اور اُن سارے احساساتِ کرب کو اپنے سینے میں جذب کر کے،

جس نے پورے صبر و عزم کے ساتھ ایسے تمام معاملات میں اپنا فرض ادا کیا ہے، اُسے انعام یافتہ انبیاء و شہداء اور صدیقین و صالحین کی محفل میں مسندِ نور عطا فرما۔

اے اللہ! تیرا وہ بندہ جس نے قدم قدم پر مختلف اطراف سے تکفیر و تضحیک کے حملے برداشت کیے اور بدگوؤں کو "جیسے کو تیسا" کے اصول پر نہ کبھی برسرِ عام جواب دیے اور نہ دل میں کوئی کینہ رکھا جو قریبی حلقے میں وقتاً فوقتاً نمایاں ہوتا ہے — اپنے ایسے بندے کو ہر آخری راحت سے زیادہ سے زیادہ حصہ ارزانی فرما۔

اے اللہ! اس داعیٔ حق اور نقیبِ اقامتِ دین نے اپنے مقدس مشن کے لیے جس تحریک کو برپا کیا ہے، اس کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق ہمیں بھی نصیب کر، نیز ہمیں نئی قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرما۔

اے اللہ! جن افراد اور جن اداروں اور جن سرگرمیوں سے اس نے زندگی میں صرف تیرے لیے محبت کی ہے اُن سے محبت کرنے کی سعادت ہمیں عطا فرما۔

اے اللہ! اپنے بعد کام کو جاری رکھنے کے لیے جن اصحاب کو رخصت ہونے والے بانیٔ تحریک نے بطور امیر یا لیڈر توجیت خاص دی اور جن کو مامور کیا یا جن کے کسی منصب ذمہ داری پر آنے کو پسند کیا، اُن کی اطاعت اور اُن سے تعاون اور اُن کی خیرخواہی کی راہ پر ہم کو مستقیم رکھ۔

اے اللہ! راقم الحروف کے لیے تو وہ دینی استاذ اور قرآن و حدیث کا معلم ہونے کے علاوہ ذاتی دائرے میں شفیق بزرگ بھی تھا۔ میں نے بعض اوقات اپنی ذاتی پریشانیوں کو اس کے سامنے بیان کر کے حرفِ تسلی اور کلماتِ دُعا کی شکل میں فیض اُٹھایا ہے۔ میں نے کبھی کبھار اس کے سامنے اپنی اُلجھنیں اور اذیتیں بھی پیش کی ہیں۔ میں نے دو ایک بار اس سے وقتی ضرورتوں کے لیے قرض بھی لیا ہے، اور میرے رب غفور میں نے اس کے سامنے بارہا بے باکی سے (بدتمیزی سے نہیں) بعض ایسی باتیں کی ہیں جنھیں شاید کوئی دوسرا نہ کہہ سکتا اور ایسی کئی باتوں کو سید مغفور نے مجھ سے قبول کر لیا۔ میرے آقا! تیرے اس بندے نے تہائی صدی سے زائد عرصے میں مجھے کبھی خوردہ گیری کا نشانہ نہیں بنایا، مجھ پر میرا

کم تر ہونا واضح نہیں کیا، مجھے زجر و توبیخ نہیں کی، بلکہ میرے ناقص کاموں پر بھی میری حوصلہ افزائی کی ــــــ اے خداوندِ کائنات! میرے اس مشفق محسن کے درجاتِ عالیہ میں مسلسل اضافہ فرما۔

اے اللہ! مولانائے مغفور کے اہلِ خاندان، جماعتِ اسلامی کے وابستگان اور پاکستان، عالمِ اسلام اور بقیہ دُنیا کے تمام محبانِ مودُودی کی جراحت ہائے غم پر صبر و سکینت کا مرہم رکھ دے۔ آمین، ثم آمین۔

# ایک رفیقِ عزیز کے نام

عزیز بھائی! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودُودی جیسا صاحبِ علم و فکر اور مالکِ خُلق و کردار قائد ہم سے جُدا ہو گیا ہے اور یقیناً اس کا صدمہ ہونا چاہیے۔ لیکن آپ کی باتوں سے ایسا تاثر جھلکتا ہے گویا کہ بات ختم ہو گئی۔ اب ویسا کوئی نہیں آئے گا، اور ویسا نہیں ہو گا تو پھر کام کیسے ہو سکتا ہے۔

مولانا مودودی پر ایسی موت وارد نہیں ہوئی ہے کہ اُن کی فکر اور اُن کی تحریک اُن کے نظر سے اُوجھل ہوتے ہی ہوا میں اُڑ جائیں۔ وہ نہیں رہے ہے تو بھی اُن کا قائدانہ فیض ہم میں جاری ہے۔

اور پھر شریعت کے جس تصورِ قیادت سے اُنھوں نے ہمیں آشنا کیا ہے اس کے لحاظ سے اگر کوئی شخص نیت کا مخلص، دین کے مقاصد کو جاننے والا اور ہم سفروں کی مرضی اور ہم سفروں کے مشورے کے ساتھ قافلے کو لے چلنے والا ایسا مل سکے جسے ہم اپنے اندر بہتر پاتے ہوں تو پھر اس کا احترام کیا جائے گا، اس کی اطاعت کی جائے گی، اور اس کو اس کمزور کُن احساس میں پڑنے نہیں دیا جائے گا کہ وہ چونکہ مولانا مودُودیؒ نہیں ہے اس وجہ سے وہ کام نہیں چلا سکتا۔ ہمیں اسے یہ احساس دلانا ہے کہ اپنے معززمنصب کی وجہ سے تم بھی رہبرِ وقت ہی عزیز ہو، تم بھی ہماری بزم میں ویسے ہی فانوس روشن ہو اور ہم تمھارے ایک ایک اشارے پر اسی طرح چلیں گے جس طرح مولانا مودُودیؒ۔۔

دور میں ہوتا رہا ہے۔ چاہے اس کی علمی سطح کمتر ہو، چاہے اس کی بعض آراء مختلف بھی ہوں۔ چاہے اس کا اسلوبِ کار کسی قدر جداگانہ انداز رکھتا ہو، چاہے اس کا مزاج مختلف ہو۔ ہم صرف یہ چاہیں گے کہ ہمیں معروف کا حکم دیا جائے اور منکر سے روکا جائے اور تمام معاملات مشوروں سے انجام پائیں۔ تمام لوگوں کو مقررہ دستوری اسالیب سے بات کرنے کا، اختلافات کرنے کا اور تنقید و محاسبہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ سب کچھ اگر حاصل ہے تو سمجھو کہ مولانا مودودیؒ کی قیادت جاری ہے۔ سمجھو کہ مولانا مودودی زندہ ہیں ——

جسدی لحاظ سے نہیں، دعوتی لحاظ سے!

عزیزمن! آپ میں یہ احساس کیوں پیدا ہوا کہ آپ کے پاس کوئی کام نہیں رہا؟ حق و انصاف کی گواہی دینے والے خدا کے سپاہیوں پر کبھی کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا کہ اُن کے پاس کوئی کام نہ رہے، وہ فارغ ہوں اور پریشان ہونے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مولانا مودودیؒ کا سارا پیغام فراموش کر دیا ہے!

آپ اپنا روئے سخن خدا کی طرف کر کے اس سے کیوں نہیں پوچھتے کہ میرے لیے کیا کام ہے؟ آپ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی محفل آراستہ کر کے وہاں کیوں سوال نہیں کرتے کہ میری راہِ عمل کدھر جاتی ہے؟ سیرت و سوانح کا نورانی دفتر موجود ہے اس سے معلوم کیجیے کہ ایک مسلم کیا کرے؟

خرابی یہ ہے کہ دین کا کام ابھی تک آپ کا ذاتی کام نہیں بنا۔ اصل ذاتی کام، اصل دلچسپیاں، اصل سرگرمیاں، اصل رشتے رابطے دوسرے ہیں۔ دین کو آپ کسی دوسری قوت کی طرف سے عاید شدہ کام سمجھتے ہیں۔

حالانکہ آپ نے خدا کے ہاں مزدوری کرنے والے محنت کاروں میں نام لکھوایا اور خدا کی فوج میں آپ سپاہی بھرتی ہوئے ہیں۔ ایک مزدور خوب جانتا ہے کہ اسے مالک کے کارخانے یا باغ یا کھیت میں کام کرنا ہے، اسی طرح ایک سپاہی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ کن طاقتوں سے جنگ ہے اور وہ کہاں کہاں ہیں، کدھر کدھر سے حملہ کر رہی ہیں اور اُن کا مقابلہ کس کس محاذ سے کیسے کیسے کرنا ہے۔ آپ دوسروں کی طرف سے تجویزوں کا انتظار

کرتے ہیں، آپ خود کیوں نت نئی مفید تجویز نہیں سوچتے ؟

عزیزمن اگر نماز روزہ کی ادائی کے لیے کسی سے پوچھنا نہیں پڑتا تو آخر دعوت حق کو خدا کے بندوں تک پہنچانے، خدمت کے کام کرنے، لوگوں سے رابطہ قائم کرنے، دینی و ملّی مقاصد کی طرف عوام کی توجہ دلانے کے کاموں میں کسی سے دریافت کرنا کیا ضروری ہے ؟ نماز باجماعت ادا کرنے پر اگر کہیں پابندی ہے تو اپنی اپنی انفرادی نماز پر تو کوئی قدغن نہیں !

پیارے رفیق ! میں بھی دکھی ہوں، تم بھی دکھی ہو، اس وقت ہم اپنی ایک قیمتی متاع سے محروم ہو گئے ہیں ——— وہ جو قافلے کی متاعِ گراں بہا تھا، وہ ہماری محفل سے اُٹھ کر چلا گیا، کیونکہ اس کی مہلت کار ختم ہو گئی اور عالم بقاء سے اس کے لیے بلاوا آ گیا۔

یہ ایک آزمائش ہے، اُن آزمائشوں سے بڑی آزمائش جو مخالفین کی طرف سے ہمیں پیش آتی رہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مولانا مودودیؒ کے کام نے اور ان کی محبت و قربت نے، ان کے درس اور گفتگوؤں نے، ان کے اخلاق و کردار نے ہمارے ایمان کو اتنا قوی بنا دیا ہے یا نہیں کہ ہم اس شدید و سنگین آزمائش سے عہدہ برآ ہو جائیں ؟

ظاہری جسدی موت، صدیقین و شہداء و صالحین، مجددین اور ائمہ سب کے لیے حتمی اور ہے، یہاں تک کہ انبیاء علیہم السّلام کی عظیم ہستیاں بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھیں۔ انبیاء کے جدا ہونے کے بعد ان کے سچے پیرووں نے اُن کی تعلیمات کو زندہ رکھا، اُن کے کردار کی جھلکیاں باقی رہیں، ان کے کردار کی شعاعیں بعد میں بکھرتی رہیں۔ اسی طرح مولانا مودودیؒ جو ہمیں اپنی ذات کی طرف بلانے نہیں اُٹھے تھے، بلکہ اُنھوں نے خدا کی طرف دعوت دی، خدا کے رسولؐ کی طرف دعوت دی، خدا کی کتاب کی طرف دعوت دی، خدا کے دین کی طرف دعوت دی اور اقامتِ دین کے لیے تحریک اُٹھانے میں ہماری رہنمائی کی، اُن کے دُنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی خُدا حیّ و قیوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حکمت وسنّت اور اسوہ و سیرت زندہ موجود ہے، خدا کا دین جیتا جاگتا دین ہے اور اقامتِ دین کی تحریک پاکستان ہی میں نہیں، پورے عالمِ اسلام میں چل رہی ہے، تو پھر ہم لوگوں کا خدا کا پرستار بن

کر رہنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھ کر حضورؐ کے اسوہ وسنت سے اکتساب فیض کرنا اور دین کا علم حاصل کر کے اس کے مطابق زندگی گزارنا اور اپنی ساری توانائیاں اقامتِ دین کی تحریک میں صرف کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ معنوی لحاظ سے مولانا مودودیؒ زندہ ہیں، کیونکہ ان کی دعوت اور ان کا کام زندہ ہے۔

مولانا مودودیؒ کے رخصت ہو جانے کے بعد ان سے سچی محبت کا اوّلین تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اس مرحوم و مغفور ہستی کے لیے خدا سے مغفرت و لطف و کرم کی دعائیں کرتے رہیں، لیکن ہماری عملی زندگیوں اور سرگرمیوں کی درستی کا دارومدار اس پر ہے کہ ہم مولانا کے چھوڑے ہوئے لٹریچر (خصوصاً تفہیم القرآن) سے مسلسل استفادہ کرتے رہیں کیونکہ یہ لٹریچر ہمیں قرآن و سنت کے سرچشمہ ہائے ہدایت تک پہنچانے کا بہت مؤثر ذریعہ ہے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اقامتِ دین کی تحریک یا اسلامی انقلاب کا جو نہج مولانا مودودیؒ نے واضح کیا اور جس کی تعلیم ہم سب کو مسلسل دیتے رہے، اسے اچھی طرح سمجھا جائے اور اس سے انحراف نہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں دعوتی سرگرمی اور سیاسی سرگرمی یا تعلق باللہ اور تعلق بالناس یا اصولوں اور مصالح کے درمیان جو تناسب و توازن مولانا نے ہم سب کے سامنے سالہا سال کے شوروں سے متعین کیا اُس تناسب و توازن کو برباد نہ ہونے دیں۔

میرے پیارے رفیق! اگر ہم ان خطوط پر اپنی اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر سرانجام دیں تو چاہے ظاہری دُوری اُفق تا اُفق ہو، ہم مولانا کے قریب ہیں اور مولانا کی تعلیم ہمارے ساتھ ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا ساتھ ہے!!

# سفرِ آخرت ـــــ مرحلہ بہ مرحلہ

## (تاریخ وار سلسلۂ حوادث)

۲۶ مئی ۱۹۷۹ء : ۶ ۱/۲ بجے شام کی پرواز سے لاہور سے اسلام آباد کے لیے روانگی۔

۲۷ مئی " : اسلام آباد سے براستہ لندن، امریکہ کے لیے روانگی۔

۲۹ مئی " : لندن سے نیویارک ـــ بفیلو ـــ کے لیے روانگی۔

۱۹ جون " : بفیلو میں، قیم جماعتِ اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد اور پروفیسر خورشید احمد کے بھائی ڈاکٹر انیس احمد کی مولانا سے ملاقات۔ نیز شمالی امریکہ کے دُور افتادہ شہروں سے آئے ہوئے لوگوں سے ملاقات اور محفلِ سوال و جواب۔

۲۹ جون " : بفیلو میں نعیم صدیقی اور مولانا خلیل احمد حامدی کی مولانا محترم سے ملاقات۔

۲۳ جولائی " : جوڑوں کے درد کا نیا علاج شروع ہوا۔

۲۰ اگست " : قریبی ہسپتال میں داخلہ۔

[illegible] اگست " : مولانا ابوالخیر مودودی (مولانا مودودی کے برادرِ بزرگ) کا لاہور میں انتقال۔

۴ ستمبر " : بفیلو کے "ملرڈ فلمور ہسپتال" میں معدے کے السر کا آپریشن۔

۵ ستمبر " : طبیعت ہشاش بشاش رہی۔

۶ ستمبر " : شام کے وقت دل کا دورہ۔ دوسرے ہسپتال میں منتقلی۔

۱۱ ستمبر " : تشویشناک صورتِ حال ختم ہوگئی اور رُو بصحت نظر آنے لگے۔

۱۳ ستمبر " : دل کا دوسرا شدید دورہ۔ حرکتِ قلب چار منٹ بند رہنے کے بعد جاری ہوئی۔ (حیرت انگیز!)

۱۴ ستمبر " : حواس بحال ہوگئے، لیکن نقاہت بڑھ گئی۔

۲۰ ستمبر ۱۹۷۹ء : جگر اور (واحد) گردے کا فعل متاثر ہوگیا، بے ہوشی طاری ہوگئی۔

۲۱ ستمبر 〃 : آج طبیعت سنبھلی ہوئی محسوس ہوئی۔

۲۲ ستمبر 〃 : پانچ بجے صبح دل کا تیسرا دورہ۔ طبیعت کی بحالی کا عارضی وقفہ۔ مولانا نے تمام آلات وغیرہ ہٹا لینے کے لیے کہا۔ آخری تحریر "میں مسلمان ہوں اور پاکستانی" (بزبانِ انگریزی) لکھی —— رحلت!

۲۳ ستمبر 〃 : بفیلو (امریکہ) میں نمازِ جنازہ —— ۲ مرتبہ۔

〃 : نیویارک میں کینیڈی ائرپورٹ پر نمازِ جنازہ۔

۲۴ ستمبر 〃 : لندن میں ہیتھرو ایئرپورٹ پر نمازِ جنازہ —— ۵ مرتبہ۔

۲۵ ستمبر 〃 : اپنی سالگرہ کے روز صبح ½ ۱۰ بجے واپس وطن پہنچے۔ ۵۔اے ذیلدار پارک میں دیدارِ عام —— ملک کے گوشے گوشے سے آنے والے لاکھوں سوگواروں نے زیارت کی۔

۲۶ ستمبر 〃 : قذافی سٹیڈیم لاہور میں نمازِ جنازہ —— امریکہ، انگلستان، بھارت، عراق، شام، قطر، سعودی عرب، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک کے نمائندے شریک ہوئے۔ ۵۔اے ذیلدار پارک میں تدفین۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

۵۔اے ذیلدار پارک کے اُس سبز پلاٹ کے کونے میں تدفین جس میں ہر روز بعد نمازِ عصر سید مودودیؒ محفل آرا ہوتے تھے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے